

مُعَاہِرِ ادب

ڈاکٹر جمیل جالبی

مُعَاہِرِ ادب

ادبی تنقیدی و فکری مضامین کا مجموعہ

مجلد پنجم

۱۹۹۱

ڈاکٹر جمیل جالبی

پروفیسر

لاہور

پاکستان

۱۹۹۱

سنگت میل پبلی کیشنز، لاہور

۱۹۹۱

نبی زاحمد نے

زاہد بشیر پرنٹر، لاہور سے چھپا کر

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

سے شائع کی۔

تعداد — ایک ہزار

قیمت — ۱۸۰/- روپے

مُجھِ خَسنِ ظہیر صاحب کے نام

فہرست

۱۵	ادب کی صورت و حال	۱
۱۹	نئے لکھنے والوں سے	۲
۲۵	صحیح ادبی رویہ	۳
۲۹	شاعری اور مسائل حیات	۴
۳۳	ادب اور جمہوریت	۵
۳۷	اردو نعت گوئی کا تاریخی ارتقا	۶
۴۷	ہائیکو کے بارے میں	۷
۵۳	فنون تدوین	۸
۵۷	مشاعرے کی روایت	۹
۶۱	بچوں کا ادب	۱۰
۶۵	جدید افسانے کے بارے میں	۱۱
۶۸	عزیز احمد: ایک جائزہ	۱۲
۷۹	میراجی: ایک مطالعہ	۱۳
۱۰۰	حسن عسکری کے افسانے	۱۴

۱۰۵	افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی	۱۵
۱۱۲	ابوالفضل صدیقی کے آخری لمحات	۱۶
۱۱۶	جمیل ہاشمی کے دو ناول	۱۷
۱۲۵	جمیل ہاشمی کے آخری لمحات	۱۸
۱۳۰	عصمت پُختائی	۱۹
۱۳۳	رضیہ فصیح احمد کے افسانے	۲۰
۱۳۸	مشرن احمد کے افسانے	۲۱
۱۴۱	آصف فرخی کے افسانے	۲۲
۱۴۵	نذر الحسن صدیقی کے افسانے	۲۳
۱۴۸	سر سید احمد خاں	۲۴
۱۵۴	شبلی نعمانی	۲۵
۱۵۸	اکبر الہ آبادی	۲۶
۱۶۴	نیاز فتح پوری	۲۷
۱۶۵	اشتیاق حسین قریشی بحیثیت مؤرخ	۲۸
۱۷۰	پاکستانی فکر کی اساس	۲۹
۱۷۸	تاریخی شعور اور ڈاکٹر قریشی	۳۰
۱۸۲	اقبال اور تشکیلِ جدید	۳۱
۱۸۸	مسجدِ قرطبہ	۳۲
۱۹۵	اقبال کا پیغامِ عمل	۳۳

۱۹۸	جوش ملیح آبادی	۳۳
۲۰۳	جوش کی وفات پر	۳۵
۲۰۶	جوش کے لطیفے	۳۶
۲۱۶	فیض احمد فیض	۳۷
۲۱۹	فیض احمد فیض	۳۸
۲۲۲	فراق گورکھپوری	۳۹
۲۲۶	غلام عباس	۴۰
۲۳۰	رؤیس احمد حفی کی خدمات	۴۱
۲۳۳	امداد صابری : تاریخ صحافت	۴۲
۲۳۷	پیر محترم الدین راشدی	۴۳
۲۴۱	مولانا سعید احمد اکبر آبادی	۴۴
۲۴۶	مجنوں گورکھپوری	۴۵
۲۴۹	ڈاکٹر سید عبدالقادر : ایک تعارف	۴۶
۲۵۳	اعجاز الحق قدوسی	۴۷
۲۵۷	اے کے بروہی کی یاد میں	۴۸
۲۶۰	میر علی احمد خان تالپور	۴۹
۲۶۴	صادقین کے بارے میں	۵۰
۲۶۷	محمد نقوش کے بارے میں	۵۱
۲۷۱	مولانا ماہر القادری	۵۲
۲۷۶	ابراہیم جلیس	۵۳

۲۷۵	کامل القادری مرحوم	۵۳
۲۸۳	ڈاکٹر الیوب قادری	۵۵
۲۸۷	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان : ایک تعارف	۵۶
۲۹۲	اختر حسین رائے پوری : گزراہ	۵۷
۲۹۵	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی : ایک تعارف	۵۸
۲۹۸	ڈاکٹر سہیل بخاری : ایک تعارف	۵۹
۳۰۱	بچوں کی شاعری : محشر یونی	۶۰
۳۰۴	بچوں کی نظمیں : شان الحق حقی	۶۱
۳۰۶	نعت گوئی : احمد سہارنپوری	۶۲
۳۰۹	قومی شاعری : منظر الیوبی	۶۳
۳۱۱	اردو گیت : ڈاکٹر بسم اللہ نیاز	۶۴
۳۱۴	جدید مرثیہ : ڈاکٹر یاد عباس	۶۵
۳۱۷	سلیم احمد کے بارے میں	۶۶
۳۲۱	صبا اکبر آبادی کی غزل	۶۷
۳۲۵	فادی رباعیات غالب کا اردو ترجمہ	۶۸
۳۲۹	ضیاء اللہ دہری کی شاعری	۶۹
۳۳۲	قمر جمیل کے بارے میں	۷۰
۳۳۹	صمد انصاری کی غزل	۷۱
۳۴۲	پرتو روہیلہ اور ان کی شاعری	۷۲

۳۲۹	راشد مفتی کی غزل	۷۳
۳۵۴	صادق نسیم کی غزل	۷۴
۳۵۹	افسر ماہ پوری کی غزل	۷۵
۳۶۳	جمیل عظیم آبادی کی غزل	۷۶
۳۶۶	غنی دہلوی کی غزل	۷۷
۳۷۰	صابر ظفر کی غزل	۷۸
۳۷۳	”بے جواز“ کے حوالے سے	۷۹

۳۷۷	بات سے بات : نصر اللہ خان	۸۰
۳۸۳	تاریخ ادب انگریزی : ڈاکٹر احسن فاروقی	۸۱
۳۸۶	عمر گزشتہ کی کتاب : مرزا ظفر الحسن	۸۲
۳۹۱	پاکستان کی شخصیات : نور الصباح بیگم	۸۳
۳۹۹	یادوں کا جشن : کنور مہندر سنگھ بیدی	۸۴
۴۰۵	طنز و مزاح کی شاعری : شہباز امروہوی	۸۵
۴۰۸	ماحول اور شاعری : نظر حیدر آبادی	۸۶

۴۱۲	تذکرہ سخنورانِ کاکوری	۸۷
۴۱۸	معاصر شعراء کا تذکرہ : سخن ور	۸۸
۴۲۳	تذکرہ ماثر الکرام	۸۹
۴۲۶	دیوان غالب کا پنجابی ترجمہ	۹۰
۴۲۹	نظیر خوانی	۹۱

۴۳۳	غیر منقوطہ نشر: ہادی عالم	۹۳
۴۳۶	غیر منقوطہ شاعری: مصدر الہام	۹۳
۴۴۰	رحمن بابا کا پیغام	۹۴
۴۴۶	شاہ لطیف بھٹائی کی شاعری کے نئے گوشے	۹۵
۴۵۲	نظام الملک میر عثمان علی خان کی خدمات	۹۶
۴۵۵	قاضی خلیق مودائی	۹۷
۴۵۹	حافظ شیرازی	۹۸
۴۶۲	نصرتی کی فارسی غزل	۹۹

پیش لفظ

لفظ آگاہ-عصر آگاہ: ڈاکٹر جمیل جالبی

یہ جاننے کے لیے کہ آیا معاشرہ فرسودگی اور قدامت سے رشتہ توڑتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے اور معاشرہ میں ذہنی استبداد اور سماجی بندشیں کم ہو کر اس میں سماجی رویے کشادگی، تحمل اور مساوات کی جانب ڈھلنے لگے ہیں دراصل یہ جانتا ہے کہ اس معاشرہ کا ادیب، شاعر، نقاد اور مفکر کیا اور کسسا کھڑا ہے۔ جو اس معاشرہ میں 'لفظ' کی کیا قدر قیمت ہے؟ ابلاغی عمل کس سمت جا رہا ہے؟ ڈاکٹر جمیل جالبی کے ساڑھے چار سو صفحات اور ننانوے مضامین پر مشتمل اس مجموعہ سے رابطہ کرنا دراصل عصری ذہن، معاشرہ اور سوچ سے اپنا رشتہ استوار کرنا ہے۔ جالبی صاحب کے یہاں لفظ کا استعمال، موضوع کا انتخاب، ادبی اور سماجی رویوں کا تجزیہ اور مسائل پر گرفت اُن کے سماجی شعور کی علامت اور فن کی شناخت بن گئی ہے۔ زبان سماجی رشتوں کی علامت ہے اور سماجی عمل سے بنتی، بڑھتی اور بدلتی رہتی ہے۔

وہ ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان رابطہ بھی ہے اور فرسودگی سے بھدائی اور مستقبل کا اعلان بھی ہے۔ زبان کی اس سماجی حیثیت کی طرف جالبی صاحب کے ان مضامین میں بار بار اشارے ملتے ہیں۔ ان مضامین ہی میں انہیں بلکہ جالبی صاحب کی اکثر تحریریں دلوں میں لفظ اور زبان کی سماجی عملیت اور کار آوری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اپنی تاریخ، ادب اور دور جلد دوم، حصہ اول کے پہلے باب کے آخری پیرے میں جالبی صاحب ایک سوال اٹھاتے ہیں جس کا

جواب، دوسرے باب میں ملتا ہے: اُنہو نے ہندی معاشرہ میں جگہ کیسے لی، ایسے معاشرہ میں جہاں فارسی مستحکم چڑھی تھی؟ جاہلی صاحب کے خیال میں بدلتے ہوئے سماجی رشتے اور تقاضے، معاشرہ کے گرتے ہوئے ایوان، ایک نئے ابلاغی رشتے کے متقاضی تھے۔ "اُنہو زبان نے عوام و خواص کے درمیان اس وسیع خلیج کو... پاٹ دیا جواب تک دونوں کے درمیان حائل تھی" (ص ۲۱) لیکن جہاں سماجی عدم تفریق کی بنیاد بنی، جاہلی صاحب کے مطابق آج سماجی مغائرت کے ملبوہ چڑھ چکی ہے۔

جاہلی صاحب کے خیال میں ہمارا آج کا ادب عام طور پر فرد اور معاشرہ سے مخاطب نہیں (ص ۱۶) ہمارا ادب اجتماعی رشتوں سے کٹ گیا ہے اس میں زندگی کی معنویت دریافت کرنے کی کوشش نظر نہیں آتی۔ ادیب کا معاشرہ سے رشتہ ٹوٹ جانے کے یہی معنی ہیں کہ وہ الفاظ کی سماجی اہمیت فراموش کر چکا ہے۔ الفاظ کے معنی اور ان کی سماجی عملیت کو بھول جانا حقیقتاً سماجی رشتوں کو بھول جانا ہے۔ سماجی رشتے فرائض اور ذمہ داریوں میں تقسیم و تحلیل پذیر ہوتے ہیں، الفاظ کے معنی بھولنا گویا سماجی فرائض اور ذمہ داریوں کو بھلا دینا ہے۔ جاہلی صاحب کا خیال ہے کہ ہمارا ادب اب اسی منزل پر پہنچ گیا ہے۔

لیکن جاہلی صاحب اس مغائرت کو ایک وسیع تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کے مطابق یہی نہیں کہ آج کا ادیب مصلحتوں میں محصور اور غیر معقول تنہائوں کا اسیر ہو گیا ہے بلکہ اس کا اپنی تاریخ سے، ثقافت سے، ماضی سے بھی رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ لیکن یہ رشتہ "لفظ آگاہی" کے ذریعہ ہی دوبارہ استوار ہو گا۔ شعوری سطح پر اس کی بنیاد رکھنی ہوگی، معقولیت کے دائرے میں ادبی عمل جاری رکھنا ہو گا۔ اس پس منظر میں جاہلی صاحب نے لکھنے والوں سے کہتے ہیں کہ کوئی اعلیٰ تحریر گہرے شعور کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی... یہ شعور زندگی سے گہرے تعلق سے پیدا ہوتا ہے... علم و فکر سے حاصل ہوتا ہے۔ ضروری مطالعہ، موجود زندگی کی تفہیم... اپنی تہذیب و ثقافت کی تاریخ اور اس کی موجود صورت حال پر غور کرنے سے پیدا ہوتا ہے (ص ۲۱-۲۲)۔ گویا الفاظ کی تلاش سماجی شناخت کی علامت ہے۔

جاہلی صاحب اس تلاش کے لیے انقلابی عمل اور معاشرہ سے جنگ کے الفاظ استعمال

کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں معاشرہ کو جو ہریت اور نفس انفسی کے خول سے باہر نکالنے کے لیے جرأت دے، ہاکی کے ساتھ "آزاد خیال" کی راہ یعنی چلتی ہے۔ دراصل ادب ہی آزادی کے اظہار کی حقیقی صورت ہے (ص ۶۳) اور آزادی کا یہ تحقق خیالات کے تصادم سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ سماجی علیت اور حریت میں مفردانہ زبان کی حریت کی تلاش اور اس کا تحقق پوشیدہ ہوتا ہے۔ سماجی عقل، فکر و ادب کا عمل ہے "قوموں کی زندگی میں صرف سچاؤ نشینوں اور مجاہدوں کے ذہن سے نہیں... بلکہ فکر کا مطالعہ کرنے سے نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوتا ہے" (ص ۷۴)۔ سماجی علیت کو سیاسی نظریوں اور حکمت عملیوں سے نہیں، بلکہ لفظ کے شعور سے وابستہ ہے۔

جانبی صاحب کے سماجی علیت کے اس فلسفہ کو مختصر ایلوں بیان کیا جاسکتا ہے : لفظ کا شعور و استعمال (ادب و فلسفہ) فرسودگی اور قدامت کا انکار اور حریت (امکانات) کا تحقق۔ لفظ کی گویا روح جیتیں ہیں اور اسی لحاظ سے اس کے استعمال کے دو سیاق سامنے آتے ہیں۔ ادب ماضی سے، فرسودگی سے اور قدامت سے جنگ بھی ہے، حال کی آگاہی بھی ہے اور آزادی اور امکانات کی تلاش اور حصول بھی ہے۔ قدامت اور فرسودگی کی جانب جہابی صاحب اشارہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ہم بیسویں صدی کی آخری دہائی میں داخل ہو رہے ہیں لیکن ہماری زبان اور ہمارے لسانی رویے اب تک جاگیردارانہ ہیں۔ ان کا لنگر کج بھی ایک فرسودہ سماجی و معاشی و لدل میں پڑا ہے اور "جاگیردارانہ نظام چونکہ کھوٹے سکے کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے ہمارے سارے معاشرتی، معاشی اور سیاسی بھران اسی کھوٹے سکے کو مسلسل چلانے کی ذہنیت اور کوشش سے پیدا ہو رہے ہیں"۔ (ص ۳۲-۳۳)۔ لیکن اس ذہنیت کو آپ کا تاریخی شعور لفظ کی تعبیم اور استعمال و حریت کا احساس بدل سکتا ہے۔ نئے سماجی رشتوں سے، ادب کے نئے افق اور فکر کے نئے سوتے تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ جہابی صاحب کے یہاں تاریخ اور تاریخی شعور کا ہر بار ذکر آیا ہے۔ ان کے لیے تاریخ انفرادی اور اجتماعی تشخص کی اساس ہے۔ "تاریخ انسانی فکر و شعور کو زندہ و متحرک کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ وہ قومیں جو

تاریخ کو بھلا دیتی ہیں، تاریخ انہیں بھلا دیتی ہے۔“ (ص ۲۸۴)۔ جاہلی صاحب کو یہ احساس ہے کہ ہمارے ثقافتی منظر میں تاریخ کے وہارے منجمد ہو گئے ہیں اور زندگی کی قدریں معاشرے میں سوکھ کر مر چکا رہی ہیں۔ جاہلی صاحب جب لفظ 'شعور' استعمال کرتے ہیں تو وہ اسے محض ایک نفسیاتی اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کرتے بلکہ ایک توجیہاتی تصور کے طور پر، ایک فکری ضابطے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کے لیے یہ تصور بیک وقت حافظہ (ماضی)، اور متخیلہ (مستقبل، امکان) کے درمیان واسطہ اور ان کا سنگم ہے۔

اس مجموعہ میں شامل مضامین متنوع ہونے کے باوجود ایک داخلی رشتہ میں مربوط ہیں۔ جاہلی صاحب کے سوانحی خاکے ہوں، موضوعاتی تبصرے ہوں یا اولی جائزے، وہ ہر جگہ یہ دریافت کرتے نظر آتے ہیں: کیا اس شاعر، ادیب، یا دانشور کی تحریر پرانے بُت ٹوٹ گئے (ماضی)؟ کیا نیا شعور بیدار ہوا؟ (امکان، مستقبل، آزادی کا تحقق)۔

ان سوالوں کے جواب آپ کو ان مضامین میں ملیں گے لیکن آپ کو یہ مضامین ایک سے زیادہ بار پڑھنے ہوں گے اور اس عمل میں آپ اپنے سماج، اپنی ثقافت اور شاید خود اپنی ذات کو سمجھان جائیں اور مولانا عبدالحق جاتی کے ان اشعار کا جواب مل جائے جن کی جانب جاہلی صاحب نے اس مجموعہ کے پہلے مضمون میں اشارہ کیا ہے۔

ادب کی صورتِ حال

مولانا عبدالرحمن جامی نے اپنی مثنوی "سلامان و اہمال" میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک کڑوہ و صحرا سے کسی بڑے شہر میں آیا۔ یہاں آیا تو دیکھا کہ انسانوں کا سمندر ہے جو سڑکوں پر چار لگا طرف بہ رہا ہے۔ مگر وہ نے یہ سماں دیکھا تو ٹھیکیرا گیا اور سوچنے لگا کہ اگر میں اس بھیڑ میں ملا جلا تو یقیناً گم ہو جاؤں گا اس لیے ضروری ہے کہ اپنی شناخت باقی رکھنے کے لیے کوئی ایسا نشان مقرر کروں کہ اگر گم نہیں ہو جاؤں تو اس نشان کے ذریعے خود کو پہچان سکوں۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک کدو اُسے راستے میں پڑا ہوا نظر آیا۔ اس نے کدو اٹھایا اور اپنے پیروں سے باندھ لیا تاکہ اپنی پہچان کر سکے۔ ایک مرد دانا آدھ سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ ایک کڑوہ پاؤں سے کدو باندھے چلا جا رہا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر وہ ہاتھ کی دھمک پہنی گیا اور اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ کچھ دُور جا کر کڑوہ ٹپ گیا اور ایک جگہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔ جب کڑوہ سو گیا تو مرد دانا قریب آیا اور کڑوہ کے پاؤں سے کدو کھول کر اپنے پاؤں میں باندھ لیا اور وہیں لیٹ گیا۔ کڑوہ جب بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ کدو کسی اور کے پاؤں میں بندھا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا اور آواز دی کہ اے شخص میں اپنے معاملے میں حیران و پریشان ہوں۔ اٹھ اور مجھے بتا کہ یہ میں ہوں یا یہ تو ہے۔ اگر یہ میں ہوں تو یہ کدو تیرے پاؤں میں کیسے بندھا ہوا ہے اور اگر یہ تو ہے تو پھر میں کہاں ہوں؟

ایسا منہم یا تو فی دامنِ درست مگر منہم چوں ایں کدو ہائے نشت
در قوی ایں من کہا یم کیہیستم در ظماری من نسیا یم چہیستم

یہی مسئلہ جو اُس وقت کروڑوں سالہ کے سامنے تھا یہی مسئلہ آج تہذیبی، فکری اور ادبی سطح پر بھی درپیش ہے۔ ہم نے بھی آج اپنی شناخت گم کر دی ہے اور فکر و خیال کی بھیڑ میں یہ پلچہ رہے ہیں

کہ اگر یہ تو ہے تو پھر میں کہاں ہوں؟ اور اسی وجہ سے ہم آج ذہنی و فکری سطح پر بے سمت اور بے جہت ہیں، لفظ بغیر معنی کے پہل ہے اور پہل وہ ہے جس کے کوئی معنی نہ ہوں۔ اپنے ادب کو دیکھئے تو اس وقت یہ پہل بے مقصدیت کا شکار ہے۔ اس کی روح میں کوئی ایسی معنویت نہیں ہے جس سے فرد اور معاشرے کے بنیادی سوالوں کا جواب مل رہا ہو۔ وہ جواب جس سے فرد و معاشرہ میں شعور پیدا ہوتا ہے۔ وہ شعور جس سے فکری زندگی کا بیج پھوٹتا ہے اور فکر میں جہت پیدا ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ آج کا ادب عام طور پر فرد اور معاشرے سے مخاطب نہیں ہے۔ فکشن ابلاغ کے راستے سے کٹ کر علامات اور تجزیہ کی طرف چلا گیا ہے جہاں وہ اپنی بے معنویت کو "بلا بغیر معنویت" کے پردے میں چھپا رہا ہے۔ شاعری کو دیکھئے تو فکر خیال کی سطح پر وہ ایک گہرے بحران اور الجھاؤوں کا شکار ہے۔ اس میں چٹکے باقی تو نظر آتی ہے لیکن معنی نظر نہیں آتے۔ وہ معنی جس سے شعور پیدا ہوتا ہے۔ وہ شعور جس سے زندگی آگے کی طرف بڑھتی ہے۔ اس وقت ایک ایسا سا ثا ہے کہ جس میں حرکت کا عمل بند سا ہو گیا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ معاشرے میں انسانی و معاشرتی اقدار، صداقتوں کی تلاش اور زندگی کی معنویت دریافت کرنے کی کوشش بھی نظر نہیں آتی۔ ہمارا ادب اجتماعی رشتوں سے کٹ گیا ہے اور ادیب تخلیق کے کرب میں مبتلا رہنے کے بجائے آسائش سے لطف کی تلاش میں دن رات سرگردان ہے۔ یہی مقصد ادبی ہے اور ادب اسی کے حصول کا ذریعہ ہے۔ ممکن ہے یہ باتیں سن کر آپ میں سے کچھ لوگ ناراض ہو جائیں لیکن جب ادب و فکر میں منفی رجحانات داخل ہو جائیں تو ان کی نشان دہی کرنا اور انہیں رد کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ میرا یہ عمل بھی اسی خلوص نیت پر مبنی ہے۔

اس منفی رجحان کی ذمہ دار آج کی نسل نہیں ہے۔ اس کام کا آغاز ۱۹۵۸ء میں ہوا تھا۔ ۱۹۵۸ء والی نسل نے ادب کو ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرنے کا عمل شروع کیا اور آج کی نسل اسی فصل کو "جو پک کر تیار ہو گئی ہے کھا کر رہی ہے" اس وقت میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس صورت حال کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں تاکہ آج کی نسل جسے زندگی کا بہت لمبا سفر بھی طے کرنا ہے ان رجحانات اور رویوں کو رد کر کے اس راستے کو اپنائے

جس پر چلی کر ہم ادب کے ذریعے بنیادی سوالوں کو اٹھا کر ان کے جواب کی تلاش کے سفر پر روانہ ہو سکیں تاکہ ادب پھر اس شعور کے پیدا کرنے کا سبب بن سکے جو ادب کا ہمیشہ سے منصب رہا ہے اور جس سے فرد اور معاشرے کی ذہنی تقدیر بدل جاتی ہے بلکہ زندگی کو آگے بڑھانے میں مدد دیتا ہے۔ جس سے تاریخی شعور پیدا ہوتا ہے۔ وہ شعور جس سے ذہن بدلتا ہے اور انسان پیدا ہوتے ہیں۔

اپنے دور کے ادب کا مربوط مطالعہ کیجئے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ وہ ادب نہیں ہے جس میں اپنے زمانے کی روح کا رد فرما ہوتی ہے اور جس سے ہم زمانے کو پہچانتے ہیں۔ یہ ویسا ادب بھی نہیں ہے جیسا وہ ہو سکتا تھا یا ہونا چاہیے تھا۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ادب زندگی کے دھارے پر بہتے ہوئے، سمجائیوں کے اظہار سے پیدا ہوتا ہے۔ گویا ادب زندگی کا اور اس زندگی کی سمجائیوں کا اظہار کرتا ہے جن کا ادیب و شاعر کی حیثیت سے، اپنے تجربہ اور مشاہدہ کیا ہے۔ مصالحتیں اور منافقتیں تو تخلیقی ادب کی دشمن ہیں۔ ۱۵۵۸ء کے بعد سے عام طور پر ہمارا ادیب تعلقات عامہ کے راستے پر چل پڑا ہے اور اپنا معاشرتی درجہ بڑھانے کے لیے ادب کو استعمال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب اور فکر و خیال اب منزل نہیں بلکہ محض شہرت حاصل کرنے اور زندگی کی زیادہ سے زیادہ آسائشیں اور معاشرتی رتبے بخورنے کا وسیلہ بن گئے ہیں اور یہ رجحان یقیناً ایسا ہے جو ادب اور فکر و خیال کا سفاک دشمن ہے۔ اس صورت حال میں ویسا ہی ادب پیدا ہو گا جیسا ہو رہا ہے۔

یہ وہ صورت حال ہے جو آئانی (سوڈو) دانشوروں کو بہت ماس آتی ہے۔ ایڈر اپاؤنڈ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ”سمجھا اور سنجیدہ فن کار قد رشتا سی سے اتنا ہی بے نیاز ہوتا ہے جتنا کوئی سنجیدہ سائنس دان ہوتا ہے۔ آئانی فن کار سنجیدہ فن کار سے تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں اور آئانی فن کار تعلقات عامہ کے ذریعہ وہ انعامات بھی حاصل کر لیتا ہے جو دراصل سنجیدہ فن کار کو ملنے چاہئیں۔ یہ فطری بات ہے کہ آئانی فن کار کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ حقیقی فن کار اور آئانی فن کار میں تمیز نہ ہونے دے۔ یہ صورت ہر دور

میں نظر آتی ہے لیکن سب ادیبوں کا جب یہی مقصد حیات بن جائے تو اس سے ادب کی وہ حالت ہو جاتی ہے جو اس وقت ہمارے ادب کی ہے۔ اس وقت ادیبوں کو اور نہ معاشرے کو اتنی فرصت ہے کہ وہ زندگی میں فکر و خیال کی اہمیت کو فی الحقیقت محسوس کر سکے یا کرا سکے۔ زبردستی کی ایک دوڑ ہے جس میں سب شریک ہیں اور فکر و خیال کے ساتھ ادب کا بیج بھی مر رہا ہے۔ معاشرہ اسی لیے سستی تفریحات سے دل بہلانے میں مصروف ہے اور ادیب بہترین آسائشوں کے حصول میں لگا ہوا ہے اور میں مولانا جامی کی طرح بچہ رہا ہوں کہ یہ میں ہوں یا یہ تو ہے۔ اگر یہ تو ہے تو پھر میں کہاں ہوں؟

(۱۹۸۷ء)

نئے لکھنے والوں سے

طلبہ و طالبات کی نئی نسل میں آج بھی ایسے نوجوان موجود ہیں جنہیں ادب سے نہ صرف دل لگتا ہے بلکہ جو ادب کو اپنے احساسات و خیالات کے اظہار کا ذریعہ بھی بناتا ہے۔ یہ بات ہدایت خود بڑی خوش آئند ہے۔ اُن کی تحریروں سے اس بات کا بھی واضح طور پر اظہار ہوتا ہے کہ اُن میں وہ فطری میلان طبع موجود ہے جو ادب کی تخلیق کے لیے انسان پر فطرت کے وقت اساتھ لے کر آتا ہے۔ جب یہ فطری صلاحیت موجود ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر صحیح سمت میں سفر کیا جائے اور اس سفر کی صحیح تیاری کی جائے تو آج کے یہ نوجوان کل کے بڑے ادیب، بڑے شاعر، بڑے نقاد و مفکر بن کر سامنے آئیں گے۔ میں نے صحیح سمت اور صحیح تیاری کا ذکر کیا ہے۔ صحیح سمت سے مراد یہ ہے کہ آپ کو کیا بھی سے معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کی منزل کیا ہے اور اس منزل کا راستہ کیا ہے؟ پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس راستے کی مسافت طے کرنے کے لیے آپ کو کیا تیاری کرنی ہے؟ منزل کے تعین کے لیے ضروری ہے کہ آپ اس بات پر غور کریں کہ آپ کو ادب کی کون سی صنف میں اپنے حجرات و خیالات کا اظہار کرنا ہے اور پھر یہ بھی معلوم کرنا چاہیے کہ اس صنف کو اختیار کرنے کے لیے آپ کو کیا پڑھنا ہے؟ پھر ادب کی تخلیق کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنا زور ہے کہ بے سانس بیٹا ضروری ہے۔ اس بات کی میں یہاں بذرا سی وضاحت کروں گا۔ عجیب ایک سچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی صلاحیت کے نمٹاتے چراغ کو ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ بعض سچے زیادہ زمین جوتے ہیں اور بعض نسبتاً کم زمین جوتے ہیں۔ ذہین بچوں کے چراغ میں کم ذہین بچوں کے مقابلے میں زیادہ تیل موجود ہوتا ہے۔ اب اگر ذہین بچہ اپنی صلاحیت کے چراغ میں مزید تیل نہ ڈالے اور اس کے مقابلے میں کم ذہین بچہ مسلسل تیل ڈالتا رہے تو کچھ ہی عرصے میں ذہین

بچے کا چراغ بجھ کر رہ جائے گا اور کم ذہن بچے کا چراغ اسی طرح مسلسل روشن رہے گا۔ گویا چراغ میں مسلسل تیل ڈالنے کا عمل بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ تیل دراصل مطالعے سے، اُلو و فکر سے صلاحیت کے چراغ میں آتا ہے اور اسے زندہ و روشن رکھتا ہے۔ آپ نئی کار خریدتے ہیں تو شوروم کا مالک ایک گیلن پٹرول ڈال کر گاڑی آپ کے سپرد کر دیتا ہے۔ آپ اس تیل کی مدد سے اپنے گھر آ جاتے ہیں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ ساری عمر اسی تیل سے آپ اپنی گاڑی چلاتے رہیں۔ اس عمل سے یہ بات سامنے آتی کہ جیسے آپ کے چراغ یا گاڑی کے لیے تیل کا مسلسل ڈالنا ضروری ہے اسی طرح ادب کے لیے مطالعہ کا تیل تخلیق کے چراغ میں ڈالتے رہنا ضروری ہے۔ وہ لوگ جو صرف لکھتے ہیں اور پڑھنے کا شوق نہیں رکھتے ان کی تحریریں جلد ہی مرجھانے لگتی ہیں اور وہ جلد ہی خود کو دہرانے لگتے ہیں، فکر اور اظہار خیال اور احساس کی سطح پر خود کو دہرانے لکھنے والے کی شکست ہے اس لیے ضروری ہے کہ آپ یہ بات یاد رکھیں کہ ادب کی دنیا میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لیے مطالعہ اور فکر ضروری ہے۔ مطالعہ وہ راستہ ہے جس سے ادیب اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔ آپ وہ سب کچھ پڑھیں جو آپ کو بڑھنا چاہیے۔ آپ نہ صرف اپنی زبان کا سارا جدید ادب پڑھیں بلکہ قدیم ادب کا مطالعہ بھی ذوق و شوق سے کریں تاکہ آپ اپنے ادب کی روایت سے پوری طرح واقف ہو سکیں۔ روایت سے رشتہ کاٹ کر آپ کی تحریر بے جہان رہے گی۔ پھر یہی نہیں بلکہ آپ کم از کم ایک دوسری زبان کے ادب سے بھی واقف ہوں اور صرف واقف ہوں بلکہ اس کے مزاج دان بھی ہوں۔ آپ کی تحریر میں تازگی، توانائی اسی وقت پیدا ہوگی جب آپ اپنی زبان کے ادب کے ساتھ ایک بیرونی زبان کے ادب سے بھی واقف ہوں۔ اس لیے میں آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ آپ سستی شہرت سے گریز کریں اور کبھی اپنی ذہنی بنیادوں کو مطالعے کے ذوق سے اتنا مضبوط بنالیں کہ اس پر آپ تخلیق کی جڑی اور عظیم الشان عمارت تعمیر کر سکیں۔

ہر وہ شخص جو ادب و فن کی دنیا میں قدم رکھنا چاہتا ہے یہ عمل اس کے لیے لازمی ہے۔ میری اپنی زندگی کا تجربہ یہی بتاتا ہے اور یہی بات میں اس نئے ایب تک

پہنچا، چاہتا ہوں جو ادب کی دنیا میں کچھ کرنا چاہتا ہے تاکہ تاریخ میں اس کا نام روشن رہی
 لفظوں میں لکھا جاسکے۔ یہ بات بظاہر بہت آسان سی نظر آتی ہے لیکن یہ راستہ اتنا پرخطر
 اتنا دشوار، اتنا پُر فریج ہے کہ اکثر راہ گیروں کی سانس پھول جاتی ہے اور پھر وہ وہیں بیٹھ
 جاتے ہیں۔ کبھی مالی مسائل کا نئے بین کر پاؤں کو دشمنی کر دیتے ہیں، کبھی گھریلو الجھنیں جھڑپ کر دیتی
 ہیں اور کبھی ناسازگار حالات ہمت کو پست اور حوصلوں کو مُردہ کر دیتے ہیں۔ ادب و فن کا
 راستہ اسی لیے زندگی کو قربان کرنے اور جان پر کھل جانے کا راستہ ہے۔ یہ نہ آسائش کا
 راستہ ہے اور نہ معیار زندگی کو بلند کرنے کی کوشش کا راستہ ہے۔ یہ صرف ایثار کا راستہ
 ہے۔ اس لیے اس دشوار گزار راستے پر چلنے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے تاکہ اگلے سفر میں
 آپ کو کسی قسم کی تنگی نہ پڑ سکے۔ اگر آپ کو دولت کمائی ہے تو پھر اس راستے کو چھوڑ
 دیجیے اور وہ کام کیجیے جو دولت کمانے کے لیے ضروری ہیں۔ مرنے والے اپنی زندگی میں کچھ
 بننے کے خواب دیکھتا ہے۔ اگر آپ نے شاعری ادیب بننے کا خواب دیکھا ہے تو پہلے یہ بات
 طے کر لیجیے کہ آپ کبھی مالی دار نہیں بن سکتے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی سوچ لیجیے کہ آپ اپنی زندگی
 بغیر مناسب آمدنی کے اس طور پر بسر نہیں کر سکتے جس طور پر ادب و فن کے لیے ضروری ہے۔
 درہم یہ کہنا کہ آپ کا مقصد یا منزل نہیں ہونا چاہیے بلکہ آپ کی منزل ادب و فن ہونا چاہیے۔
 اس صورت میں ضروری ہے کہ آپ اپنے لیے ایسا ذریعہ آمدنی پیدا کیجیے جس سے آپ کی
 منزل سامنے رہے اور آپ کا راستہ سدود نہ ہو۔ آپ کی طبیعت میں درویشانہ نیازی
 ہونی چاہیے اور آپ کا مقصد حیات ہمیشہ ہر چیز پر حاوی رہے۔ جو کام آپ کریں شعور کے
 ساتھ کریں۔ شہرت کے چمچے نہ بھاگیے بلکہ کام اور حرف کام کیجئے تاکہ شہرت اس کام کی کوکھ
 سے پھوٹے۔ یہ وہ شہرت ہوگی جو آپ کے قدم کو بلند، آپ کے جوہر کو روشن اور آپ کے
 نام کو از خود اونچا کرے گی۔ یہ مشکل راستہ ہے لیکن یہی وہ راستہ ہے جس پر بڑے اور بڑا
 اور نکلنے والوں نے سفر کیا ہے اور منزل تک پہنچے ہیں۔

کوئی اعلیٰ ادبی تخلیق زندگی کے گہرے شعور کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔ زندگی کا شعور
 وہ حقیقی روشنی ہے جس سے تخلیقی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ یہ شعور زندگی سے گہرے تعلق

سے پیدا ہوتا ہے۔ زندگی کے تجربات سے پروان چڑھتا ہے۔ علم و فکر سے حاصل ہوتا ہے۔ ضروری مطالعہ، موجود زندگی کی تفہیم، تاریخ کے مطالعے، مختلف خیالات دنیا میں ایک مخصوص زمانے میں کیوں ابھرے اور پہلے اور کیوں اور کب مر گئے، اپنی تہذیب و ثقافت کی تاریخ اور اس کی موجود صورت حال پر غور کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ شعور کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے مسئلہ اور اس کی نوعیت کو سمجھ لیا ہے۔ زندگی ایک "اکائی" ہے۔ مگر آپ ایک جزو پر قادر ہو جانا چاہتے ہیں تو پھر پوری اکائی کا علم اور اس سے آگاہی ضروری ہے۔ یہی شعور آپ کی تحریروں کو وہ رنگ و نور عطا کرتا ہے جس سے تخلیق میں معنویت پیدا ہوتی ہے۔ اس شعور میں ماضی بھی شامل ہوتا ہے اور حال بھی۔ حال دراصل مستقبل کا ماضی ہے اسی لیے ہر نکتے والے کو "حال" کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہیے۔ اسے قبول بھی کرنا چاہیے۔ باور رکھنی۔ وہ نکتے والے جو زمانہ موجود کو رد کر کے صرف ماضی یا مستقبل کی طرف دیکھتے ہیں تو ایسے میں نہ ماضی ان کا ماضی ہوتا ہے اور نہ مستقبل ان کا مستقبل ہوتا ہے۔ نئے نکتے والوں کو میرا بھی مشورہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ساتھ پوری طرح زندگی بسر کریں۔ اسے محسوس کریں، اس کی خوشبو کو اپنے وجود کا حصہ بنائیں۔ اس کی بصیرت حاصل کریں۔ اسے بہتر بنانے کے لیے اپنے قلم سے عہد و جہد کریں، اس کی منفی قوتوں کے خلاف آواز بلند کریں اور اپنے ضمیر کی آواز کو سارے عالم کو سنانے کے لیے قلم کا سہارا لیں۔ ہمارے دور کی منفی قدریں وہ قدریں ہیں جو انسان انسان کے درمیان حاکم و محکوم کا رشتہ قائم کرتی ہیں، جو استحصال کو اپنی پستی ہیں، جو دولت کو چند احمقوں میں جمیع کر کے سب دوسروں کو رعیت بنا دیتی ہیں۔ جو عدل و انصاف کو شتم کرتی ہیں۔ نئے نکتے والوں کو ان قدروں کے خلاف جہاد و قلم کرنا چاہیے۔ آپ اسی لیے تو نکتے کی طرف مائل ہیں کہ آپ کو ان نا انصافیوں اور زندگی کی موجودہ معنویت کا احساس ہے اور آپ اسے ماضی و ہا مقصد بنانا چاہتے ہیں۔

آپ روح طہر کو اپنے فن میں اس طور پر سمونے کی کوشش کیجیے کہ آپ کا فن آپ کے دور کا اظہار بن جائے لیکن یہ اظہار ایسا ہو جو اپنے دور کا حوالہ بننے کے ساتھ آپ کی روح کا بھی اظہار ہو اور کہنے والے زمانوں کا احساس جمال بھی اس میں موجود ہو۔ یہ فی الحقیقت

بہت بڑا کام ہے لیکن اگر آپ کو بڑا بننا ہے تو پھر ہی کام آپ کو کرنا چاہیئے اور اس کام کو کرنے کے لیے سخت محنت، وسیع مطالعہ، گہری فکر ہی کرنی چاہیئے۔ میرا اپنا خیال ہے اور آپ بھی اس پر غور کیجیے کہ تاریخ کی اس منزل میں جہاں آپ کھڑے ہیں۔ جہاں ادب و فن کی دنیا میں بہت بڑے بڑے کام ہو چکے ہیں صرف انگ رستہ بنا کر کوئی منزل نہیں ہے بلکہ امتزاج (Synthesis) اس دور کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور اسی امتزاج کی کوکھ سے آج کا ادب مستقبل کا بڑا ادب یا فن پیدا ہو سکتا ہے اور ہو گا۔ آپ اس پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ اس سلسلے میں آپ کیا کر سکتے ہیں یا آپ کو کیا کرنا چاہیئے۔ میں اپنی بات جدید تصوری کی ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ خطاطی ایک انگ فن ہے اور تصوری ایک ایک انگ فن ہے۔ صادقین نے، شاگردی نے، زہبی نے، خطاطی اور تصوری کے امتزاج سے اسے ایک ایسی صورت دی کہ خطاطی اور تصوری ایک دوسرے میں جذب ہو کر ایک نئی صورت میں جلوہ گر ہو گئے اور آج نئی نسل کے تصور اس راستے پر خوش دلی سے چل رہے ہیں۔ آپ بھی اسی طرح فکر و احساس کے تعلق سے ایک نیا امتزاج تلاش کیجیے۔ آپ بھی بڑے تصور بڑے فی کار بن سکیں گے۔

نئے نئے کھنڈے والوں سے اختصار کے ساتھ چند باتیں میں اور کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ آپ جو کچھ کہیں جو کچھ لکھیں آپ کی آوازیں دل درد مندگی نے شامل ہو۔ اس میں آپ کے خلوص کی مہک موجود ہو۔ آپ کی آوازیں سچائی کے اظہار کی توانائی کو جو دہر اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ دیانت کے ساتھ اپنی بات کہہ رہے ہوں۔ مصالحتیں مصالحوں کو جنم دیتی ہیں اور مصالحتیں تخلیق توانائی کو بر باد کر دیتی ہیں۔ عزیزو! آپ تو جوان ہیں۔ آپ نے زندگی کے سفر کا ابھی آغاز کیا ہے۔ زندگی کو بنا بنا یا سنوڑنا آپ کا اصل کام ہے۔ وہ زندگی جو آپ کو ملی ہے وہ نہیں ہے جو آپ اپنے بعد کی نسلوں کو دیں گے۔ یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ آنے والی نسلوں کو وہ زندگی دیں جو عدل و مساوات کی زندگی ہو۔ جو حق و دیانت کی زندگی ہو، جو افسانیت و محنت کی زندگی ہو۔ وہ زندگی جو میں نے اپنی نئی نسل کو دی ہے اس میں دعا و فریب شامل ہے۔ اس میں استحصال و جبر موجود ہے۔ اس پر منفی قوتیں

حاوی ہیں۔ اس میں انسانی تڑپ تڑپ کر بسک رہا ہے۔ وہ زندگی جس پر بنیا حاوی
 ہے جس پر شو کی لعنت مسلط ہے اور جس نے ساری زندگی کو جنگ کے دہانے پر لا کھڑا
 کیا ہے۔ وہ جنگ جو ساری دنیا کو آنا نانا میں فنا کر دے گی اور یہ خوب صورت پہاڑیہ حسین
 مرغزار یہ کھلتے ہوئے خوشبودار پھول یہ دریا یہ سمندر یہ آبشار اور یہ انسان کی تراشی ہوئی دلکش
 زندگی معدوم ہو جائے گی۔ میں آپ کے سامنے اس لیے شرمسار ہوں اور زندگی کے محشر میں
 اپنا اعمال نامہ لیے آپ کے سامنے گناہگار کی طرح کھڑا ہوں اور آپ سے کہہ رہا ہوں کہ میں اپنی
 زندگی کے مشن میں زندگی کی قدریں بدلنے میں ناکام ہو گیا۔ میرا قلم ادب کی دنیا میں وہ کام
 نہیں کر سکا ہے جو اسے کرنا تھا لیکن میری غیرت آپ کے لیے ایک سبق ہے اور میں چاہتا
 ہوں کہ آپ کا قلم وہ کام کرے جو اسے کرنا چاہیے۔ میں آج آپ کی توجہ اسی طرف مبذول
 کرانا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ کام جو مجھ سے اور میری نسل سے نہ ہو سکا وہ آپ ہمت
 حوصلے اور دیانت کے ساتھ کریں۔ عزیزو! اس وقت مجھے مصحفی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے وہ
 شعر برمحل ہے یا نہیں لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ اسی شعر پر اپنی بات کا اختتام کر دوں:
 وصل کی شب بھی لڑائی ہی رہی یار کے ساتھ
 سر سے عاشق کے عذاب شب بھرا نہ گیا
 اب یہ فیصلہ آپ خود کیجیے کہ یہ شعر برمحل تھا یا بے محل تھا۔ غزل کے اچھے شعر کی یہی
 خوبی ہوتی ہے۔

صحیح ادبی رویہ

ممتاز اصحاب کے انٹرویو ہمارے ہاں برسوں سے کیے جا رہے ہیں لیکن طاہر مسعود نے اس صنفِ جدید کے کیوس کو نہ صرف وسیع کیا ہے بلکہ انٹرویو دینے والوں سے ان کے دل کی بات کہلو کر اس بہتر کون بنادیا ہے۔ انھوں نے انٹرویو سے پہلے ضروری تیاری کی ہے تاکہ اس شخص سے کاموں سے واقف ہو کر گفتگو کی جاسکے۔ اس کتاب کے سارے انٹرویو کو جب میں نے ایک ساتھ پڑھا تو یوں محسوس ہوا کہ اس کتاب سے نہ صرف انٹرویو دینے والے کے مزاج، شخصیت اور خیالات کے اچھی واقفیت ہو جاتی ہے بلکہ گزشتہ پچاس سال کے اہم واقعات، تحریکیں، نظریات اور مسائل بھی اس کتاب میں دیکھا ہو گئے ہیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو اس کتاب کو اہم بنا دیتی ہے۔

اب تو خیر ادبی گروہ بندی کی نوعیت بدل گئی ہے لیکن آج سے بیس پچیس سال پہلے تک ادبی قریبوں کا سبب ذاتی نہیں بلکہ نظریاتی ہوتا تھا۔ ہم خیال لوگ اکٹھا ہو جاتے تھے اور ان میں ذاتی مفاد کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔ طاہر مسعود نے جب فیض احمد فیض سے اس قسم کا سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ ”ہم اپنی ذات کو اہمیت ہی نہیں دیتے اور نہ اسے مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنی ذات کے لیے کسی سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیں۔ کوئی اصول یا نظریہ کی بات ہو تو اس پر بحث کی جاسکتی ہے کیوں کہ بحث کرنے کا جواز موجود ہے لیکن اگر کوئی ذاتی اعتراض ہو اور آپ اس کا اسی شدت سے جواب دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ محض زمین کی سطح پر اتر گئے ہیں“ (ص ۲۲)۔ یہی وہ سطح ہے جو ایک بڑے

آدمی کی ذہنی سطح ہوتی چاہیے اور اب تک ہمارے بڑے ادیب اسی سطح کو برقرار رکھتے آئے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں 'نیا دور' کے ۳۲ شمارے میں محمد حسن عسکری صاحب کے خطوط شائع ہوئے ہیں اور ان میں بھی یہی پہلو ملتا ہے کہ عسکری صاحب کی ترقی پسندوں سے جنگ ذاتی نہیں بلکہ نظریاتی تھی۔ ممتاز شہر میں کے نام ایک خط مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۴۸ء میں انھوں نے لکھا کہ :

”ہمارے ہاں بعض عناصر ایسے بھی ہیں جو کلچر اور ادب کا نام لے کر سیاسی یا ذاتی فائدے حاصل کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ان کی ادبی سرگرمیاں صفر کے برابر ہیں۔ ہمیں اس ذہنیت سے بھی اپنے آپ کو پاک رکھنا ہے۔ یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو مخالفت کے جوش میں ترقی پسندوں کو جیل بھجوانا چاہتے ہیں۔ جس دن منٹو کو اور مجھے پتہ چلا کہ حکومت ترقی پسندوں کی نگرانی کر رہی ہے اس دن سے ہم نے ارادہ کر لیا کہ کم سے کم ہم دونوں ترقی پسند کے خلاف نہیں نکلیں گے بلکہ منٹو نے تو اپنا ایک مضمون بھی واپس منگالیا۔ ہمارا ادبی انجمن الگ ہے۔ ہم انھیں ادب میں پچھاڑنا چاہتے ہیں۔ پولیس کی مدد سے نہیں۔ ہم اپنی حکومت کے لیے بھی جاسوسوں کا کام نہیں کر سکتے بلکہ اگر حکومت نے ادبی سرگرمیوں کی بنا پر کسی ادیب کو گرفتار کیا تو سب سے پہلے ہم احتجاج کریں گے۔“

(نیا دور شمارہ ۷۹-۸۰ ص ۲۹۳)

یہ وہ زاویہ نظر تھا جو ایک بچے اور بڑے ادیب ہی کا انداز نظر ہو سکتا ہے اور یہی انداز نظر جس فیض کے انٹرویو اور حسن عسکری کے خطوط میں نظر آتا ہے۔ ادب و فکر کی سطح پر ہمارے اختلاف ذاتی نوعیت کے ہرگز نہیں ہونے چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ادب میں انجمنوں کے ذاتیات کا مسئلہ سب سے اہم ہو گیا ہے۔ اخلاص کی غرض سے مرعشی ہے اور ادب کا اثر ہے اثر ہو گیا ہے !

۱۲ جو ادیب مقصدی ادب پیش کرنا چاہتے ہیں وہ مقصدی ادب پیش کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن جو لوگ ایسا مقصد نہیں رکھتے ان کا ادب بھی ادب ہوگا اور انھیں پیش کرنے کا حق ہوگا۔ اس سلسلے میں ایک سوال یہ ہے کہ میرے نزدیک پاکستان جیسی اسلامی ریاست میں ایسے ادب کی تخلیق کی گنجائش ہے جو ریاست کے مقاصد کو پورا نہ کرتا ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ میری غزل ریاست پاکستان کے کسی مقصد کو پورا نہیں کرتی لیکن اس کے باوجود وہ اہم اور وسیع ہے کیوں کہ اس کی سچائیاں میرے نفس کی سچائیاں ہیں اور اس میں میرے ایسے تجربات تخلیق کی شکل میں ظاہر ہوئے ہیں جن کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ غرض یہ سمجھ لیتا کہ ادب یقیناً ریاست کے مقاصد کے تابع ہوتا چاہیے یہ کہنے کے مترادف ہے کہ ادب کو سیاسی، معاشی اور ریاست کی دیگر ضروریات کے مترادف ہونا چاہیے۔ (ص ۵۰)

یہاں میں نے ایک زاویے سے ادب کے بارے میں تین اہم اربوں کا نقطہ نظر بیان کیا ہے اور آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ تینوں نے مختلف سیاق و سباق کے باوجود ادب کی ماہیت کے تعلق سے ایک سی باتیں کہی ہیں اور یہی وہ انداز نظر ہے جو ایک ادیب کا ہونا چاہیے۔ اس کتاب کو ہر اس شخص کو دل لگا کر پڑھنا چاہیے جو بڑا ادیب بننا چاہتا ہے تاکہ وہ اپنے بڑے معاصرین کی رائے سے ادب کے بارے میں صحیح رویہ اختیار کر سکے۔

شاعری اور مسائلِ حیات

کسی نے کہا ہے کہ شاعری ”مسائلِ حیات“ کے اظہار اور اس کی ترجمانی کا نام ہے۔ میں آج خود سے یہی سوال پوچھتا ہوں کہ شاعری کے تعلق سے ”مسائلِ حیات“ کے آخر کیا معنی ہیں؟۔ روٹی کپڑا مکان اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل بھی مسائلِ حیات کے ذیل میں آتے ہیں۔ اپنوں، ہمسایوں اور ہسپتال میں لب دم سکتے ہوئے بیماروں کو دیکھ کر کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ بھی مسائلِ حیات کے ذیل میں آتی ہے۔ معاشرے میں جو نا انصافیاں ہیں اور جو ظلم و جبر ان نا انصافیوں کی کوکھ سے جنم لے رہا ہے وہ بھی مسائلِ حیات کے ذیل میں آتا ہے۔ آپ کے ذاتی مسائل، دکھ درد، غم روزگار، غم جہاں اور غم جاں یہ بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ وہ نظامِ فکر، وہ روایات، وہ عقیدے، وہ طرزِ حیات جس نے معاشرے کو بنجد کر دیا ہے وہ بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ معاشرے کے باطن میں ہونے والا اضطراب، مخصوص حالات سے پیدا ہونے والی بے چینی اور اس بے چینی سے پیدا ہونے والے جذبات، احساسات اور خیالات یہ بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو کچھ زیرِ فکر انسان دیکھ رہا ہے، جو کچھ وہ کر رہا ہے اور اس کے کرنے سے جو صورتیں سامنے آرہی ہیں جو اچھائی یا برائیوں پیدا ہو رہی ہیں اور خیر و شر کی جو صورت حال وجود میں آرہی ہے وہ سب مسائلِ حیات کے ذیل میں آتی ہیں۔ ان کو بیان کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ ان مسائلِ حیات کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کسی اخبار میں واقعاتی اور حقائق پر مبنی ایک مضمون لکھ دیں مگر آپ اخبار کے مدیر ہیں تو اس موضوع پر ادارہ لکھ دیں گے۔ آپ اخبار کے شاعر ہیں تو اس پہلو پر کوئی نظم یا قطعو لکھ دیں گے اور اس طرح اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کر کے پناہ بوجھ

ہلکا کر دیں گے لیکن جب میں شاعری کی بات کرتا ہوں تو مسائلِ حیات کے تعلق سے اس میں دو سطحوں کا ہونا لازمی ہے۔ ایک سطح یہ ہے کہ مسائلِ حیات کے تعلق سے جب آپ شعر چڑھیں تو آپ کی توجہ اس مسئلہ کی طرف جائے جس کا اشارہ اس شعر میں اس انداز سے کیا گیا ہے کہ بات آپ کے دل میں اُتر گئی ہے۔ یہ وہ سطح ہے جو شاعر کے ہم عصر انسانوں اور خود شاعر کے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہے۔ شعر اس لیے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے کہ اس میں کسی اہم واقعہ کسی اہم بات، کسی اہم مسئلہ کی طرف اشارہ ہے لیکن اگر یہ شعر کسی ایسے انسان کو جو اس معاشرے سے تعلق نہیں رکھتا، متاثر نہیں کر رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ شعر میں صرف ایک سطح اور ایک ہی تہ ہے اس لیے یہ شعر اس وقت تک ان لوگوں کے درمیان زندہ رہے گا جب تک اس مخصوص واقعہ کا اثر ان کے دلوں پر قائم رہے گا۔ اس شاعر جو روزمرہ کی زندگی کے واقعات کو شعر کا جامہ پہناتا ہے اپنے دور میں مقبول ہوگا لیکن جب یہ دور سمٹ جائے گا تو اس کی شاعری بھی اسی کے ساتھ طاقِ نسیاں کی تذر ہو جائے گی جیسا کہ ایسے شاعر ہیں جو ہمیشہ اپنے زمانے کی ترجمانی کر کے یہ کام کرتے رہے ہیں لیکن ہر عرصے شاعر کے ہاں شعر کی دو سطحیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ سطح جس سے وہ اپنے دور کی ترجمانی کر رہا ہے۔ دوسری وہ سطح جو اس کے عہد سے ماوراء ہوتی ہے۔ غالب، خیر، اقبال، مولانا، روم، حافظ و سعدی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ مثلاً خیر کو ایسے۔ خیر کی شاعری میں جو تیور، جو لہجہ، جو رنگ اور غم و کرب کی جو کیفیت نظر آتی ہے اس کا تعلق اس کے عہد کے اس کرب سے ہے جب مغلیہ تہذیب زوال کی طرف تیزی سے جارہی تھی، جظیم تہذیب کی دیوہیکل عمارت ملہ بن رہی تھی اور اس دکھ میں سارا معاشرہ مبتلا تھا۔ خیر نے اس دور کی زندگی کے دیباچے اس دکھ کو اٹھایا اور اپنی شاعری کی روح میں جذب کر دیا۔ اسی لیے خیر اپنے دور کا مقبول شاعر تھا۔ مقبول اس لیے کہ اس نے معاشرے کے باطن میں ہونے والے دکھ و درد کو اس کے کرب اور غموں کو ان واقعات کے حوالے سے اس طرح بیان کیا کہ اٹھارویں صدی کی روحِ حیات کی نبض پر خیر کی انگلیاں جگمگیں۔ اس لیے خیر اپنے دور کا تنہا اپنے دور کا نامندہ شاعر ہے اس کے اشعار میں اٹھارویں صدی کے انسان کے لیے ان واقعات

کی طرف ایسے درد انگیز اشارے موجود تھے کہ تیر کا شعر اس کے دل میں اتر جاتا تھا۔ اگر تیر کا شعر صرف اپنے دور کے لیے مخصوص ہوتا تو سچ تیر کی شاعری کا رنگ بھی کا اتر جاتا لیکن تیر نے اس کرب کو 'اس غم و اندوہ کو کونے والے زمانوں کی روح سے ملا دیا اسی لیے تیر کا غم ذاتی ہونے پر بھی ذاتی نہیں ہے' 'وقتی ہوتے ہوئے بھی وقتی نہیں ہے۔ تیر کے شعر آج بھی اسی طرح متاثر کرتے ہیں جس طرح وہ اپنے دور میں کرتے تھے۔ اسی لیے تیر ہر بڑے شاعر کی طرح، دو سطحوں کے شاعر ہیں اور یہ دونوں سطحیں مل کر تیر کو بڑا شاعر بناتی ہیں۔ تیر اپنے دور کے مقبول ترین شاعر تھے اور آج بھی 'جب ان کا زمانہ اور ان کا دور کبھی کا ختم ہو چکا ہے' وہ بڑے اور مقبول شاعر ہیں۔ 'تو گویا' مسائل حیات ہی شاعری کا خام مواد ہوتے ہیں۔ شاعری کا نامانا اسی سے بنتا ہے لیکن شاعر ان مسائل حیات کو کس طرح اور کس انداز سے شاعری میں ٹھکانا ہے دراصل یہ وہ پہلو ہے جس سے شاعری کے درجے مقرر ہوتے ہیں۔

ادب اور جمہوریت

اس موضوع پر اظہار خیال کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ میں کچھ دیر جمہوریت کی مدح میں قصیدہ پڑھوں اور کچھ دیر آمریت کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کروں اور آخر میں فنون لطیفہ کے بارے میں کچھ عام سی باتیں خاص انداز میں کر کے آپ سے رخصت ہو جاؤں لیکن میں ایسا کرنے کا کوئی ارادہ اس لیے نہیں رکھتا کہ میں جمہوریت کو ہمیشہ سے ایک بہتر اور فطری نظام سمجھتا ہوں اور آمریت کو ہمیشہ سے غیر انسانی اور جاہلانہ نظام سمجھتا ہوں۔ میری رائے آج بھی یہی ہے، گندے ہونے کی میں بھی یہی مانتی اور آنے والے گل میں بھی یہی ہوگی۔ یہ انداز نظر میری فکر، میری ذات، میری شخصیت اور میرے ذہن و دانش کا حصہ ہے اور میری تحریروں اور تصانیف میں بار بار آیا ہے۔ یہ بات کہہ کر میں برا و راست اپنے موضوع پر آتا ہوں اور آنے سے پہلے یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ فنون لطیفہ میں چوں کہ ادب، شاعری، موسیقی، مصوری اور دوسرے سب فنون شامل ہیں اور مختصر سے وقت میں ان سب پر بات کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے میں اپنی بات کو صرف ادب تک محدود رکھوں گا۔

فرانسیسی مفکر، ادیب، ژان پال سارتر سے جب پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک ادب اور سیاست کا کیا رشتہ ہے تو اس نے جواب دیا کہ سیاسی عمل کو ایک ایسی دنیا کی تعمیر کرنی چاہیے جس میں ادب آزادی کے ساتھ آزادی کی فضا میں اظہار کر سکے۔ ادب آزادی کے اظہار کی ایک حقیقی صورت ہے۔ آزادی کی یہی وہ فضا اور آزادی کا یہی وہ تصور ہے جس نے فرانسیسی ادب کو دنیا کے لیے مینارۂ نورد بنایا ہے۔ وہاں کا ماحول

وہاں کا فرد خود کو نہ صرف آزاد محسوس کرتا ہے بلکہ آزادی کے ساتھ اپنا اظہار بھی کرتا ہے اور آزادی کا یہی احساس فرد اور معاشرے کے انفرادی اور اجتماعی رویوں کا تعین کرتا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے کہ الجزائر کی جنگ آزادی کے دوران میں سارتر اور حکومت وقت کا طرز عمل ایک دوسرے سے بالکل متضاد تھا۔ سارتر الجزائر کی آزادی کا حامی اور ڈی گال کی حکومت اس آزادی کی مخالف تھی۔ سارتر فرانس میں الجزائر کی حمایت کی تحریک میں پیش پیش اور حکومت وقت سے متصادم تھا۔ اسی کش مکش میں اس گھر پر بھی پھینکا گیا اور پولیس نے تجویز پیش کی کہ سارتر کو گرفتار کر کے قید کر دیا جائے۔ جب یہ فائل ڈی گال کے سامنے آیا تو ڈی گال نے کہا کہ میں ساتھ کی گرفتاری کے کاغذ پر اس لیے دستخط نہیں کر سکتا کہ یہ بات تو آنے وقت ہی بتائے گا کہ آیا میں فرانس تھا یا سارتر فرانس تھا؟ اور میں فرانس کو یقیناً گرفتار نہیں کر سکتا اس واقعہ سے اس انداز نظر اور اس انداز نظر سے پیدا ہونے والی فضا کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جس سے ادب و فکر کی روح پر و ان چڑھتی ہے اور حقیقی جمہوریت کی فضا سے معاشرہ جھک اٹھتا ہے۔ جمہوریت اور ادب دونوں ساتھ ساتھ چلتے اور ایک دوسرے کو مستحکم کرتے ہیں۔ ادب بغیر جمہوریت کے ٹرچھایا ہوا پھول ہے اور جمہوریت بغیر ادب کے ایک بخریگ زار ہے۔ جمہوریت صرف کسی ایسی حکومت کا نام نہیں ہے جسے عوام نے منتخب کیا ہو بلکہ یہ ایک طرز حیات، ایک انداز فکر ہے جس میں دشمن کی بات بھی، ملک و قوم اور عالم انسانیت کے حوالے سے اٹھنڈے دل سے سُنی جاتی ہے، جس میں ذات کو فنا کر کے اجتماعی روح کو اہمیت دی جاتی ہے جس میں تعصبات سے بلند ہو کر فیصلے کیے جاتے ہیں جس میں چھوٹی سے چھوٹی رائے کو توجہ اور تحکم سے سنا جاتا ہے اور صرف اپنی طبقاتی یا علاقائی لنگر کو دوسروں پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ہمارا معاشرہ جو بنیادی طور پر جاگیر دارانہ معاشرہ ہے آج تک اسی ذہنیت کا حامل ہے۔ اس معاشرے کا بنیادی رویہ آج تک وہی جاگیر دارانہ رویہ ہے اور جاگیر دارانہ نظام جوں کہ آج کھوٹے سکے کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے

ہمارے سارے معاشرتی، معاشی اور سیاسی بحران اسی کھوٹے سٹکے کو مسلسل چلانے کی ذہنیت اور کوشش سے پیدا ہو رہے ہیں۔ آج کے ادب کو جمہوریت کے فروغ کے لیے جاگیردارانہ نظام، جاگیردارانہ ذہنیت کو موضوع بننا کر اسے جلد سے جلد اپنے انجاء کو پہنچانے کے لیے وہ شعور عوام میں پیدا کرنا چاہیے کہ یہ ذہن اور ذہنیت ہمیشہ کے لیے ہمارے معاشرے سے ختم ہو جائے۔ اس نظام نے پاکستانی معاشرے کو کس کس طرح سے خراب کیا ہے اور گزشتہ ۴۲ سال سے کس طرح نئے نئے تحراؤں کو جنم دیا ہے اور کس طرح ہمارے معاشرے کا انسان جبر و استحصال کا شکار ہو رہا ہے اور کس طرح انسانیت اس کے پیروں تلے روندی گئی ہے اور کیسی کیسی دردناک کہانیوں نے جنم لیا ہے۔ ان کو ادب کا موضوع بنا کر نئے شعور کو جنم دینے کی ضرورت ہے تاکہ اس نئے شعور سے پاکستان نئی دنیا کی تعمیر کر سکے۔ یہ وہ شعور ہے جس سے جمہوریت نہ صرف پروان چڑھتی ہے بلکہ فطری طریقے سے مستحکم ہوتی جاتی ہے اور وہ فضا پیدا ہوتی ہے جو ادب کی دین ہے اور جو جمہوریت کی اساس ہے۔ ادب انسان کو نقصانات سے بلند اٹھاتا ہے۔ اسے اپنی ذات سے بلند کرتا اور جذبہ ایثار پیدا کرتا ہے، اسے خود غرضیوں کے جال سے نکلاتا ہے، اسے جبر و استحصال اور آمریت کے غمریت سے آزاد کرتا ہے۔ اسے مقصد حیات کی روشنی دیتا ہے۔ ہمارے ہاں جو بار بار آمریت کے دور نامہ مسجور کا درد ہوتا ہے یا اس کا دھوکا لگا رہتا ہے تو اس کی بنیادی وجہ وڈیروں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا وہ ڈولہ ہے جو کسی نہ کسی صورت میں ہمارے شکیں بدل کر اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے اور صرف اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے قانون کا محافظ بن جاتا ہے اور غریب عوام بے بسی کے عالم میں منہ بٹکتے رہ جاتے ہیں۔ عوام ہی اصل قوت کا سرچشمہ ہیں۔ جمہوریت عوام کو ابھارتی، اٹھاتی اور ان کی پرورش کرتی ہے اور ادب عوام کے مسائل، ان کے جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہے اور یہی اظہار معاشرے میں اس شعور کو پیدا کرتا ہے جس سے خود جمہوریت جڑ پکڑتی اور ارتقا کی منزل سے گذرتی ہے۔ ادب کا کام اپنے معاشرے کی جڑوں کو سیراب کرنا ہے، عوام سے اپنا

رشتہ نانا مضبوط کرنا ہے۔ ادب کے ذریعے قاری تک ان باتوں کو پہنچانا ہے جن کو اس نے فوٹے فوٹے انداز میں محسوس تو کیا تھا لیکن پوری طرح محسوس نہیں کیا تھا۔ اسی احساس سے وہ شعور پیدا ہوتا ہے جو ادب کا کام اور مقصد ہے اور جو جمہوریت کے لیے تازہ ہوا کا درجہ رکھتا ہے۔ ادب زندگی کا اظہار ہے۔ وہ عہد حاضر کے تعلق سے زندگی کی ان گہریوں کو کھولتا ہے جو معاشرے کی نظروں سے اوجھل تھیں۔ وہ مسائل، محسوسات اور شعور کو تو ابھارتا ہے لیکن تعصبات، تنگ نظری اور خود غرضی کو مٹاتا ہے۔ بڑا ادب وہ ہے جو ذہن انسانی کو تبدیل کرے اور اسے عمل کی طرف رجوع کرے۔ آج ہمیں ایسے ہی ادب کو سامنے لانا چاہیے تاکہ ادب عوام اور جمہوریت کی روح کا ترجمان بن جائے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ جمہوری معاشرہ آزادی کی فضا کو برقرار رکھے، ادب، ادیبوں اور ادبی قدروں کو اہمیت دے اور ان کا احترام کرے اور اُس غلامانہ ذہنیت کو ختم کرنے کے لیے عملی اقدام کرے جو دو سو سال دور غلامی سے ہمیں ذہنی و فکری ورثے اور نظام فکر کے طور پر ملی ہے۔ دور غلامی کی اس ذہنیت نے اب تک ملک و قوم اور جمہوریت کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہ ذہنیت جہاں جہاں ہمیں نظر آئے اسے جمہوری فکر سے بدلنے اور ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی کوشش کرتی چاہیے۔ آج کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ ادیب کو جمہوریت کے ارتقا و استحکام کے لیے اپنے قلم کو وقف کر دینا چاہیے، عوام سے نیا رشتہ قائم کرنا چاہیے۔ انگریزی دور کی غلامانہ ذہنیت سے معاشرے کو نجات دلانے کے لیے قلم اٹھانا چاہیے۔ جاگیردارانہ نظام کو مٹانے کے لیے ادب کو کارزارِ عمل میں لانا چاہیے، علاقائی تعصبات پر مبنی ذہنیت سے نجات حاصل کرنی چاہیے اور سب کے لیے یکساں انصاف کو اپنی فکری اساس بنانا چاہیے۔ نیا شعور اسی انصاف کی کوکھ سے جنم لے گا اور انصاف ہی وہ حقیقی قوت ہے جس پر صحت مند معاشرہ قائم ہوتا ہے اور خدائیں و حضرات ایاد رکھیے کہ نا انصافی اُس گیند کی مانند ہے کہ جسے آپ جس قوت سے معاشرے کی دیوار پر ماریں گے وہ اسی قوت سے واپس آئے گی۔ ادب، ادیب اور

جمہوریت کے حامیوں کو نا انصافی کے اس عمل میں شریک نہیں ہونا چاہیے اور قلم سے اس کے خلاف جہاد کرنا چاہیے۔ جمہوریت کے ارتقا میں یہی وہ کردار ہے جو ادب و ادیب، عہد حاضر کے تعلق سے، ادا کر سکتا ہے اور اسے ہی کرنا چاہیے۔

(۳۱ اگست ۱۹۸۹ء)

اُردو نعت گوئی کا تاریخی ارتقاء

”نعت“ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی تعریف و توصیف کے ہیں لیکن عربی فارسی اردو اور مسلمانوں کی دوسری زبانوں میں لفظ نعت صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف اور مدح کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ اب جب بھی ہم نعت کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد وہ پادشاہی ہے جس میں سرور کو نبی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و صفات کی توصیف و مدح کی گئی ہو۔

نعت کے لیے کوئی مخصوص ہیئت مقرر نہیں ہے۔ کسی بھی صنفِ سخن کی ہیئت میں لکھی جاسکتی ہے۔ یہ صنفِ سخن قصیدہ اور شہنوی بھی ہو سکتی ہے۔ غزل قطعہ، رباعی یا کوئی اور صنفِ سخن بھی ہو سکتی ہے۔

نعت گوئی کا آغاز سب سے پہلے عربی زبان میں ہوا اور عربی سے اس کا رواج فارسی اردو اور مسلمانوں کی دوسری زبانوں میں ہوا۔ رسولِ پاکؐ سے محبت ہمارے مذہب کا حصہ ہے۔ خود خدا نے قرآنِ پاک میں بار بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف کی ہے۔ یہ توصیف بھی نعت کے ذیل میں آتی ہے۔ مسلم شریف میں یہ حدیث درج ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایمان نہیں لایا جب تک میں اس کے بیٹے، والدہ اور تمام لوگوں سے نہ پاؤں محبوب نہ ہو جاؤں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جب رسولؐ جزوِ ایمان ہے اور یہی حبِ رسولؐ نعت گوئی کی بنیاد ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی سے نعت گوئی کا رواج شروع ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا اور پھیلتا چلا گیا۔ پہلے نعت گو شاعر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ

تھے۔ اسی سلسلے میں ایک اور نام کعب بن زحیر کا ہے جنہوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں نعتیہ قصیدہ پیش کیا۔ عربی نعت گوئی میں ایک بہت اہم اور ممتاز نام ساتویں صدی ہجری کے محمد بن سجدہ بوسیری کا ہے جن کا قصیدہ بروئے ساری دنیا کے اسلام میں آج بھی مخصوص محفلوں میں عقیدت و محبت سے سنا جاتا ہے اور جس کے سیکڑوں تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ نعت گوئی کا یہ سلسلہ آج بھی عربی شاعری میں جاری ہے۔

عربی نعت کے نیمپڑا فارسی زبان میں بھی نعت گوئی کا آغاز ہوا۔ فردوسی کے شاہنامہ میں نعتیہ اشعار موجود ہیں۔ ابو سعید البو الخیر (م ۴۳۰ھ) کی رباعیات میں نعتیہ کلام موجود ہے۔ حکیم سنائی (۵۲۵ھ) کے ہاں بھی نعتیہ کلام ملتا ہے۔ فرید الدین عطار کے علاوہ نظامی کی شہزادہ خسرو نامہ میں نعت گوئی اپنے کمال پر نظر آتی ہے۔ نظامی کی نحتوں میں وہ زور کلام موجود ہے کہ آج آٹھ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود نظامی کے اشعار دل میں اتر جاتے ہیں۔ مولانا روم کی توساری شہزادہ خسرو نامہ میں اس لیے آتی ہے کہ روح محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ سعدی شیرازی (۱۲۹۱ھ) کی ذاتِ گرامی عشقِ رسول سے سرشار تھی اسی لیے انہوں نے جو کچھ کہا وہ جریدۂ عالم پر ثبت ہو گیا۔ بلخ العلیٰ بکمال، کشف الہجلی، بھالہ تو کج تک ساری دنیا کے اسلام میں سب کی زبان پر رواں ہے۔ امیر خسرو تبر عظیم پاک و ہند کی وہ عظیم اور زندہ جاوید شخصیت ہیں جن کا نام ہمارے خون کے ساتھ گردش کر رہا ہے۔ ان کی نعتیں آج بھی محفلِ حال و قال اور محفلِ میلاد میں شوق کے نشی ماتی ہیں۔ ان کا یہ شعر تو ضربِ المثل بن گیا ہے،

آفاق باگردیدہ ام مہربتان درزیدہ ام

بسیار خوبان دیدہ ام امانا تو چہیزے دگر

اس نعتیہ غزل کو آپ بھی سنئے :

اے چہرہ زیبائے تو رشکِ بتان آذری

ہر چند وصلت می کنم در حسنِ داں زیبائی

کافاق باگر دیدہ ام مہرستان ورزیدہ ام
 بسیار خربان دیدہ ام امانا تو چیز سے دیگری
 من تو شدم تو من شدمی من تن شدم تو جان شدمی
 تاکس زگوید بعد ازیں من دیگر م تو دیگری
 تو از پری پاکب تری، و ز بگب گل نازک تری
 از ہرچہ گویم بہتری حقا عجائب دلبری
 عالم مہدیغاٹے تو خلق جہاں شیدائے تو
 آن ترس شہلائے تو آوردہ رسم کافی
 خسر و غریب است و گدا افتادہ در شہر شا
 ہاشد کہ از بہر خدا سوائے غریباں بنگری

حضرت امیر خسرو کے بعد مولانا جامی، عینی اور قدسی کے نام نامی آتے ہیں جن کا
 کلام آج بھی محفل سماع و میلاد میں شن کر عاشقانِ رسول اشک بار ہو جاتے ہیں۔ حضرت
 قدسی کی وہ غزل، جس کا مطلع

مرحبا سیدی مکی مدنی العسری
 دل و جان باوقدایت چہ عجب خوش نقبی

آج بھی ہمارے کانوں میں رس گھونتی ہے۔

عربی و فارسی شاعری کی اس عظیم روایت نے اردو نعت گوئی کو بھی شدت سے
 متاثر کیا اور جب سے اردو شاعری کا آغاز ہوا نعتیہ شاعری کسی نہ کسی صورت میں جہیں ملتی
 ہے۔ نعتیہ اشعار حسن شوقی کے ہاں بھی ملتے ہیں اور قلی قطب شاہ کے ہاں بھی۔ مگر ادبی اور
 نصرانی کے ہاں بھی ملتے ہیں اور ولی کنہی اور سرساج اور جنگ آبادی کے ہاں بھی۔ گزشتہ چار ہائی
 سو سال کے عرصے میں لکھے جانے والے معراج نامے، نور نامے، قولہ نامے، اوقات نامے آج
 بھی کئی تعداد میں مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ نعتیہ شاعری سودا و میر درد کے ہاں بھی اپنا
 رنگ دکھاتی اور دہلویں کو گر ماتی ہے اور نظیر اکبر آبادی اور غالب کے ہاں بھی۔ لیکن

وہ شعر جنہوں نے خصوصیت کے ساتھ نعت گوئی کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا ذریعہ بنالیا ان میں کرامت علی خان شہیدی (متوفی ۱۲۵۶ھ) کا نام نعت گوئی کی تاریخ میں خما اہمیت رکھتا ہے :

تمنا ہے درختوں پر ترے روغنے کے جلیٹے
قص جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا
خدا منہ چوم لیتا ہے شہیدی کس محبت سے
زبان پر میری جس دم نام آتا ہے محمدؐ کا

کم و بیش اسی دور کا ایک اور نام مولوی غلام امام شہید کا ہے۔ شہید سراپا عشق تھے اور انہوں نے مختلف اصنافِ سخن مثلاً قصیدہ، مغل، مثنوی، غمہ، ترجیع بند میں صرف اور صرف نعتیہ کلام لکھا۔ جذب و شوق اور قدر و اظہار نے ان کی شاعری کو پُر اثر بنا دیا ہے۔ شہید نے میلاد بھی لکھا تھا جو میلاد شہید کے نام سے آج بھی محفل میلاد میں پڑھا جاتا ہے۔ ان کے یہ دو شعر سنئے :

بوسے کی تمنا ہے جو مینائے فلک کو
بھکتا ہے سوئے گنبدِ خضرائے مدینہ
قسمت یہ دکھاتی ہے حسرت کی نظر سے

ہم دیکھتے ہیں اس کو جو دیکھ آئے مدینہ
بحرِ طویل میں شہید نے جو نعتیہ قصید لکھا تھا وہ بھی بچے سننے اور سننے کے لائق ہے :
از مقدم نور خدا، شمس الضحیٰ، بدر الدجی، بنجم الہدیٰ، خیر الورا، بحر عطا ابر سخا
کلاںِ حیا کو و فدا، شانِ علا، شمع بقا، مہر ضیا، ماہ صفا، شاہِ زمن ۔

حکیم مومن خان مومن (متوفی ۱۸۵۱ء) اردو میں منفرد و شہید شاعری کی وجہ سے مشہور ہیں۔ لیکن انہوں نے نعتیہ شاعری میں جس انداز سے عشق رسولؐ کا اظہار کیا ہے وہ بھی منفرد و ممتاز ہے۔ مومن نے کل نو قصیدے لکھے جن میں سے ایک حمد میں ہے : ایک نعت میں اور چار غزلوں میں کی مدح میں ہیں ان کے علاوہ ایک مثنوی

ایک تفسیق اور کچھ رباعیاں بھی نعت میں لکھی ہیں۔ عشقیہ شاعری کی وہ لمبے جرمون کی غزلوں میں ملتی ہے نعت میں ایک ایسا والہام جوش اور گداز بن جاتی ہے کہ پڑھنے والا عشق رسولؐ کی کیفیت سے سرشار ہو جاتا ہے۔

ویسے تو ایتھریائی کے سارے کلام میں نعتیہ اشعار ملتے ہیں لیکن ”محمد خاتم النبیین“ ان کا نعتیہ دیوان ہے جو ۱۸۷۲ء میں شائع ہوا۔ ایتھریائی کے نعتیہ کلام میں جذب و کیف اور عقیدت و عشق نے وہ اثر و تاثیر پیدا کیا ہے کہ ان کا کلام سننے والے کی روح میں اتر جاتا ہے۔

نعت گو شعرا میں محسن کا کوہ روی سب سے الگ حیثیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے ساری عمر صرف اور صرف نعتیہ شاعری کی:

یہ ہے خواہش کردہ میں عمر بھر تیری ہی مددای

نہ اٹھے بوجھ مجھ سے اہل دنیا کی خوشامد کا

سوز و گداز، فکر و غمی اور فنی شعور کے اعتبار سے محسن کا کوہ روی نعت گوئی میں ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کا قصیدہ ”لا ید ایک ایسا سدا بہار تحفہ ہے جسے بڑھ کر مشامِ جا معطر ہو جاتے ہیں،

ذکوئی اس کا مشابہ ہے نہ جہر نہ نظیر

ذکوئی اس کا مماثل نہ مقابل نہ بدل

ادبِ رفعت کا قمرِ خنجرِ دو عالم کا شمر

بحرِ وحدت کا گہر چشتِ کثرت کا کنول

بحرِ توحید کی ضد ادبِ کثرت کا مہرِ نذر

شیخِ عباد کی لو بزمِ رسالت کا کنول

مرجعِ روح امیں زیب دو عرشِ بریں

حامی دیں مستحق ناسخِ ادیان و ملل

سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل
 میرے ایمانِ مفصل کا بھی ہے محل
 ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی
 نہ مرا شعر نہ قطعہ نہ قصیدہ نہ غزل
 آرزو ہے کہ رہے دھیان ترا تادمِ مرگ
 شکلِ جبری نظر آئے مجھے جب آئے اجل
 روح سے میری کہیں پیار سے یوں عزرائیل
 کہ مری جان مہینے کو جو چلتی ہے تو چل

محسن کا کوروی کے ہم عصر اور ان کے بعد کے شعراء میں مولانا الطاف حسین
 حالی بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے نعت کو امت مسلمہ کی اصلاح و
 بیداری کے لیے استعمال کیا یہی وہ لے ہے جو علامہ اقبال کی شاعری میں ایک نئے
 انداز سے جلوہ گر ہوئی۔ ویسے تو انھوں نے غزل کی ہیئت میں بھی نعت لکھی ہے لیکن مبدی
 مدد و جزا اسلام میں جو مسند جس حالی کے نام سے معروف ہے انھوں نے ولادت سے
 متعلق جو اشعار لکھے ہیں وہ آج بھی دلوں کو گرماتے اور زبان زد خاص و عام ہیں۔

وہ تمبیوں میں رحمت لقب پانے والا

مرا وہی ظریہوں کی بر لائن والا

اور اس کے کئی بند تو آپ نے سنے ہوں گے اب یہ نعت بھی سنئے !

اے خاصہ خاصانِ رسول وقت دعا ہے

انت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

وہ دین، ہوئی بزمِ جہاں جس سے چسراغاں

اب اس کی محاسن میں نہ جی نہ دیا ہے

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے

اس دین میں خود تفرقہ اب کسے پڑا ہے

جو دین کو ہمدرد بنی نوع بشر تھا
 اب جنگ و جدل چار طرف اس میں پہا ہے
 فریاد ہے اے کشتی امت کے نگہبان
 بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے
 کمر حق سے دعا آمتِ موعود کے حق میں
 خطروں میں بہت جس کا جہاز کے گھرا ہے
 امت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن
 ولد ارادہ تراک سے ایک ان میں پڑا ہے

اس دور کے دوسرے نعت گو شعرا میں یوں تو بہت سے نام ہیں لیکن شاہ نیاز
 بریلوی (متوفی ۱۸۳۳ء) ہیدم شاہ وارثی اور احمد رضا خان بریلوی (متوفی ۱۹۲۱ء)
 خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شاہ نیاز کا کلام کیفیتِ عشق میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہیدم وارثی
 حلقِ مجسم بن کر سامنے آتے ہیں اور حضرت احمد رضا خان بریلوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 کی ذات و صفات اور حیات و سیرت کو کیفیتِ عشق سے ملا کر ایک نیازِ جگ عطا کرتے
 ہیں۔ ان کا دیوان ”حدایقِ بخشش“ تین حصوں میں شائع ہو کر عشاقِ رسول کے دلوں میں
 شمعِ محبت و عقیدت روشن کر چکا ہے۔ ان کا سلام جس کا مطلع یہ ہے:

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
 شمعِ بزمِ رسالت پہ لاکھوں سلام

آج بھی ہر خاص و عام کی زبان پر ہے۔

علامہ اقبال کا سارا کلام مدحِ رسول کا موثر اظہار ہے۔ انھوں نے اپنے کلام
 میں دینِ اسلام کی روح کو اس طرح نعت کا رنگ دیا ہے کہ خود اقبال ملتِ اسلامیہ کی
 نشاۃ الثانیہ کی علامت بن گئے ہیں۔ ہال جبریل کی یہ غزل سنئے جس میں سوز و گداز بھی ہے
 جو نعت کی جان ہے اور خیانت لو کی وہ آرزو بھی جس سے علامہ اقبال کی ساری شاعری
 عبارت ہے:

روح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود اکتساب
 گنبدِ آجینہ رنگ تیرے محیط میں حجاب
 عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
 ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
 شوکتِ سحر و سلیم تیرے جلال کی نمود
 فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب
 شوقِ ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
 میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب
 تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے

عقلِ لیا ب و جستجو، عشقِ حضور و اضطراب
 یہ تعارف نامکمل رہ جائے گا اگر مولانا ظفر علی خان کا ذکر نہ کیا جائے۔ مولانا کے
 ہاں نعت گوئی میں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور اسالیب کی وسعت بھی۔ ان کی نعتیں
 محفلوں میں عام طور پر محبوبیت کے ساتھ سنائی جاتی ہیں۔ ان کے کلام میں عشقِ رسولؐ سے پیدا
 ہونے والی کیفیتِ روح کو اس طرح گرمادیتی ہے کہ عشقِ رسولؐ، نعتِ سنیے والے کا جزو
 احساس بن جاتا ہے :

ان کی یہ نعت سنیے :

دل جس سے زندہ ہے وہ حتماً تم ہی تو ہو

ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تم ہی تو ہو

پھر ٹا جو سینہ شبِ تارِ الست سے

اس کو راویں کا اچالا تم ہی تو ہو

سب کچھ تمہارے واسطے پیدا کیا گیا

سب غایتوں کی غایت، ادنیٰ تم ہی تو ہو

جو ماسوا کی حد سے بھی گئے گذر گیا

اے رہ نور و جادۂ اسری تم ہی تو ہو

گھرتے ہو دلوں کو تمام لیا جس کے ہاتھ نے

اے تاج دارِ شرب و بطحا تم ہی تو ہو

اس دور میں اور اس کے بعد جن دوسرے شعرا نے نعت گوئی میں نام پایا ان میں امجد حیدر آبادی، اکبر دارائی میرٹھی، سہیل اقبال، حفیظ جالندھری، بہزاد لکھنوی، احمد سہارنپوری اور ماہر القادری کے نام نمایاں اور ممتاز ہیں۔ امجد حیدر آبادی شاعری کی آواز کو رہنما کی گواہ جانتے ہیں جس سے خدا کی آواز آتی ہے۔ اثر و تاثیر ان کے کلام کا جوہر ہے۔ اکبر دارائی میرٹھی نے سیرتِ محمد کو محاشرے کے عام فرد تک نہایت پُر اثر انداز میں پہنچایا ہے۔ یا نبی سلام علیک، یا رسول سلام علیک، ان کا وہ سلام ہے جو کج بھی گھر گھر پڑھا جاتا ہے۔ میلاد اکبر ان کی وہ مقبول زمانہ تصنیف ہے جو ہزاروں بار شائع ہو چکی ہے۔ حفیظ جالندھری انیس کے شاگرد تھے جنہوں نے شاہنامہ اسلام چار جلدوں میں لکھ کر حتی شاعری ادا کیا ہے۔ شاہنامہ اسلام نعتیہ ادب میں ایک ممتاز و منفرد درجہ رکھتا ہے۔ حفیظ جالندھری کی یہ تصنیف تاریخ بھی ہے اور سیرت بھی۔ اس میں جذبہ ایمانی کا درس بھی ہے اور اصلاحِ احوال کی تلقین بھی۔

بہزاد لکھنوی کی نعتوں میں جذبہ عشق کا والہانہ پن دلوں میں اتر جاتا ہے۔ احمد سہارنپوری کی عشقیہ شاعری اپنی سادگی و پرکاری کی وجہ سے دلوں کو متاثر کرتی ہے۔ ماہر القادری کا کلام بھی عشقِ رسول میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان کے ہاں محبت و عقیدت کے حدود و جہاں اسی لیے ان کا کلام عشق کے جذبے کا پُر اثر اظہار ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ نعت گوئی کی مقبولیت ہمارے دور میں مسلسل بڑھ رہی ہے۔

اب عام طور پر جلسوں اور تقریروں میں تلاوتِ کلامِ پاک کے بعد نعتِ رسول مقبول پیش کی جاتی ہے۔ سرکاری سطح پر بھی نعت گوئی کی سرپرستی کی جا رہی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نعتیہ مشاعرے اور کلامِ نشر کیے جاتے ہیں۔ آج کی نعتیہ شاعری میں حالی اور اقبال کی لے بھی

شامل ہے اور محسن کا کوروی اور احمد رضا خان پر بلوی کی عشقیہ سرشاری بھی۔ جدید نعت میں موضوع و ہیئت کا تنوع بھی قابل ذکر ہے۔ نعت گو شعراء کی ایک طویل فہرست ہے جن میں حفیظ تائب بھی شامل ہیں اور مظفر وارثی بھی۔ محمد رسول نگری بھی اور احمد نعیم قاسمی بھی۔ ان کے علاوہ یوسف ظفر، منور بدایونی، عبدالعزیز خالد، حنیف اسعدی، صبا اکبر آبادی، عارف عہد النین، حافظہ صیادزی، طفیل ہوشیار پوری، انجم رومانی، نصرت قریشی، عاکشی کرمانی، شیر افضل جعفری، ناصر زیدی، یزدانی جالندھری، ذوقی مظفر نگری، اقبال عظیم، صہبہ انصاری، رشید الزمان غلش اور جعفر بلوچ وغیرہ بھی شامل ہیں۔

یہ فہرست یقیناً ادھوری اور نامکمل ہے۔ اس میں بہت سے نام شامل کیے جاسکتے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ نعت گوئی کے فن اور تاریخ کا وسعت اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔

نعت گوئی کا یہ ذوق نئی نسل کے شعراء میں بھی پروان چڑھ رہا ہے اور اسی لیے میرے خیال میں نعت گوئی کا مستقبل روشن ہے۔

(۲۹ اکتوبر ۱۹۸۷ء)

ہائیکو کے بارے میں

ہائیکو کے مزاج کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ چند بنیادی باتیں جاپانی تہذیب کے بارے میں بھی سمجھ لی جائیں۔ جاپان کا مذہب شنتو مذہب ہے۔ شنتو کے معنی ہیں دیوتاؤں کا راستہ۔ یہ مذہب صدیوں کی معاشرت اور تاریخی عوامل کے نتیجے میں رفتہ رفتہ پروش پا کر جاپانی معاشرے کی کوکھ سے پیدا ہوا ہے۔ یہ مذہب جاپانی معاشرے تک محدود ہے اور اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ مذہبی نقطہ نظر سے جاپانی معاشرہ عاقبت یا حیات بعد الحیات پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کے لیے یہی دنیا سب کچھ ہے۔ یہی آغاز ہے اور یہی انجام ہے۔ اس معاشرے میں تعلیم کی سونی صد شرح کے ساتھ ذات پات کا مخصوص نظام بھی قائم ہے۔ اپنے مذہب، معاشرت اور تہذیب پر ہر جاپانی فخر کرتا ہے اور اسی لیے اپنی قوم سے حد درجہ پیوستہ ہے۔ اس کے لیے دنیا میں دو قسم کے انسان بستے ہیں۔ ایک جاپانی اور دوسرا غیر جاپانی۔ یہ معاشرہ سمورائی تصورات پر قائم ہے۔ شنتو دیوتاؤں کا راستہ ہے اور شہنشاہ "تن فو" ہے جس کے معنی ہیں آسمان کا شہنشاہ۔ شہنشاہیت پر جاپانی معاشرے کی نظریاتی بنیادیں قائم ہیں۔ سمورائی تصورات میں شرم، بہادری اور نیک نامی معاشرتی و تہذیبی اقدار کا درجہ رکھتے ہیں۔ "ہن بو" بھی اس میں شامل ہے۔ ہن حصولِ علم ہے اور بو فوجی حرب ہے۔ انوار جس کی علامت ہے۔ یہ وہ تصورات ہیں جن میں عالم گیر اخوت، آفاقیت، اخلاقی یا روحانی اقدار کا کوئی تصور نہیں ہے اور اسی لیے ان کے ہاں کوئی بڑا مفکر جیسے گوتم بدھ یا کنفیوشس پیدا نہیں ہوئے اور مذاہن کے ہاں مولانا رومی، گونگے، غالب، اقبال یا ہائیکو جیسے شاعر پیدا ہو سکے۔ انہیں اثرات کی وجہ سے فکر و فلسفہ یا مابعد الطبیعیاتی تصورات جاپانیوں کے

مزارع سے مناسبت نہیں رکھتے اور اسی لیے ان کی شاعری بھی کسی گہری فکر کسی گہرے فلسفے یا تصورات کا اظہار نہیں کرتی۔ انہی تہذیبی اثرات نے ان کے مزاج کی تشکیل کی ہے جس کا اظہار نہ صرف "ہائیکو" میں ہوتا ہے بلکہ ان کی دوسری اصنافِ سخن میں بھی ہوتا ہے اور اسی لیے ہائیکو شاعری ویسی ہے جیسی وہ ہمیں نظر آتی ہے یعنی عام زندگی کے عام تجربوں کا دلچسپ اظہار۔ اس پس منظر کے ساتھ اب ہم ہائیکو کی طرف آتے ہیں۔

ہائیکو جاپانی شاعری کی وہ مقبول صنفِ سخن ہے جو حیثیت کے اعتبار سے علی الترتیب ۵-۴-۵- تہی رکھوں (Syllables) کے تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اور موضوع کے اعتبار سے ان تجربات مشاہدات اور خیالات کا اظہار کرتی ہے جن سے عام زندگی کا ایک نیا پہلو کسی خیال کا نیا رخ اور کسی بات کی نئی جہت سامنے آتی ہے۔ عام تجربے کے اسی نئے پہن کی وجہ سے ہائیکو پڑھ کر یائن کر استعجاب کے ساتھ لطف و مسرت حاصل ہوتے ہیں۔ اختصار ہائیکو کا سخن ہے۔ کنایا اس کا جوہر ہے اور اظہار کی جامعیت اس کا فن ہے۔ اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جاپانی شاعری میں آج سے تقریباً سو سال پہلے ہائیکو الگ صنفِ سخن کی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ یہاں طویل نظم کا ابتدائی حصہ تھی جسے جاپانی شاعری میں "ہانی کائی" کہتے ہیں اور اسی لیے اسے "ہوک کو" کہا جاتا تھا یعنی ہانی کائی کا ابتدائی حصہ اس ابتدائی حصے کی یہ اہمیت تھی کہ اس سے طویل نظم کا مزاج اور اس کی جہت متعین ہو جاتی تھی۔ جیسے عربی شاعری میں غزل قصیدے کی تشبیہ کا حصہ تھی اور بعد میں ایک الگ صنفِ سخن بن گئی اسی طرح ہائیکو بھی انیسویں صدی کے اواخر میں ماسا کا شیکی (۱۹۰۲-۱۸۶۷ء) کے زیراثر، ۱۸۹۰ء میں، ہانی کائی سے الگ ہو کر ایک علیحدہ صنفِ سخن کے طور پر ابھری اور تیزی سے مقبول ہو گئی۔ اس صنفِ سخن کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ جب ۱۹۳۰ء میں جاپان اور چین کے درمیان جنگ چھڑی تو حکومت وقت نے پہل کی کہ ہائیکو شعراء اپنی شاعری سے جنگ کی حمایت اور حکومت کی مدد کریں۔ بہت سے شعراء نے حکومت کا ساتھ دیا لیکن کیدو یونیورسٹی ہائیکو ایسوسی ایشن کے بہت سے شعراء نے تعاون نہیں کیا تو بارہ شاعر گرفتار کر کے قیل معجز دے گئے۔ یہی

صورت ۶۱۹۳۱ میں دوسری جنگ عظیم کے دوران پیش آئی جب ۱۳ ہائیکو شاعر گرفتار ہوئے۔ پاکستان کے ہائیکو شعرا کو میرا خیال ہے ابھی خوف زدہ ہونے کی اس لیے ضرورت نہیں ہے کہ ابھی تو ہمارے ہاں اس کی ہیئت کا مسئلہ بھی طے نہیں ہوا ہے اور ابھی یہ صنفِ سخن پورے طور پر ہماری صنفِ سخن بھی نہیں بن پائی ہے۔ اس وقت تو میں صرف اتنی بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ جیسے غزل اردو کی مقبول صنفِ سخن ہے اسی طرح ہائیکو جاپانی شاعری کی مقبول صنفِ سخن ہے اور گذشتہ سو سال میں اس صنف نے مختلف مغربی اثرات مثلاً رومانیت، فطرت پسندی، اشاریت اور پرولتاریت وغیرہ کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے ۶۱۹۳۷ میں جدید ہائیکو انجمن کے شعرا نے معاہدہ زندگی کے تجربوں سے ہائیکو کو ہم آہنگ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ ان شعرا نے موسم سے متعلق موضوعات کو ترک کر کے نظم آزاد کے اثرات کو ہائیکو میں شامل کیا لیکن یہ نئی مصرعے جدید زندگی کی پیچیدگیوں کا بوجھ نہ اٹھا سکے۔

جاپانی نقادوں کا زاویہ نظریہ ہے کہ ہائیکو نظم کسی بھی زبان میں لکھی جاسکتی ہے لیکن وہ اسی وقت ہائیکو کہلائے گی جب ہیئت و مونوہو کی اس روایت کو سامنے رکھا جائے جسے جاپانی شاعر سامنے رکھتے ہیں۔ بہر حال یہ بات واضح ہے کہ زندگی کے بھرپور گہرے تجربے ہائیکو کی ہیئت کی وجہ سے بیان نہیں کیے جاسکتے۔ یہ صنفِ سخن زندگی کے چھوٹے چھوٹے تجربوں کے اظہار تک محدود رہے گی اور یہی اس کا دائرہ ہے اور اسی دائرے میں ہائیکو شاعر اپنی کامیابی کا علم بلند کر سکتا ہے۔ ہمارے شاعر دو مصرعوں میں زندگی کے بڑے تجربوں، وسیع احساس اور گہرے جذبات کا ہمیشہ سے اظہار کرتے رہے ہیں اس لیے زندگی کے عام اور ننھے ننھے اچھوتے تجربوں کو وہ آسانی کے ساتھ ہائیکو کے تین مصرعوں میں بیان کر سکتے ہیں۔ پھر اردو زبان میں قافیوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے اور آہنی رکن (Syllables) ہماری وزن و بحر والی شاعری سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اسی لیے ہائیکو کی ہیئت کے سلسلے میں ہمیں سوچ سمجھ کر پہلے سے طے کرنا ہو گا کہ کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ بہر حال اردو شعرا کے لیے ہائیکو میں شاعری کرنا آسان ہی ہے اور مشکل

بھی۔ آسان اس لیے کہ جو بات سامنے آئے اسے تین مصرعوں میں بیان کر دیا جائے۔
مشکل اس لیے کہ ہائیکو کے لیے ضروری ہے کہ اس میں تجربے کی تازگی ہو اور شاعر دنیا
کو ایک ذرا مختلف انداز سے دیکھ رہا ہو۔

ہائیکو کی تکنیک کے سلسلے میں، میں خاص طور پر اپنے شعر کی توجہ ایک پہلو کی
طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ ہائیکو جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں تین مصرعوں پر مشتمل ایک مختصر
نظم ہے۔ اگر ہمارے شعر ان تین مصرعوں کو دو حصوں میں واضح طور پر تقسیم کریں۔ پہلے حصے
میں کہیں جانے والی بات ذہن کو ایک سمت میں لے جائے اور دوسرا حصہ اسے بظاہر دوسری
طرف لے جائے تاکہ تخیلی فاصلہ دونوں حصوں میں باقی رہے لیکن جب تینوں مصرعے ایک
ساتھ پڑھ جائیں تو ان کے اتصال سے ایک ایسا نیا پہلو سامنے آئے جس سے پڑھنے
والا واقف نہ تھا لیکن اس نے اس بات کو اس انداز سے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔
دونوں حصوں کے موضوعات بظاہر الگ الگ ہوں لیکن تخیلی سطح پر ان میں ربط موجود ہو۔
دونوں حصوں میں تخیلی فاصلہ اتنا زیادہ ہو کہ بات مبہم ہو جائے اور نہ اتنا واضح کہ بات
سپاٹ ہو جائے اور لطف سخن جاتا رہے۔ ایک حصے سے ایک ایچ ابھرے اور دوسرے
سے دوسری ایچ ابھرے اور دونوں تخیل کی سطح پر اس طرح مربوط و پیوست ہوں کہ ایک حصے
سے دوسرے حصے کی تفہیم پیدا ہو یہ پہلا حصہ دوسرے کی اور دوسرا حصہ پہلے کی اہمیت
برٹھائے۔ اردو شعر اپنی ہائیکو میں صنائع بدائع کا بھی استعمال کر سکتے ہیں کہ یہ ان کی میراث
ہے۔ موسم کے ذکر سے ایک طرف جا پانی ہائیکو کی روایت سے رشتہ جوڑا جاسکتا ہے اور
شعر میں کیفیت داخل کر دیکھا جاسکتا ہے۔ ویسے ہی موسم ہمارے مشاہدے کا حصہ ہیں اور
ہمارے شاعروں نے ہمیشہ بہار و خزاں کو زندگی کا اشارہ بنایا ہے۔ تہتی رکن (Syllable)
انگریزی و فرانسیسی کی طرح اردو زبان کی ساخت کا حصہ نہیں ہے لیکن ہمارے شعرا
مختلف بحر کے رکن کو تو ذکر ہائیکو میں استعمال کر سکتے ہیں۔

میں نے اردو ہائیکو کے دہائیوں مجموعے پڑھے ہیں جو جاپان ثقافتی مرکز نے شائع کیے ہیں
اور جن میں شیخ زاو و محمد شدہ ہائیکو شامل ہیں۔ ان سب میں ایک بات تو یہ مشترک ہے کہ

یہ جاپانی ہائیکو کی طرح تین مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ بعض شاعروں نے پہلے اور تیسرے مصرعے میں قافیے کا التزام کیا ہے۔ بعض نے تینوں مصرعوں کو قافیے سے آزاد رکھا ہے۔ اکثر شعرا کے ہاں دوسرا مصرع پہلے مصرع سے بڑا ہے۔ بعض کے ہاں تینوں مصرعے مختلف لمبائی کے ہیں۔ بعض کے ہاں پہلا مصرع لمبا ہے اور دوسرا چھوٹا اور تیسرا اور میانی ہے۔ کہیں تینوں مصرعے برابر ہیں۔ یہ صورت ترجمے والی ہائیکو میں بھی ملتی ہے اور طبع زاد میں بھی۔ طبع زاد ہائیکو میں اکثر شعرا نے پہلے اور تیسرے مصرعے میں قافیے کا اہتمام کیا ہے۔ ان مجموعوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ سوائے تین مصرعوں کے اردو ہائیکو میں ہیئت کی سطح پر کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہائیکو شعرا مل کر اس مسئلے پر تبادلہ خیال کریں اور اس کی ہیئت کو کوئی ایسی صورت دینے کی کوشش کریں جس سے ہائیکو کا مزید کامیاب تجربہ اردو شاعری میں کیا جاسکے۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے تو اس میں ہر موضوع آسکتا ہے لیکن بنیادی طور پر ہائیکو کسی بڑے موضوع کے اظہار کا ذریعہ نہیں بن سکتی البتہ عام تجربے کے کسی نئے پہلوئے نئے رُخ اور نئی جہت کا اظہار کامیابی سے کر سکتی ہے تین مصرعوں کو دو ٹکڑوں میں بانٹنے کا عمل مشہور انگریزی شاعر ایڈرا پاؤنڈ نے بھی کیا تھا اور کامیاب و پراثر ہائیکو لکھے تھے۔ یہ خیال ہے کہ یہیں بھی کرنا چاہیے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو ہائیکو کی ہیئت متعین کرنے کے لیے شعرا کا ایک اجلاس بلایا جائے جس میں تبادلہ خیال کر کے خصوصیت سے اس کی ہیئت اور مسائل پر بحث کی جائے۔ اب تک ہمارے ہاں ہائیکو کے نام سے جو کچھ کھا جا رہا ہے وہ ہائیکو سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے۔ ہائیکو نہیں ہے۔

فنِ تدوین

فنِ تدوین ایک ایسا موضوع ہے جس پر ہمارے ہاں بہت کم لکھا گیا ہے اور اب تک اس کے اصول و ضوابط اس طور پر مدون نہیں ہو سکے کہ سب یکساں طور پر ان اصولوں پر عمل کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ املا، روزِ اوقات اور اصطلاحات تراجم کی طرح یہ مسئلہ بھی قومی سطح پر ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ معذرت کے ساتھ یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ہم بحیثیت قوم مسائل کو سلجھانے کے بجائے الجھانے کا کام زیادہ تن دی اور دل لگا کر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود قومی زبان کا مسئلہ بھی آج تک ہم نے وجہ وجہ اُلجھا رکھا ہے۔ یہ کون کہتا ہے کہ انگریزی زبان بین الاقوامی اور بڑی زبان نہیں ہے۔ یہ کون کہتا ہے کہ انگریزی زبان نہیں سیکھنی چاہیے۔ مسئلہ تو صرف اتنا سا ہے کہ قومی زبان کو دفتری زبان اور ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال ہونا چاہیے تاکہ اظہارِ مدعا کا مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے اور ہم دفتر اور بیرونِ دفتری بات ہر سطح پر پہنچانے کی اہلیت کو دوبارہ حاصل کر سکیں۔ حاکم و محکوم کی درجہ بندی ختم ہو جائے۔ ہماری تخلیقی صلاحیتیں، قومی زندگی کی ہر سطح پر پروان چڑھنے لگیں اور ہم قومی یکجہتی کی منزل کی طرف گامزن ہو سکیں۔

لفظ تدوین عربی زبان کا لفظ ہے جو فارسی و اردو میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ تدوین کے معنی فارسی زبان میں "جمع نمودن و تالیف کردن" (منتخب اللغات ملاً عبد الرشید) کے ہیں اور اردو زبان کی "ذو اللغات" میں بھی اس کے معنی "جمع کرنا، مرتب کرنا" دئے گئے ہیں۔ انگریزی زبان میں اس کے لیے "ایڈیٹنگ" کا لفظ استعمال

ہوتا ہے جس کے معنی ہیں کسی دوسرے کے کام کا طاعت کے لیے ایڈیشن تیار کرنا۔ یہ تو اس لفظ کے لغوی معنی تھے لیکن اب تدوین ایک ایسا فن بن گیا ہے جس میں بہت سی اہم باتیں بھی شامل ہو گئی ہیں اور اس کا دائرہ کار وسیع ہو گیا ہے۔ ہم فن تدوین کو تین قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں :

۱۔ نئی کتابیں یا تحریریں جب اشاعت کے لیے کسی ناشر یا مدیر کے پاس آتی ہیں تو وہ انہیں پڑھ کر یا پڑھوا کر ان کے املا کو ٹھیک کرتا ہے۔ ان کے رموز و اوقات کو درست کرتا ہے۔ حسب ضرورت پیرا گراف لکھاتا یا ہڑھاتا ہے۔ زبان و سیاق کو صحیح و بہتر بناتا ہے۔ تکرار یا اعادہ کو دور کرتا ہے اور اسے اس صورت میں لے آتا ہے کہ قاری اسے آسانی کے ساتھ بغیر کسی الجھن کے پڑھ سکے۔ یہ فن تدوین ہے جس پر صاحب علم ایڈیٹر یا اچھا ناشر عمل کرتا ہے اور اس کام کے لیے فن تدوین کے ماہروں کی خدمات حاصل کرتا ہے۔ یورپ و امریکہ کے اشاعتی اداروں سے ایسے ماہرین عام طور پر وابستہ ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں یا رسائل و جرائد میں وہ پچھوڑپن نہیں پایا جاتا جو ہماری مطبوعات میں عام طور پر نظر آتا ہے۔ ایک ہی صفحہ پر ایک ہی لفظ کا املا دو طرح سے لکھا ہوا ملتا ہے۔ مواد کی تکرار صفحات کو سیاہ کر دیتی ہے۔ ترتیب و ربط نہ ہونے کی وجہ سے تحریر سے وہ اثر پیدا نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے۔ اچھی تدوین تصنیف کے حسن کو نکھار دیتی ہے۔

۲۔ اہم اور کلاسیکی مطبوعہ کتابوں کا نیا ایڈیشن تیار کرنا تاکہ ایک طرف اس کتاب کا ایسا ایڈیشن تیار ہو جائے جو نہ صرف مستند ہو بلکہ مختلف ایڈیشنوں میں جو اختلاف پائے جاتے ہیں وہ بھی سامنے آجائیں۔ ساتھ ساتھ اس کے متن کی وضاحت کے لیے حواشی بھی دے دی جائیں تاکہ قاری زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر کے کتاب سے مستفید ہو سکے۔ ان حواشی کے ذیل میں وضاحت، اختلاف، نقطہ نظر کی تشریح، املا، رموز و اوقات، پیرا گراف، فرہنگ وغیرہ سب آجاتے ہیں مثلاً ڈاکٹر وحید قریشی

کی مدد کی کتاب الطاف حسین حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری" اس ذیل میں آتے ہیں: "کلیات سودا" مرتبہ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی یا "کلیات جرأت" مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ ایسی کتاب کو مرتب کرتے وقت صرف پہلے ایڈیشن اور مطبوعہ نسخوں کو ہی سامنے نہیں رکھا جاتا بلکہ مصنف کے زمانے یا قریب تر زمانے یا معتبر قلمی نسخوں کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ یہاں بھی تدوین کا مقصد وہی ہے جس کا ذکر نمبر ایک کے ذیل میں کر چکا ہوں کہ کسی دوسرے مصنف کی کتاب کو اس طور پر مدون کر کے پیش کرنا تاکہ قاری مستند متن کے ساتھ کتاب سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکے۔

۳۔ تدوین کی تیسری قسم میں اُن مخطوطات کی تدوین آتی ہے جو پہلی بار شائع کرنے کے لیے مرتب کیے گئے ہیں۔ یہاں بھی وہی عمل ہوتا ہے جو مطبوعہ کتابوں کی تدوین میں ہوتا ہے لیکن یہ کام زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ اعلیٰ معیار کی تدوین کے لیے سب سے پہلے اُن سائے نسخوں کو دیکھا اور جمع کیا جاتا ہے جو موجود و معلوم ہیں۔ پھر مصنف کے اپنے ہاتھ کے نسخے کو یا ایسے نسخے کو جو مصنف کی نظر سے گزر چکا ہو یا مصنف کے قریبی دور کے نسخے کو بنیادی نسخے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی نقل تیار کی جاتی ہے پھر اس کا مقابلہ دوسرے نسخوں سے کر کے تعلیقات و اختلاف نسخہ تیار کیا جاتا ہے۔ حواشی لکھے جاتے ہیں۔ مصنف اور اس کے دور کا تحقیق کیا جاتا ہے اور وہ ساری ضروری معلومات فراہم کی جاتی ہیں جو اس مخطوطے کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کریں اور قاری اس تصنیف سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکے۔ یہاں مرتب اسلا کو بھی خاص طور پر دیکھنا ہے۔

کتابت کی غلطیوں کی بھی نشان دہی کر کے درست کرتا ہے۔ متن میں جو الفاظ رہ گئے ہیں اگر نسخہ صرف ایک ہی ہے، تو انہیں بھی پورا کرتا ہے۔ اشعار یا حوالوں کے لیے متعدد کتابوں سے رجوع کرتا ہے۔ تحقیق زمانہ کے لیے کتب تواریخ و سیر کو کھنگالتا ہے۔ اگر کسی مخطوطے کا ایک ہی نسخہ موجود و معلوم ہو تو مرتب تعلیقات و اختلاف نسخ کی دیدہ ریزی سے تو ضرور نچ جاتا ہے لیکن اس کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ یہ باتیں میں نے ایک سانس میں ضرور کہہ دی ہیں لیکن ان میں سے ہر پہلو کے ایسے بے پیدہ مسائل ہیں جن پر

تفصیل کے ساتھ بہت کچھ کہا جانا چاہیے۔ اس نوع کے مخطوطات کی تدوین کے سلسلے میں ”دستور الفصاحت“ از حکیم سید احمد علی خان یکتا کی تصنیف کا ذکر کیا جاسکتا ہے جسے امتیاز علی خان عیسیٰ نے مرتب کیا ہے۔ حکیم قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ ”مجموعہ نغز“ مرتبہ حافظ محمود خان شیرانی یا تذکرہ مخزنِ نکات از قائم چاند پوری مرتبہ ڈاکٹر اقتدار حسن کو مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اردو زبان کی پہلی معلوم تصنیف ”مثنوی کدم را دم را دم را دم“ کا ذکر میں یہاں اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ اسے میں نے خود مرتب کیا ہے۔ مخطوطات کی تدوین کے سلسلے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں اور مخطوطات کو مرتب کرنے کے فن کے کیا اصول ہیں یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر ایک الگ مقالے کی ضرورت ہے۔

فن تدوین کے بنیادی اصول تو کم و بیش یکساں ہیں لیکن نظم اور نثر کی کتابوں / مخطوطات پر ان اصولوں کا اطلاق مختلف طریقوں سے ہوتا ہے۔ تدوین اور تحقیق کا بھی جہتی دامن کا ساتھ ہے تدوین بغیر تحقیق کے ممکن نہیں ہے۔ تدوین کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف صاحب علم ہو بلکہ متعلقہ علوم کی مختلف شاخوں پر بھی اچھی نظر رکھتا ہو۔ وہ ادب کی مختلف اصناف اور ان کی تاریخ سے بھی واقف ہو۔ لسانیات و قواعد زبان پر بھی نظر رکھتا ہو۔ اس دور کی تاریخ پر بھی عبور رکھتا ہو جس دور کے مخطوطے پر وہ کام کر رہا ہے اور وہ اس دور کے دوسرے مصنفوں سے بھی پوری طرح آگاہ ہو۔ قدیم و جدید املا، تذکیر و تانیث، متروک و مروج الفاظ سے بھی باخبر ہو۔ وہ یہ بھی جانتا ہو کہ وہ کس نوع کے قارئین کے لیے یہ کام کر رہا ہے اور ان کو زیادہ سے زیادہ مطمئن کرنے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے۔ اسے قدیم دور کے ساتھ ساتھ جدید دور کے تقاضوں کا بھی پورا اندازہ ہونا چاہیے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ پیرا گراف کی کیا اہمیت ہے اور وہ کب اور کہاں قائم کیا جاتا ہے۔ کہاں اغراب لگانے کی ضرورت ہے۔ کہاں اوقاف کا استعمال کیا جانا چاہیے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ حوالے کیسے دیے جاتے ہیں۔ دوسروں کی تصانیف کے اقتباسات کو کیسے وارہن میں لکھنا چاہیے۔ مختصر اقتباس اور طویل اقتباسات

کے حوالوں کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر اقتباس میں بیچ سے کوئی جملہ یا الفاظ چھوڑے ہیں تو نقطے لگا کر اسے کس طور پر واضح کرنا چاہیے۔ ذہنی دیانت داری اور معروضی انداز نظر کام کے معیار کے لیے بنیادی شرط کا درجہ رکھتے ہیں۔ بیان کا ایجاز و اختصار بھی اس لیے ضروری ہے کہ اس سے تحریر صاف و شفاف اور ابلاغ اعلیٰ سطح پر آجاتا ہے۔ یہی صورت حال پی ایچ ڈی اور ایم فل کے مقالات کی ہے جو بغیر یکساں اصول کے مدون کیے جاتے ہیں اور اکثر مواد کا ایسا ڈھیر بن کر رہ جاتے ہیں جس پر تدوین کرنے والا کھڑا ہے اور تدوین کے اس بنیادی اصول کو رد کر رہا ہے جس کا بنیادی مقصد سوڈ کو قاری و طباعت کے لیے تیار کرنا ہے۔ ان مقالات کے لیے بھی اصول و ضوابط مرتب کرنے کی ضرورت ہے تاکہ سب یکساں طور پر ان کی افادیت کے پیش نظر ان پر عمل کریں۔ اس طرز بھی اہل علم اور اساتذہ کو فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

مشاعرے کی روایت

مشاعرے کی صدارت خاصا مشکل کام ہے۔ مشکل اس لیے کہ صدر کو ایک مخصوص جگہ پر بندھ کر بیٹھنا پڑتا ہے اور اس وقت تک بیٹھنا پڑتا ہے جب تک مشاعرہ اختتام کو نہ پہنچ جائے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ مستقبل میں جلسہ صدر گرامی قدر کو مسترد کرے یا اسے بھول جائے یہ کہ نہ صرف خاطر تواضع سے بلکہ مہمان نوازی کی رسم دنیا سے بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ یہ تو صدارت کا ایک پہلو تھا اب دوسرا پہلو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ صدر گرامی قدر کو بے کم و کاست، ہر شعر و قبح سے مستفا پڑتا ہے اور جب شاعر عزیز اپنے جگر پارے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ترنم یا بے ترنم پیش کرتا ہے تو لحاظ کی آنکھ جھلپ بھاری کے مصداق دل کھول کر داد بھی دینی پڑتی ہے۔

بہر حال یہ تو جناب صدر کا مسئلہ ہے جہاں تک مشاعرے کا تعلق ہے، مشاعرہ ایک ایسا تہذیبی ادارہ ہے جو صدیوں سے قائم ہے اور آج بھی، جب کہ رنگ و نیا بدل گیا ہے، یہ اُسی طرح قائم و دائم ہے۔ مشاعرے ہماری تہذیبی، ذہنی اور سماجی زندگی کا اہم حصہ ہیں۔ یہ روایت اتنی قدیم ہے کہ اگر میں اس کی تاریخ اختصار کے ساتھ ہی بیان کرنا شروع کروں تو خود اردو ادب کی تاریخ کے چھ سو سال سامنے آجائیں گے جس میں حسن شوقی، قلی قطب شاہ اور ولی دکنی سے لے کر مرزا علی خاں اردو، آبرو ناجی، شاد حاتم، خواجہ میر درد، میر تقی میر اور مرزا رفیع سودا تک اور مصحفی، انشاء اور حرثات، ناسخ و آتش و دبیر سے لے کر غالب و ذوق، مولانا حالی اور محمد حسین آزاد تک سب شامل ہوں گے اور پھر ملت یہیں تو ختم نہیں ہو جائے گی۔ اقبال سے لے کر آج تک اس روایت

کی داستان سنائی ہوگی۔ ایسی داستان جو دل چسپ بھی ہو اور دل آویز بھی جس میں روایت کے سارے گوشے سامنے آجائیں یہ موضوع اتنا وسیع ہے اور اپنے اندر ایسے دل چسپ پہلو رکھتا ہے کہ جتنا اس پر سوچتا ہوں اتنا ہی موزع کا ذہن زمانہ حال سے ماضی کی طرف سفر کرنے لگتا ہے جہاں میٹھے تیل کے چراغ کی ٹو سے راستہ صاف اور روشن نظر آ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میں اسے بیان کروں، لیکن پھر سوچتا ہوں کہ یہ بات بذاتِ خود مُشاعرے کی روایت کے سنائی ہوگی کہ مُشاعرے میں کسی موضوع پر لیکچر دیا جائے، اس لیے میں مُشاعرے کے تعلق سے صرف اتنا کہوں گا کہ اچھے اشعار ہمارے جذبات کی اس طور پر ترجمانی کرتے ہیں کہ شعر شن کر زندگی کا بوجھ ہلکا اور ذہن ایسا تازہ دم ہو جاتا ہے جیسے ہم نے ابھی بھی غسل کیا ہو۔ اچھا شعر ہمارے ذہن کو نہلا دھلا کر پھول کی طرح تازہ کر دیتا ہے یہ کیفیت ہر دوسری کیفیت سے الگ ہے۔ اگر آپ کو یہ دیکھنا ہو کہ اس وقت مُشاعرے کے باطن میں کیا ہو رہا ہے تو آپ کسی مُشاعرے میں اشعار شن کر دیکھ لیجیے اور اگر یہ دیکھنا ہو کہ اس وقت اہل مُشاعرہ کس کیفیت سے دوچار ہیں، ہوائیں کس رخ پر چل رہی ہیں تو کسی مُشاعرے میں یہ دیکھ لیجیے کہ سننے والے کس قسم کے اشعار پر داد دے رہے ہیں۔ مُشاعرہ مُریخ بادِ ثما کا درجہ رکھتا ہے جس سے مُشاعرے کے باطن کی ہوائوں کے رخ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ پھر مُشاعرے ایک ایسی ذہنی تفریح کا درجہ رکھتے ہیں جس میں ذہن کو بچے سے طور پر استعمال کرنا پڑتا ہے ورنہ عام طور پر جدید تفریحات میں دماغ کا استعمال کم سے کم تر ہو گیا ہے، مثلاً آپ سب ہر روز ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں، مگر کبھی آپ نے غور کیا کہ اس میں دماغ کو استعمال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ بس آنکھوں سے دیکھتے رہیں، کالوں سے سنتے رہیں، باقی کام خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ مُشاعرے میں آپ کو نہ صرف دماغ سے بلکہ اپنے سارے وجود کے ساتھ شریک ہونا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر آپ مُشاعر کے غلط انداز نہیں ہو سکتے اور اسی لیے مُشاعرے میں اچھے اشعار شن کر آپ کی ذہنی حرکت بہتر ہو جاتی ہے۔ پھر مُشاعروں میں اکثر ایسے دل چسپ واقعات بھی پیش آتے ہیں، جو ساری عمر کے لیے آپ کے حافظے میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ مجھ یاد آیا اور آپ بھی اس

واقعے سے نطف اندوز ہوں گے کہ لڑکیوں کے کسی کالج میں ایک مشاعرہ ہوا اور ایک اُستادِ الاساتذہ قسم کے شاعر نے بڑے دم خم کے ساتھ اپنی غزل کا یہ مطلع پڑھا۔

ہمارے دل کی حسرت تجھ سے گواہے ناز میں نکلی

مگر جیسی نکلتی چاہیے ویسی نہیں نکلی!

اُستاد کو اس شعر پر خاصی واو ملی۔ داد کا سلسلہ ختم ہوا تو ایک طالبہ کھڑی ہوئی اور اُستادِ الاساتذہ سے نہایت شیریں آواز اور نیاز مندانہ لہجے میں مخاطب ہو کر کہا "محترم و معظم! مطلع خوب ہے بلکہ بہت خوب ہے، لیکن یہ تو بتائیے کہ اس میں بے چاری ناز میں کا کیا تصور تھا؟" یہ جملہ سُنا تھا کہ سارا پنڈال تہقہبوں سے گونج اٹھا۔ وہ تو غصیت جاننے کے آزادی نسوان کی تحریک کا زمانہ نہیں تھا اور نہ اگر یہ شعر کج پڑھا جاتا اور خواتین کی سمجھ میں کہیں اس طالبہ کی طرح یہ آجائے کہ اس ناز میں پر شاعر نے کتنا ظلم ڈھایا ہے تو وہ اس خیالی ناز میں کی حمایت میں جلوس نکالتیں اور مردوں کے غلات ایسے نعرے بلند کرتیں کہ آسمان کا اپنی جگہ شہرِ نائم شکل ہو جاتا۔ بہر حال اچھا زمانہ تھا، خیریت سے گزر گیا۔

مجھے یاد آیا کہ ۱۹۴۵ء میں میرٹھ میں ایک انتہائی عظیم الشان مشاعرہ ہوا۔ میں اُس وقت انٹر کا طالب علم تھا۔ اتنا بڑا مشاعرہ میں نے اپنی زندگی میں آج تک نہیں دیکھا۔ بزرِ عظیم کے کم و بیش سارے نامور شاعر شریک تھے سوائے حفیظ جالندھری کے کہ وہ ہندوستانی سپاہیوں میں مروا گئی پیدا کر کے روزی کمار ہے تھے اور اتنا پرست یگانہ چنگیز نے یہ کہہ کر کہنے سے انکار کر دیا تھا کہ میں چنگیز سے بڑا شاعر ہوں مجھے چنگیز سے زیادہ سُعاد مند ملنا چاہیے۔ مشاعرہ دو دن چلا۔ اس میں جوش بھی شریک تھے اور جگر بھی۔ جب حضرت جوش کی ہادی آئی تو رات کی سیاہی صبح کی سفیدی سے ملنے پر مائل ہو رہی تھی۔ جوش نے رُباعیاں سنائی شروع کیں۔ وہ ایک رُباعی سناتے، پھر ایک پان کھاتے، اگلے دن میں پیک کرتے اور پھر ایک رُباعی سناتے۔ اس طرح انھوں نے دس بارہ رُباعیاں سنائیں اور پھر کہا کہ میں اب ختم۔ لوگوں نے اصرار کیا، انھوں نے پھر پان کھایا، اگلے دن میں پیک کی اور پھر ایک رُباعی سنادی۔ دو چار رُباعیاں اسی طرح سن کر انھوں نے کہا "بس اب بہت

ہو چکا : کچھ دیر ہنڈال میں خاموشی رہی۔ اسی شمار میں پیچھے کی صفوں سے ایک پہلوان کٹھا گھوسی، کندھے پر بنیان ڈالے، کھڑا ہوا اور با آواز بلند کہا (حضرت جوش کا جُستہ ذہن میں رکھیے) "پہلوان! ایک اور مہوگی، تھوک کے : اس جُستے کا سُنا سکتا کر پشیل قہقہوں سے گونج اٹھا اور انہی قہقہوں میں مشاعرہ ختم ہو گیا۔

جوش کی بات پہلی ہے اور وہ اب مرحوم بھی ہو گئے ہیں تو ایک بات اور سن لیجیے۔ جوش صاحب نے مجھے، مولانا اعجاز الحق قدوسی اور پیر حاتم الدین راشدی کو گھر پر بلوایا۔ ہم پہنچے تو وہ منتظر تھے، کہیں باہر سے آئے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم میں سے کسی نے کہا کہ حضرت! اپنی وہ تازہ نظم "بولِ یک تارے جھن جھن جھن" سنا دیجئے۔ جوش صاحب نے آواز دی : "ذرا بیگ بھیج دو" اندر سے جواب میں آواز آئی : "ابھی تو جمع کر رہے ہو۔ اب پھر شروع کر دیا" یہ اُن کی بگم تھیں۔

اب رات خاصی بھیگ چلی ہے اور شاعرانِ کرام اور آپ سب حضرات شاعرانہ کیفیت میں اس درجہ سرشار ہیں کہ اب میرا مزید کچھ کہنا مصلحتِ وقت کے خلاف ہے۔ آپ کو متوجہ کرنے اور شاعرانہ کیفیت سے دوچار کرنے کا کام میں نے خطبہ صدارت سے اُسی طرح کر دیا ہے جس طرح ٹیکسپیئر اپنے ڈرامے کے پہلے ایکٹ کے پہلے سین میں کرتا تھا۔ اب میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ اس محفلِ شعرو سخن میں شریک ہونے کے لیے کمر بستہ ہو جائیں جس کے لیے آپ یہاں تشریف لائے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ سب شعر کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ شاعرے کے آداب اور اس کی روایت سے واقف ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ سب نہ صرف جہانِ نوازی ہیں بلکہ شاعری سے محنت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ جب اسی محفل ہو تو خطبہ صدارت کو یہیں ختم ہو جانا چاہیے اور دیکھیے جیسے ہی یہ بات میں نے آپ سے کہی غالب کا شعر ذہن کے درجوں سے جھانکنے لگا۔ آپ ہی سن لیجیے!

جو یہ کہے کہ رنجہ کیوں کہ ہر شک فانی گفٹہ غالب یک بار چڑھ کے سسے سُنا کر پلا

بچوں کا ادب

بچوں کے ادب کے سلسلے میں بات کرنے سے پہلے ایک بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ والدین عام طور پر اپنے بچوں کی پرورش اپنی خاندانی روایت، اپنے مزاج، اپنے خیالات و عقائد کے مطابق کرتے ہیں۔ مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ اسی لیے مسلمان ہوتا ہے اور ہندو کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ اسی لیے ہندو ہوتا ہے۔ آخر یہ کیوں نہیں ہوتا کہ ہندو کے گھر پیدا ہونے والا بچہ مسلمان بن جائے؟ جیسے یہ ایک حقیقت ہے اسی طرح ہمارے ہاں بچوں کے ادب کا مسئلہ بھی اسی بات کا ایک پہلو ہے۔ اس صورت حال میں یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے بچے کو ایسی کتابیں پڑھنے کے لیے مہیا کریں جن سے ہمارے خیالات و عقائد کے مطابق اس کے ذہن کی نشو و نما ہو سکے۔ کئی عمر میں جب ہم اپنے بچوں کو ایسی کتابیں مہیا کرتے ہیں جو بحیثیت والدین ہمارے خیالات و عقائد کی نفی کرتی ہیں تو ہم دراصل اس عمل سے اسی مشائخ کو کاٹ رہے ہوتے ہیں جس پر ہم کھڑے ہیں۔ سارے معاشرے پر نظر ڈالیں تو یہ بات سامنے آئے گی کہ ہم اپنے بچوں کو ایسی کتابیں مہیا کرتے ہیں جن سے ہم اسے وہ نہیں بنانا چاہتے جو دراصل اسے بنانا چاہتے ہیں۔ وہ کتابیں عمدہ کاغذ پر رنگ برنگی تصویروں کے ساتھ اچھی جلی عبارت میں لکھی ہوتی ہر عمر کے بچوں کے لیے بازار میں عام طور پر دستیاب ہوتی ہیں۔ اگرچہ کتاب مذہبی پڑھے تو وہ صرف تصویروں سے لطف اندوز ہو کر کتاب سے مانوس ہو جاتا ہے۔ یہ کتابیں ہم بھی قیمت دے کر خریدتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہمارے مصنفوں کی کتابیں نہایت خراب کاغذ پر، بغیر چاہے رنگ تصویروں کے ساتھ جب بازار میں نظر آتی ہیں تو انھیں والدین نہیں خریدتے اور یہ کتابیں بیرونی کتابوں

کے مقابلے میں اسی لیے کم فروخت ہوئی ہیں۔ ہمارے یہاں بچوں کے باقاعدہ مصنف خال خال نظر آتے ہیں جب کہ بیرونی زبانوں میں بچوں کے مصنفین الگ ہوتے ہیں جو بچوں کی نفسیات پر اپنی قوم کی تاریخ و مزاج پر اور عہد و جدید کے تقاضوں سے اس طرح واقف ہوتے ہیں کہ ان کی کتابیں بچوں میں مقبول ہوتی ہیں۔ انھیں اپنی زبان پر پورا عبور حاصل ہوتا ہے۔ وہ عبارت میں کسی قسم کی غلطی نہیں کرتے اور ہر عمر کے بچوں کے ذخیرہ الفاظ کو سامنے رکھ کر اسی انداز سے کتابیں لکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں مصنفین عام طور پر باہر کی کتابوں کا چربہ امارتے ہیں اور چربہ بھی اس انداز سے کہ اس میں نہ لطف بیان ہوتا ہے نہ لطف قصہ۔ یہ میں عام طور پر بازار میں ملنے والی کتابوں کی بات کر رہا ہوں چند مخصوص کتابوں کی نہیں۔ ان کتابوں کا جو عام طور پر لکھی جا رہی ہیں ہماری تہذیب سے ہماری تاریخ سے ہمارے دور سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا جیسا کہ ایک زمانے میں مشہور تھا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو ہو جانا تھا اسی طرح ہمارے یہاں ناکام ادیب بچوں کا ادیب بن جاتا ہے۔ میں نے اسی نقطہ نظر سے بچوں کی متعدد کتابیں پڑھی ہیں اور مجھے اکثر محسوس ہوا ہے کہ عام طور پر تیسرے درجے کے لکھنے والے ایسی کتابیں تصنیف کر رہے ہیں جن سے بچوں کی پیدائشی ذہانت مجروح ہوتی ہے اور بچوں کی فطری صلاحیتیں نشوونما نہیں پاتیں اور بڑے سوال تو کیا چھوٹے سوال بھی ان کے ذہن میں پیدا نہیں ہو پاتے۔

بچوں کے ادب کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ بچوں میں تخیل، تجسس اور تخیل کو ابھارے۔ یہ وہ بنیادی صفات ہیں جن پر ہمارے لکھنے والوں کو توجہ دینی چاہیے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ وہ ایسی عبارت میں اپنی بات بیان کریں جو کم سے کم لفظوں میں کہنے کی طرح صاف و شفاف ہو جس میں زبان درست ہو، بیان چست اور دل چسپ ہو۔ ایسی کہانیاں لکھی جائیں جن کا اپنی تہذیب اپنے لوگ ورثے اپنی روایت اپنی تاریخ سے گہرا تعلق ہو۔ ایسی کہانیاں جو بچوں کے تخیل کو نئی دنیاؤں کی طرف لے جائیں۔ ایسی دنیاں جن کو دریافت کرنے کی طرف ان میں مہم بخشا کا جذبہ پیدا ہو۔ غور

کیجیے تو کج کی نسل ہماری اپنی روایت سے بڑی حد تک کٹ چکی ہے۔ ہمارے قدیم ادب سے وہ ناواقف ہے۔ باہر کی زبانوں کے ادب اپنے قدیم ادب کو طرح طرح سے بچوں کے لیے پیش کرتے ہیں جن سے ان میں اپنے ادب اپنی تہذیب سے گہری دل چسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً آج بھی اگر بچوں کے مصنفین اپنے قدیم ادب کو کنگا لیں تو انھیں بہت سی کتابوں کے لیے مواد میسر کرے گا۔ ایسا مواد جس سے بچے گہری دلچسپی لیں گے۔ مثلاً انوار سہیلی، اخلاق محسنی، سیاست نامہ، الف بیلی اور ان سب سے زیادہ مخلصم بچوں میں ایسا مواد موجود ہے جس کے استعمال سے بچوں کے تخلیق خیموں اور تخیل کوئی دست دی جا سکتی ہیں جس سے ہم بچوں میں اپنے ادب و تہذیب سے گہری دلچسپی پیدا کر سکتے ہیں۔ کتنے مصنفین ہیں جنہوں نے بچوں کے لیے سفر نامے لکھے ہیں؟ کتنے مصنفین ہیں جنہوں نے جانوروں کے مشاہدات پر قلم اٹھایا ہے یا کائنات کی پراسرار وسعت کو موضوع بنایا ہے یا مہم جوئی کو مشیتِ خدا میں موضوع بنا کر پیش کیا ہے؟ کتنے مصنفین ہیں جنہوں نے بچوں کے لیے علامتی کردار تخلیق کیے ہیں؟

ایسی بے شمار باتیں ہیں جو اس سلسلے میں کہی جا سکتی ہیں۔ اس وقت میں اس موضوع پر تفصیل کے کچھ نہیں کہنا چاہتا البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ ہمیں چاہیے کہ ہمارے بہترین لکھنے والے محنت کے ساتھ بچوں کے لیے لکھیں۔ وہ بچے جو ہمارے ہیں اور جو ہمارا مستقبل ہیں اور جو اس ملک عزیز کو دو بنائیں گے جو ہم انھیں بنا رہے ہیں۔ اس طرح ناشرین کو چاہیے کہ وہ ہر عمر کے بچوں کے لیے کتابیں لکھوائیں اور انھیں اس طوع سے شائع کریں کہ بچے ان کی طرف متوجہ ہوں۔ انھیں شوق سے پڑھیں۔ بچوں کو اتنی بڑی تعداد میں کتابیں پڑھنے کے لیے چاہئیں کہ اگر ہم سب مل کر لکھنے کا پروگرام بنائیں تو بھی ان کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے۔ بچہ بہت تیزی سے کتابیں پڑھتا ہے۔ ایک کتاب عام طور پر دو چار دن میں پڑھ ڈالتا ہے اور پھر نئی کتاب کا طلب گار ہوتا ہے۔ اس کی ضرورت پوری کرنا ہمارا قومی و اخلاقی فرض ہے۔

اس وقت جو عام طور پر یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ لوگ کتابیں نہیں پڑھتے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بچوں سے اپنے بچوں کو کتابیں پڑھنے کی عادت نہیں ڈالتے۔ انھیں غروت کے مطابق کتابیں چھپانا نہیں کرتے۔ ان میں کتابیں پڑھنے کا ذوق پیدا نہیں کرتے اور جب عمر مکمل جاتی ہے تو ہم بچوں کی عادات مطابق عربی مذاکروں کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس لیے اس وقت تکھے والوں سے میری یہ درخواست ہے کہ وہ محنت سے، توجہ سے بچوں کے لیے کتابیں لکھیں۔ بچوں کے لیے کتابیں لکھنا بڑوں کے لیے کتابیں لکھنے سے کم مشکل نہیں ہے اور ساتھ ہی ناشرین سے میری یہ درخواست ہے کہ وہ بچوں کی کتابیں بہت محنت و توجہ سے چھاپیں۔ اس میں منافع بھی ہے اور کار خیر کا عمل بھی۔ یہ ایک ایسا کام ہے جسے بغیر کسی تاخیر کے اب میں فوراً شروع کرنا چاہیے۔ ایسی کتابیں ہرگز شائع نہ کریں جس سے معاشرے میں چوراپکوں، ڈاکروں، ظالموں، جاہلوں اور نفسیاتی مریضوں کا اضافہ ہو، جن سے ہماری اخلاقی ترقی کا براہوں اور جن سے ہمارے بچے خراب ہوں۔

جدید افسانے کے بالے میں

اس وقت میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اردو افسانے پر پیغمبری وقت آچکا ہے۔ وہ افسانہ نگار جنہوں نے تیسری، چوتھی یا پانچویں دہائی میں لکھنا شروع کیا انتخاب اپنے عروج پر پہنچ کر یا تو نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں یا پھر اب خود کو ڈھیر آ رہے ہیں۔ نئے لکھنے والے جو ادب کی دنیا میں چھٹی یا ساتویں دہائی میں داخل ہوئے، انھیں علامتی افسانوں کا بیڑا اٹھانے گیا۔ ان کے افسانوں میں علامت نے روشنی کی اور نہ تحریر کے حسن نے اثر پیدا کیا۔ یہ ایک تجربہ تھا جو ہوا اور ادب میں تجربہ ہونا چاہیے اور ہوتے رہنا چاہیے۔ لیکن یہ تجربہ، تجربہ کی منزل سے آگے بڑھ کر تحقیق فن کی سرحدوں تک نہ پہنچ سکا۔ چند افسانوں کے علاوہ، عام طور پر علامتی افسانے حقیقی سطح پر کم زور اظہار اور علامت نگاری کی ناکامی کی داستان سناتے ہیں۔ بعض افسانہ نگاروں نے افسانے کو نثری نظم بنانے کی کوشش کی لیکن افسانہ نہ تو شاعری ہے اور نہ نظم ہے۔ اس لیے افسانہ اپنے منصب سے ہٹ گیا۔ ہم گزشتہ دس سال میں کسی علامتی افسانہ نگار کی کسی ایک کہانی کا نام نہیں لے سکتے جسے ہم ادب کا شاہکار کہہ سکیں اور تاریخ ادب اسے اپنے دامن میں سمیٹ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کہا ہے کہ اردو افسانے پر پیغمبری وقت آچکا ہے۔ ابلاغ ہر ادبی تحریر کی فنی ضرورت ہے۔ ایک ابلاغ وہ ہے جیسا ہمیں منٹو کی کہانیوں میں ملتا ہے یا عصمت چغتائی، واجد مراد، بی بی کرشن چندر اور غلام عباس کے ہاں ملتا ہے۔ کہانیوں کے ذریعے زندگی آپ کے خون میں اُڑ کر گردش کرتے لگتی ہے۔ ایک ابلاغ وہ ہے جو علامتی ہونے کے باوجود اپنے قاری کو گرفت میں لے لیتا ہے جیسا انتظام حسین کے افسانے ”شہر افسوں میں یا“ آخری آدمی میں جو

غور کرنے سے قاری تک پہنچ جاتا ہے لیکن یہاں بھی نظر کا حسن اور اظہار کی تخلیقی قوت بنیادی طور پر اپنا کام کرتی ہے۔ تیسری قسم ابلاغ کی وہ ہے کہ افسانہ نگار افسانے کو علامتی بنانے کے لیے اس میں ابہام کو اس طور پر شعوری طور سے شامل کرتا ہے کہ افسانہ پڑھنے والے سے اس کے اچھے ادبی ذوق کے باوجود، ابلاغ نہیں کرتا۔ کافکا کے افسانوں کو غور سے پڑھنے سے ایک اچھے قاری کو ابلاغ کی دولت ہاتھ آجاتی ہے اور اس کے افسانوں کی نثر تخلیق کی سطح پر گہرا اثر اور بامعنی رہتی ہے۔ ایک ایک لفظ نیا نکلا۔ ایک ایک جملہ اپنی جگہ جما ہوا۔ یہ سلیقہ ہمیں جدید اردو افسانہ نگاروں میں کم کم نظر آتا ہے بعض افسانہ نگاروں کے افسانوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو نثر کی روایت اور اس کے مزاج سے کم دیش بے خبر ہیں۔ انہیں اظہار پر اس لیے قدرت حاصل نہیں ہے کہ انہیں اپنی بات اس زبان میں جس میں وہ لکھ رہے ہیں، کہنے کی نہ مشق ہے اور نہ وہ مطالعہ جو اچھی تحریر کے لیے ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے نئے افسانہ نگاروں کو اچھی نثر لکھنے، اس کی مشق کرنے اور اردو ادب کی کلاسیکی اور جدید تحریروں کو تسلسل کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر اپنا تخلیق نہیں ہو سکتا۔ لیکن گزشتہ چند سال سے ہمارے بعض لکھنے والوں میں اس کا احساس پیدا ہوا ہے اور اب افسانہ علامت سے ہٹ کر زندگی کی طرف دوبارہ لوٹ رہا ہے۔ اب علامت ہمارے جدید افسانے کا ماضی ہے اور زندگی سے تعلق تو افسانے کا نیا دھماکا ہے۔

آخر میں نئے افسانہ نگاروں سے ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ کراچی شہر پاکستان کا سب سے بڑا اور ایک جدید صنعتی شہر ہے۔ جدید صنعتی شہر کے سارے مسائل مصائب اس شہر کے خون میں گردش کر رہے ہیں۔ اس کے چتے چتے پر کہا میاں بکھری ہوئی میاں وہ کہانیاں جن میں انسانی مسائل اپنے گہرے دھکوں کے ساتھ موجود ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیں آواز ہیں۔ وہ نفرتیں جو خون آلود ہیں۔ وہ تعصبات جو بظاہر ناقابل عبور ہیں۔ وہ مٹکیں جن پر دھوپ ہی دھوپ ہے اور وہ گلیاں جن میں کبھی سورج کی کرن نہیں پہنچی۔ وہ شفا خانے جہاں موت کا کرب کر دہیں لے رہا ہے۔ وہ معاشرہ جو رشتوں پر پل رہا ہے۔ وہ عوام جو بے آواز ہیں، وہ جاگیر دار اور سرمایہ دار جو عوام کو کھارہے ہیں۔ سیاست کا

سوانح رچانے والے وہ بے اخلاق لوگ جو نفرتوں کے گرم خون پر پل رہے ہیں اور نفرتوں کے سانپوں کا زہریلا نسل کے خون میں شامل کر رہے ہیں۔ وہ مفاد پرست جو عوام کو بے شعور اور نابینا رکھنے میں مصروف ہیں۔ وہ صاحبان اختیار جو تاریخ کو نظر انداز کر کے صرف اپنے لیے زندہ ہیں۔ وہ سفاک مافیہ جواسانی قدروں کا خونی ہے۔ یہ شہر جدید صنعتی زندگی کی حقیقی کہانیوں کا شہر ہے۔ آپ اس شہر کو دیکھیے۔ یہ آپ کی کہانیوں کا مستطریح ہے۔ اس عمل سے آپ نیا افسانہ پیدا کریں گے۔

(۲۸ اپریل ۱۹۸۷ء)

عزیز احمد — ایک جائزہ

۱۹۷۸ء میں پر بہت بھاری گزاری بہت سے نام وراثت دیکھتے ہی دیکھتے ہم سے جدا ہو گئے۔ ابتدا پر و فیروز محمد حسن عسکری کی وفات سے ہوئی تھی۔ یہ جنوری کا مہینہ تھا، لاڈ اس کا ڈراپ سین پروفیسر عزیز احمد کی وفات پر ہوا۔ یہ دسمبر ۱۹۷۸ء کا مہینہ تھا، افسوس ناک بات یہ ہے کہ عزیز احمد کی وفات کی خبر کراچی کے صوف ایک اخبار میں بھیجی اور وہ بھی اتنی مختصر تھی کہ یقین نہیں آتا کہ یہ اُس شخص کی وفات کی خبر ہو سکتی ہے جس نے تقریباً چالیس سال نہایت سنجیدگی کے ساتھ ادب و علم کی خدمت میں گزارے اور اپنی سدا بہار تخلیقات و تصنیفات سے زبان و ادب کو مالا مال کیا اور اردو ادب کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادبیات کی سطح پر لانے کے لیے وہ کام کیا جو تاریخ میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ عزیز احمد اردو کے اُن چند ادیبوں میں سے ایک تھے جو بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے اور جن کی تحریریں دنیا بھر کے ملی حلقوں میں وقت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔

خواتین حضرات! یہ تعلقات عامہ اور اشتہار بازی کا دور ہے۔ اشتہار کے سہارے جس طرح صنعت کار اپنی گھنیا مصنوعات بھی بازار میں فروخت کر سکتا ہے اور خریدنے والا اشتہار کے جادو کے اثر سے اُسے اعلیٰ اور مثالی چیز سمجھتا ہے اسی طرح ادب و فن میں بھی اب اشتہار بازی نے رچے اور بڑے اعلیٰ و ادنیٰ حقیقی و غیر حقیقی، اصل اور نقل کا امتیاز مٹا دیا ہے۔ میں نے کئی لکھنے والوں کو کہتے سنا ہے کہ صاحب مرنے کے بعد ہماری تحریروں کا کیا ہو گا۔ اس سے ہمیں کیا واسطہ۔ ہمیں تو اس سے مطلب ہے کہ ہماری زندگی میں ہمارے لکھے ہوئے الفاظ کیسے کہتے ہیں؟ یہ وہ دوکان دارانہ ذہنیت ہے جس نے تخلیق اور علم و ادب کو اس کے

منصب سے ہٹا دیا ہے۔ اسی لیے آج ہمارا ادب اخباروں کے صفحات پر تخلیق ہو رہا ہے۔ اس میں بھی کوئی بڑائی نہیں تھی اگر لکھنے والا نامی دوکان دار بن کر صرف پکری بڑھانے کی ذہنیت کا شکار نہ ہوتا۔ اسی لیے آج کی کہرا کو دفعتاً میں ادیب، دانشور، عالم اور بظاہر ادیب، بظاہر دانشور اور بظاہر عالم میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔ اینڈرپاؤنڈ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ”سینئر سنجیدہ فن کار کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ سنجیدہ و غیر سنجیدہ فن کار میں تیز نہ ہونے دے؟“ اسی ذہنی منظر نے سنجیدہ و حقیقی فن کار عزیز احمد کی عظمت کو ہماری نظروں سے اوجھل رکھا اور جیسا کہ فتح محمد ملک صاحب نے بتایا ہے کہ ایک سابق پروفیسر اور حال پیر و کریٹ نے نظم کرسی میں لکھ کر یہ کہہ دیا کہ وہ ”عاجل آدمی“ تھے۔ فتح محمد ملک نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ عزیز احمد کی معرکتہ الآراء تصنیف ”اقبال“ ایک نئی تشکیل کو ایم۔ اے کے نصاب سے خارج کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ ذہنیت ہے جس نے ہمارے معاشرے کی تہذیبی، فکری اور تخلیقی فضا کو ذہر آلود کر رکھا ہے۔ سنجیدہ فن کار قدر خواہی سے اسی طرح بے نیاز ہوتا ہے جس طرح عزیز احمد تھے۔ عزیز احمد نے کبھی نام و نمود یا اشتہار بازی کے ذریعے شہرت بڑانے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے ایک سنجیدہ فن کار کی طرح ہمیشہ کلام کو اہمیت دی اور جب تک زندہ رہے کام اور صرف کام کرتے رہے۔ میرے اور عزیز احمد کے تعلقات کی تاریخ ہمیں تیس سال پہلے پہنچی ہوئی ہے۔ اس تمام عرصے میں میں نے انھیں اپنے بارے میں کبھی دوں کی لینے نہیں دیکھا۔ اگر کبھی ان کے فن یا ذات کے بارے میں کوئی گفتگو میں کرتا تو ان کے چہرے پر نئی نئی دلہن کی طرح حیا کی سرخی دوڑ جاتی۔ ان میں ایک سچے فن کار اور بڑے ادیب کا ایسا انکسار تھا جو اس دور میں خال خال نظر آتا ہے۔

عزیز احمد ۱۱ نومبر ۱۹۱۳ء کو مادہ بنگی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں جامعہ عثمانیہ سے اور ۱۹۳۸ء میں لندن یونیورسٹی سے بی۔ اے ۲ فرز کیا اور اسی سال جامعہ عثمانیہ میں انگریزی کے پیکر مقرر ہوئے جہاں ترقی کر کے کچھ عرصے کے بعد ریڈر اور پھر پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں عزیز احمد پاکستان آئے اور حکومت پاکستان کے فلم و ٹیلیویشن کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اسی جگہ سے وہ ۱۹۵۷ء تک وابستہ رہے۔ ۱۹۵۷ء میں وہ لندن

یونیورسٹی کے اور نیشنل اور انٹین اسٹڈیز کے اسکول میں اردو اور ہندی اسلام کے شعبے میں
 ٹیکہ مقرر ہوئے جہاں وہ ۱۹۶۲ء تک رہے۔ ۱۹۶۲ء میں وہ ایسوسی ایٹ پروفیسر ہو کر
 ٹورانٹو یونیورسٹی (کناڈا) کے شعبہ اسلامیات سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء میں انھیں پروفیسر
 بنادیا گیا جس پر وہ تاہم فائزرہے۔ وہاں ان کے کام کی اہمیت و وقعت کے پیش نظر
 انھیں رائل سوسائٹی آف کنڈا کا فیلو مقرر کیا گیا۔ ۱۹۷۲ء میں یونیورسٹی آف لندن نے ان کی خدمات
 کے اعتراف میں ڈی ملٹ کی ڈگری سے نوازا۔ عزیز احمد پہلے پاکستانی تھے جنھیں یہ اعزاز ملے۔
 یہ اعزاز عزیز احمد کے لیے ہی باعث فخر نہیں تھا بلکہ خود پاکستان کے لیے بھی باعث افتخار تھا
 لیکن کتنے لوگوں کو یہ بات معلوم ہے اور کتنے لوگ ہیں جو علم و ادب کے اس مرتبے پر پہنچے ہیں اور
 اپنی تصانیف سے پائے ادب و ذہن پر گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔

عزیز احمد کئی زبانیں جانتے تھے۔ فرانسیسی اور جرمنی کے علاوہ انگریزی ان کے لیے علمی اظہار
 کی زبان تھی، فارسی ان کی تہذیبی زبان تھی اور اردو ان کی تخلیقی زبان تھی۔ ان سب زبانوں پر وہ
 بہت اچھی قدرت رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۵۹ء میں وہ لندن سے اوجوں کی ایک بین الاقوامی
 کانفرنس میں شرکت کے لیے فرینکلنٹ آئے تھے اور میں پاکستان سے گیا تھا۔ اس کانفرنس میں
 شرکت کے لیے ہندوستان سے حکومت ہند کے نائب صدر اور مشہور فلسفی رادھا کرشنن آئے
 تھے۔ شام کو ایک دعوت میں، جو صدر جرمنی کی طرف سے ملے مندوبین کو دی گئی تھی، میں
 رادھا کرشنن ایک نہایت حسین نوجوان ایرانی لڑکی سے بہت دیر سے اور بہت گھل مل کر
 باتیں کرتے رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی مسرت دیدنی تھی۔ اس شمع
 محفل کو اور بہت سے پروفانوں نے بھی گہر رکھا تھا۔ وہ فارسی اور فرانسیسی جانتی تھی۔ عزیز احمد
 صاحب نے فارسی میں اس کا نام پوچھا۔ اس نے منیزہ بتایا۔ میں نے نام سن کر فردوسی کا
 مصرع پڑھا۔ ۵ :

منیزہ منم دختر افراسیاب

وہ ہنسے گی۔ اس کے فوراً بعد عزیز احمد پہلے فارسی میں اور پھر فرانسیسی میں اس سے بڑی
 روانی سے باتیں کرتے رہے اور وہ باتیں اتنی دل چسپ تھیں کہ کچھ ہی دیر بعد عزیز احمد شمع

بن گئے اور وہ پروانہ۔ اُس دن عزیز احمد نے بے شمار فارسی اشعار سنائے۔ خیر یہ تو جملہ معترف تھا۔ مجھے تو صرف یہ بتانا ہے کہ مرحوم کو جتنی زبانیں آتی تھیں ان پر انھیں مکمل قدرت تھی۔

عزیز احمد کی شخصیت اتنی گونا گوں ہے کہ اس کے تعارف کے لیے ایک طویل مقالہ کی ہی نہیں بلکہ پوری کتاب کی ضرورت ہے۔ عزیز احمد نے اپنی قلم کاری کا آغاز ننگش اور تراجم سے کیا۔ ان کے دو ناول ”ہوس“ اور ”مرمر اور خون“ ۱۹۴۳ء تک شائع ہو چکے تھے۔ اسی سال انھوں نے ابن سینا کے ڈرامے ”لوگریٹ بلڈ“ کا تراجم ”عظیم“ کے نام سے ترجمہ کیا اور ایک منظوم ڈرامہ ”عزیم“ بھی لکھا ماسطوح کی ”بوطیقا“ اور دانتے کی Divine Comedy کا ترجمہ ”طرہ بے خداوندی“ کے نام سے کیا۔ ۱۹۴۳ء میں انھوں نے اپنا تیسرا ناول ”مگر“ لکھا جو ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا جس کا ہیرو نیم آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کر کے تربیت کے لیے لندن چلا ہے۔ یہ کردار جب بین الاقوامی پس منظر میں زندگی گزارتا ہے تو کیا طریقہ عمل اختیار کرتا ہے۔ یہی اس ناول کا موضوع ہے۔ نعیم کے کردار میں اس دور کے نوجوانوں کے تمام رجحانات و میلانات کی ترجمانی ملتی ہے۔ ناول کے اعتبار سے یہ اردو کا ایک کامیاب ناول ہے۔ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے اپنا ناول ”آگ“ لکھا جو ۱۹۴۷ء سے پہلے شائع ہوا۔ اس میں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۲ء تک کشمیری معاشرے کی زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں کشمیر کی تین نسلوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں ان کا وہ ناول شائع ہوا جسے آج ہم اردو زبان کے بہترین ناولوں میں شمار کرتے ہیں اور جسے ہم سب ”ایسی بلندی ایسی پستی“ کے نام سے جانتے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں اس ناول کا ترجمہ پروفیسر رائف رسل نے انگریزی میں کیا جسے یونیورسٹی نے شائع کیا۔ ۱۹۵۰ء میں عزیز احمد کا آخری ناول ”شبشم“ شائع ہوا۔ ان سب ناولوں میں عزیز احمد نے اپنے دور کی روح کو لفظوں میں سمیٹ لیا ہے۔ اُس وقت خود عزیز احمد جوان تھے اور اُن کی عمر ۳۷ سال تھی۔ عزیز احمد کی ناول نگاری نے اردو ناول کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ ان ناولوں کے بغیر ہم اس دور کی معاشرت و رجحانات، اس کے تضاد اور کشاکش کا عرفان حاصل نہیں کر سکتے۔

اردو ادب میں یہ دور روایت شکنی کا دور تھا اور پرانی اقدار اور رسوم کے خلاف بغاوت کا ایک سیلاب تھا جو نوجوان نسلوں کے ذہنوں میں موجزن تھا۔ فراہڈ کے نظریہ

جنس میں انسانی جبلت کے نئے امکانات نظر آ رہے تھے۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس منٹو کا بھی بہرہ بخشہ اور عزیز احمد کا بھی۔ منٹو نے افسانوں کے ذریعے اور عزیز احمد نے اپنے ناولوں میں انسان کی اس جبلت کو موضوع بنایا۔ ان ناولوں پر فرانسیسی حقیقت نگاری کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ ان سب ناولوں میں ”فرد“ اہم ہے لیکن ”ایسی بلندی ایسی پستی“ میں ان کا زاویہ نظر بدل جاتا ہے اور وہ فرد کے مطالعے سے جاگیردارانہ معاشرے کی ہیئت اجتماعی کا اتنی فن کاری سے مطالعہ کرتے ہیں کہ اس ناول میں فرد کا المیہ ایک تہذیب کا المیہ بن جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ محمد حسن عسکری مرحوم نے سرماہی ”اردو ادب“ لاہور میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ اردو کا پہلا اجتماعی ناول ہے۔ اس دور میں جاگیردار امراء کی تہذیب دم توڑ رہی تھی۔ سارے برصغیر میں یہی صورت حال تھی۔ یہی صورت ہمیں ڈاکٹر احسن فاروقی کے ناول ”شامِ لوتھ“ میں نظر آتی ہے۔ ”ایسی بلندی ایسی پستی“ میں حیدر آباد دکن کا طبقہ امراء کو موضوع بنا رہا ہے اور شامِ لوتھ میں لکھنؤ کا یہی طبقہ موضوع ہے۔ دونوں ناولوں میں انفرادی کردار ایک مخصوص تہذیب کے ذہن افکار اور نظام کے اجتماعی زوال کی کہانی سناتے ہیں۔ عزیز احمد کے ناول ”شبنم“ میں پھر تہذیب کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں وہ عشق کو ”گریز“ کے انداز سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔ ان کے ہاں روایت بھی اب اپنی شکل بدل رہی ہے۔ اس کے بعد عزیز احمد نے کوئی ناول نہیں لکھا البتہ ایک تاریخی ناول ”نیور“ کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اسی کے ساتھ تاریخ ان کے یہاں طویل افسانوں کا موضوع بننے لگی اور قدیم تاریخ جدید شعور کی ترجمانی کرنے لگی۔ ”زین تاج“، ”خندگ جست“ اور جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں“ ان کی وہ لازوال کہانیاں ہیں جنہوں نے اردو ادب کی میسرٹ کو متاثر کیا بنا دیا ہے۔ جمیل ہاشمی نے جب عزیز احمد کے ناول ”ایسی بلندی ایسی پستی“ کو دوبارہ شائع کیا تو ۸ نومبر ۱۹۶۹ء کو ایک خط میں مجھے لکھا کہ ”اُن سے ارشاد فرمائیں کہ تین جلدیں مجھے روانہ کر دیں“ میں بہت ممنون ہوں گا۔ اُن سے یہ بھی ارشاد فرمائیں کہ میری جو اردو کتابیں وہ چاہیں دوبارہ شائع فرما سکتی ہیں۔ خاص طور پر میری یہ چاہتا ہوں کہ میرے آخری تحریری دور کے طویل افسانے، جو زیادہ تر ”نیادوز“ میں شائع ہو چکے ہیں وہ ایک جلد میں جمع کر کے شائع فرمائیں اور اگر آپ خود اس جلد کا ”دیباچہ“ لکھیں تو میری بڑی عزت افزائی ہوگی نہ پھر یہ ہوا کہ جمیل ہاشمی دوبارہ جوئیں اور

اس کے ساتھ ان کا اشاعتی منصوبہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک اور خط میں عزیز احمد نے مجھے لکھا کہ ”وہ حصہ جو ”نیا دور“ میں میرے متعلق ہو گا اس میں ”تصور شیخ“ اور ”جب آنکھیں آہیں پوش ہوئیں“ ضرور شامل کیجیے گا۔ یہ دونوں کہانیاں ”نیا دور“ کے اگلے شمارے میں پھر شامل ہوئیں۔ ان کہانیوں میں عزیز احمد نے فن کی بلندیوں کو چھو لیا ہے۔

عزیز احمد نے اپنے مختصر اور طویل افسانوں میں روایت، اساطیر اور تاریخی شخصیات کو موضوع بنا کر ان کے گرد ایسے افسانوی تار و پود بنے جن سے وہ شخصیتیں ایک نئے رنگ میں زندہ ہو کر ہمارے جدید شعور کا حصہ بن گئیں۔ یہ افسانے تہذیبی و روایتی سرمائے کو جدید زمانے سے ہم آہنگ کرنے کا بہترین اظہار ہیں۔ جدید دور ماضی میں خود کو کیسے تلاش کر سکتا ہے اس تخلیقی عمل کی یہ افسانے خوب صوت اور بہترین مثالیں ہیں۔ زربین تاج، ”تصور شیخ“، ”مدن سینا“ اور ”صدیاں“، ”آپ حیات“، ”جب آنکھیں آہیں پوش ہوئیں“ اور ”خندگ جستہ کو اردو ادب میں اتنا بڑا مرتبہ حاصل ہے کہ آج تک ایسے افسانے اردو میں کوئی اور نہیں لکھ سکا۔ یہ افسانے اپنے فنی حسن، کمال اختصار اور طرز ادا کے لحاظ سے دنیا کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ عزیز احمد کا اصل فن یہ ہے کہ وہ موجودہ شخصیات یا تاریخی کردار اور علامات کو اپنے زمانے کے جذبات و احساسات کے ساتھ فنی فنی چابک دستی کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ روایت کا سلسلہ و سلسلہ، اس کی گہرائیاں اور اس کی وسعت سمٹ کر زمانہ حال میں آجاتی ہیں۔ عزیز احمد نے ان افسانوں میں کلاسیکی حسن کو چھو لیا ہے۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے: ”قصہ ناتمام“ اور ”بیکار دن“، بیکار راتیں شائع ہو چکے ہیں مگر عزیز احمد کچھ اور نہ بھی کرتے تو ان ناولوں اور افسانوں کی وجہ سے اردو ادب میں زندہ رہتے۔ لیکن ایک بڑے ذہن کی طرح ان کا ذہنی سفر جاری رہا۔ وہ کسی منزل پر نہ ٹھک کر نہیں بیٹھے بلکہ ہر منزل سے ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے نئے سفر کا آغاز کرتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد اب ان کی تخلیقی، علمی و ادبی زندگی کے نئے سفر کا آغاز ہوا ہے۔

عزیز احمد کی پہلی تنقیدی تصنیف ”ترقی پسند ادب“ نے اپنے دور میں وہ کام کیا جو بہت کم کتابیں کرتی ہیں۔ ایک ایسے دور میں جب نئے خیالات، میلانات اور رویوں کا سیلاب

کیا ہوا تھا اور اس سیلاب میں تعصبات کا کوئی اثر نہ تھا اور پارٹی لائن کا ریت خاصی مقدار میں
 بہہ کر اٹھ گیا تھا، عزیز احمد نے معروف معنی انداز سے اس دور کے میلانات کا تجزیہ کیا۔ اس کتاب
 نے اس دور کے کھٹنے اور چڑھنے والوں کو بھر سے غور کرنے اور مسائل و رجحانات کا جائزہ
 لینے کی طرف مائل کیا۔ انھوں نے ماضی اور روایت کی اہمیت پر زور دیا۔ تخلیق کے لیے
 فن، ہیئت اور بیان کی اہمیت واضح کی، ادب اور پروپاگنڈا کو الگ الگ خانوں میں رکھا۔
 اس تصنیف میں انھوں نے حقیقت نگاری اور انقلاب کے نئے رجحانات کا تجزیہ
 کرتے ہوئے فن کو سہاست و تعصب کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیا۔ عزیز احمد کی سب سے بڑی
 خوبی یہ تھی کہ وہ ایک معروف ذہن اور کھلا دماغ رکھنے والے انھوں نے زندگی کو خافوں
 میں نہیں بانٹا بلکہ اُسے ایک اکائی کے طور پر دیکھا جو ہر دم رواں دواں آگے بڑھتی رہتی ہے
 اور جس میں حال کی طرح ماضی میں غمیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اقبال کو بھی انھوں نے کھلے
 ذہن سے دیکھا ہے اور "اقبال" ایک نئی تشکیل ہے جس طرح اقبال کا مطالعہ کیا ہے
 جس طرح اقبال کے ذہن سے متعلق ان تمام مباحث کو سمیٹا ہے جس طرح اقبال کے فن اور خیالات
 کی وضاحت کی ہے، آج بھی یہ کتاب اقبال پر ہزاروں لاکھوں صفحات لکھے جانے کے باوجود ایک
 ایسی اہم کتاب ہے جس کے بغیر اقبال کا مطالعہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے دور میں اقبال کا
 المیہ یہ ہے کہ ہم نے ان کا مطالعہ ایک مجاہد کی حیثیت سے کیا ہے اور اس طرح اس فکر کو جسے
 اقبال نے تشکیل دے کر آگے بڑھایا تھا، ہم نے بند باندھ کر وہیں روک دیا ہے۔ فکر انسانی
 تنقیدی نظر سے ابھرتی ہے، تجزیہ سے نشوونما پاتی ہے، اختلاف و تضاد کے تضاد سے
 آگے بڑھتی ہے قوموں کی زندگی میں حرف سجادہ نشینوں اور مجاہدوں کے ذہن سے نہیں بلکہ خود
 اقبال کی طرح کھلے ذہن سے زندگی اور فکر کا مطالعہ کرنے سے نشاۃ الثانیہ کا آغاز ہوتا ہے۔
 جب تک ہم اپنے موجودہ رویے کو نہیں بدلیں گے، ہمارا معاشرہ اسی طرح خود غرضیوں، انسانی
 پستیوں، ذہنی فریب، ہر قسم کے تعصبات اور بے سرو پا جذبات کی دلدل میں دھنسا رہے گا۔ یہی
 کھلا ذہن عزیز احمد کو فکر تحقیق کی طرف لے گیا۔ انھوں نے دیکھا کہ برہمنی ذہن انسان دوستی کے
 حوالے سے انھیں اپنے عظیم تمدن اور تہذیب کے ورثے سے دور کر کے خالص ہندوستانی

اساطیر کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ اقبال نے اپنی فکر و شاعری کے ذریعے مسلمانوں کو ان کی تہذیب و تمدن کے ورثے سے نہ صرف باخبر کیا تھا بلکہ عہدِ حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر ایک نظام فکر کو تشکیل دینے کے لیے بے شمار مسائل اٹھائے تھے۔ ان مسائل کا جواب اور حل کی تلاش ہمارا فریضہ تھا۔ ہم یہ فریضہ کھلے ذہن سے پورا کر سکتے تھے لیکن محمدانوں نے ہماری نسل کے ذہن کو خوف سے گندا کر دیا اور فکرِ اقبال کے ارتقا کو روک دیا۔ کیا ملکی سطح پر یہ ہمارا قومی المیہ نہیں ہے؟

۱۹۵۷ء کے بعد عزیز احمد نے خصوصاً مسلمانوں کی تہذیب اور فکر کا مطالعہ شروع کیا۔ اب وہ ادب سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ ان کا آخری افسانہ "قیری دلیری کا بھرم" "نیا دور" کراچی کے شمارہ نمبر ۲۵-۲۶ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اردو میں کوئی قابل ذکر چیز نہیں لکھی۔ اب انھوں نے انگریزی زبان میں مضامین اور تصانیف کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا جن کا موضوع مسلمانوں اور خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب کا مطالعہ تھا۔ جب ان کی پہلی کتاب Studies In Islamic Cul-

ture in the Indian Environment ہوئی تو علمی حلقوں

میں اسے بہت پسند کیا گیا۔ اس کے بعد ان کی دوسری کتاب Islamic-

Modernism In India and Pakistan شائع ہوئی اور پھر

Self Statement In India and Pakistan شائع ہوئی

تو بین الاقوامی حلقوں میں ان کی علمی و تحقیقی حیثیت مسلم ہو گئی۔ اس عرصے میں انھوں نے بہت سے مضامین بھی لکھے جو بین الاقوامی رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ ان کی دو اور قابل ذکر

تصانیف An Intellectual History of Islam in India اور

History of Islamic Sicily بھی قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں اٹلی کی

حکومت نے آخر الذکر کتاب پر انھیں انعام دیا۔ عزیز احمد کی یہ خواہش تھی کہ میں

Islamic Modernism Studies in Islamic Culture

In India and Pakistan کا اردو میں ترجمہ کروں۔ وہ جس محنت سے لکھتے

تھے اس محبت کا جواب میں نے کبھی انکار سے نہیں دیا اور وعدہ کر لیا۔ یہ برسوں پہلے کی بات ہے۔ یہاں میں یہ بتانا چلوں کہ "اسلامک موڈرنزم" کا ترجمہ میں نے بہت پہلے مکمل کر لیا تھا اور "اسلامک کلچر" کا تقریباً ایک تہائی ترجمہ جو چکا ہے۔ جب تک عزیز احمد زندہ تھے مجھے چھپانے چھپوانے کی جلدی نہیں تھی۔ لیکن اب جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں میں اپنی پہلی فرصت میں اس فریضے سے سبکدوش ہو جانا چاہتا ہوں۔ عزیز احمد کی یہ وہ تصانیف ہیں جن میں انھوں نے مطالعہ تاریخ اور اس کے تجزیے کے ذریعے جدید اسلامک فکر کا سراغ لگانے میں وہ کام کیا ہے جس کا آغاز سرسید نے کیا تھا اور جس کو اقبال نے ایک خاص نقطے تک پہنچایا تھا۔ جب تک ہم اپنی جڑیں اپنی تاریخ، اپنی تہذیب اور اپنی حقیقی فکر میں تلاش نہیں کریں گے ہم کسی ایسے صحت مند معاشرے کو جنم نہیں دے سکتے جہاں ایک طرف دولت کی مساوی تقسیم سے معاشرہ خوش حال ہو جائے اور جہاں عدل و انصاف سب کے لیے یکساں ہو اور دوسری طرف جہاں علم و ادب، فکر و تہذیب کی روشنی سے معاشرے کا ذہن منور ہو سکے۔ عزیز احمد کی کتابیں ہمارے فکری راستے کو بہت دور تک طے کرا رہی ہیں۔

۱۶ دسمبر ۱۹۷۶ء کے خط میں انھوں نے لکھا تھا "دیوان حسن شوقی" و "نصرتی اور گلشنِ عشق" بھیجنے کا شکریہ ادا کر سکا۔ فروری سے سرطان میں مبتلا ہوں۔ تین آپریشن ہو چکے ہیں۔ آخری آپریشن ہوا کہ جس کے ذریعے سرطان کو نکال دیا گیا اور اب بقیہ ورثی میں پھر سے پڑھا رہا ہوں لیکن مرض کے دوبارہ نمود کر آنے کا اندیشہ لگا ہوا ہے۔ جب ہسپتال میں تھا دو غریب لکھیں جو ذرا قنوطی ہیں۔ فارسی غزل کا دوسرا شعر ملحدانہ بھی ہے اور عارفانہ بھی۔ معلوم نہیں اس کی اشاعت سے پاکستان میں ہنگامہ برپا ہو گا یا نہیں۔ وہ شعر انھوں نے اپنے قلم سے کاٹ دیا تھا اور "نیاور" میں شائع نہیں ہوا۔ آج آپ بھی وہ شعر سن لیجیے :

او کہ ہر جاست بیک خانہ خواہد گنجید
شد ز اسنام تہی کعبہ چہ ویراں افتاد

منظہر چانچانوں، میر درد، بختہ شاہ اور اقبال ہوتے تو یہ شعر سن کر عزیز احمد کو میسے سے اٹھا لیتے۔ ۱۸ نومبر ۱۹۶۷ء کے خط میں لکھا: "جتنی محنت اور اخلاق سے آپ پیش کرتے رہے ہیں اس کی میں مرتے دم تک قدر کرتا رہوں گا۔ فی الحال تو کام کر رہا ہوں اور اگر خدا نے چاہا احد سلطان دوبارہ عود نہ کرنے پایا تو شاید کچھ دن زندہ رہوں۔ ویسے نہ زندگی کی کوئی خاص خواہش ہے نہ مرنے کا کوئی خاص ڈر۔ جب اللہ کی مرضی ہو، میں راضی برضا ہوں۔" ۱۵ اگست ۱۹۶۸ء کے خط میں لکھا: "میں بدستور زندگی اور موت کے درمیان معلق ہوں۔ جب تک چل رہا ہوں چل رہا ہوں۔ آپ جیسے غلط شد بہت یاد دلاتے ہیں۔ ایک نئی غزل ہوئی ہے جو "نیا دور" کے لیے بھیج رہا ہوں۔ اس غیر مطبوعہ غزل کے چار شعر آپ بھی سنی لیجیے۔ دیکھیے عزیز احمد ہم سے کیا کہہ رہے ہیں !

گھبرا کے ہم تو عرصہ جاں سے نکل گئے
بزم جہاں طلسم جناں سے نکل گئے
کب سے تھے ہم امیر شب در روز و ماہ و سال
قید زمان و بند مکان سے نکل گئے
تھا جنبش زبان و قلم کا یہ ماجھل
ناگفتہ حرف تھے کہ زبان سے نکل گئے
یاروں کو بزمِ آلاہ زخاں ہی میں چھوڑ کر
ہم خاک بن کے کوئے بتاں سے نکل گئے

اُدھر کئی مہینے سے اُن کا خط نہیں آیا تھا۔ میں بھی مصروف تھا۔ دسمبر میں میں نے انھیں خط لکھا۔ غیریت در یافت کی اور پاکستان آنے کا پروگرام لے چھا۔ وہ خاموش تھے اور دعا مانگ رہے تھے :

ہے یہ دعا کرتے کو اپنی نگاہ میں نصیب
علم و ادب کے افسر و اورنگ دوست

لیکن مجھے تو اپنے خط کے جواب کا آج تک انتظار ہے۔

خواتین و حضرات! یہ میں نے عزیز احمد کے پاس سے میں کوئی مضمون نہیں لکھا
ہے۔ صرف ایک شریف النفس، منکسر المزاج، عالم فاضل اور ایک بھولے بسرے انسان
کی یاد تازہ کرنے کے لیے ان کے کام کا تعارف کرایا ہے تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ
عزیز احمد کی وفات سے قومی سطح پر ہمارا کتنا بڑا نقصان ہوا ہے۔ کاش ہم اس
نقصان کا احساس کر سکیں؟

میراجی۔ ایک مطالعہ

فیض احمد فیض اردو زبان کے وہ شاعر تھے جن کے حوالے سے یہ زبان اور اُس کی شاعری ان انجمن بستیوں میں بھی پہچانی گئی جہاں ہمارے دوسرے شاعر اور ادیبوں کے نام اور کام کا گذر تک نہ ہوا۔ فیض نے شاعری میں ایک ایسی منفرد آواز کو جنم دیا جو دُور سے پہچانی جاتی تھی اور اس آواز میں پہلی ہوئی دنیا کے عوام کا کرب شامل کر کے اُسے سب کے دلوں کی دھڑکنوں میں جذب کر دیا۔ فیض احمد فیض، میراجی اور ن۔م۔ راشد کے ہم عصر بلکہ ہم عمر تھے۔ ن۔م۔ راشد ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ فیض ۱۹۱۱ء میں اور میراجی ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے نہ صرف اپنے دور کے اثرات کو قبول کیا بلکہ اردو میں نئی شاعری کی طرح نئی۔ یہ تینوں شعراء تین الگ الگ رنگوں کے علمبردار ہیں اور یہ تینوں رنگ مل کر اردو شاعری کو ایک نیا تناظر فراہم کرتے ہیں۔ ایک بڑے معاصر فیض احمد فیض نے، اپنے دوسرے بڑے معاصر میراجی کے بارے میں لکھا تھا کہ:

”اُن کی نثر کی ماہیت اور فضا اُن کی نظم سے قطعی مختلف ہے۔ میراجی کے ذہن کا جو عکس ان کی نثر میں ملتا ہے بعض اعتباراً ان کی شاعرانہ شخصیت کے قریب قریب مکمل نفی کرتا ہے۔۔۔۔۔ ان کی تخلیق کا یہ حصہ تمام خراساں عقل کی رہنمائی میں نکھا گیا ہے جسے وہ بظاہر عمل شعری کے قریب نہیں پھکنے دیتے۔“

یہی میراجی جن کی وفات کا اتالیق سوال (۳۹) اور ولادت کا سنسرواں (۷۷) سال ہے،

آگے کے "فیض میموریل بیکچر" کا موضوع ہے۔

میراجی، جن کا اصل نام محمد ثناء اللہ ثانی ڈار تھا، منشی محمد مہتاب الدین کے ہیں ۲۵ مئی ۱۹۱۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ پہلے "ساحی" تخلص کرتے تھے لیکن ایک بنگالی لڑکی میرا سین کے یک طرفہ عشق میں گرفتار ہو کر، جیسا کہ شیخ سعدیؒ نے گلستان کے باب ۷۰۰ میں لکھا ہے کہ در عہد جوانی چنان کہ افتد والی، میراجی تخلص اختیار کر لیا اور آج ہم انھیں اسی نام سے پہچانتے ہیں۔ میراجی کی ذات سے ایسے ایسے واقعات وابستہ ہیں کہ ان کی ذات عام آدمی کے لیے ایک افسانہ بن کر رہ گئی ہے۔ ان کا حلیہ اور ان کی حرکات و سکنات ایسی تھیں کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے سلسلہ ملا متیہ میں بیعت کر لی ہے۔ لمبے لمبے بال، بڑی بڑی ٹوچھیں، گھٹے میں ایک سو ایک موٹے داؤں کی دو گز لمبی مالا، شیر والی جس کی کھنیاں ہمیشہ پھیل ہوئی ہوتی تھیں، اوپر نیچے بیک وقت تین چلوں میں اوپر کی جب پھیلی ہو گئی تو نیچے کی اوپر اور اوپر کی نیچے بدل جاتی۔ شیر والی کی دونوں جیبوں میں بہت کچھ ہوتا تھا۔ کچھ ڈھلے ہوئے چمچہٹڑے، ایک پائپ، کاغذ میں پائپ کا دسی تمباکو، پان کی ڈبیا، ہو میو پتیک دو انیس..... کاغذوں اور بیاضوں کا پلندہ بغل میں دا بے بڑی سڑک پر پھرتا تھا اور چلتے ہوئے ہمیشہ ناک کی سیدھ دیکھتا تھا۔ ناک جھانک کر وہ کفر خیال کرتا تھا۔ بازار میں کسی سے مذاق نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے گھر اپنے محلے اور اپنی سوسائٹی کے ماحول کو دیکھ دیکھ کر کڑھتا تھا..... اس نے عہد کر رکھا تھا کہ وہ اپنے لیے شعر کہے گا۔

سذات حسن منو نے لکھا ہے کہ "میراجی تین گولے تھا جن کو لٹوکانے کے لیے اس کو کسی خارجی مدد کی ضرورت نہیں پڑتی تھی..... ان خارجی اشاروں نے ہی اس پر ایک ازلی اور ابدی حقیقت کو منکشف کیا تھا۔ حسن، عشق اور موت۔ اس تثلیث کے ہم آؤلیہ کا زاویہ صرف ان تین گولوں کی بدولت اس کی سمجھ میں آئے تھے، لیکن حسن و عشق کے انجام کو چونکہ اس نے شکست خوردہ عینک سے دیکھا تھا جس کے شیشوں پر تر پڑے تھے..... اس کے سارے وجود میں ایک ناقابل بیان ابہام کا زہر پھیل گیا تھا جو ایک نقطے سے شروع ہو کر ایک دائرے میں تبدیل ہو گیا تھا اس طور پر کہ ہر نقطہ اس کا نقطہ آغاز ہے اور وہی

نقطہ انجام۔ حسن عشق اور موت — یہ تینوں چمک کر میراجی کے دھند میں گول ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ میراجی کے ہاتھ میں تین گولوں کے بجائے دو گولے دیکھ کر منٹو نے پوچھا کہ تیسرا گولہ کیا ہوا، تو میراجی نے جواب دیا۔ ”برخوردار کا انتقال ہو گیا ہے مگر اپنے وقت پر ایک اور ہوجائے گا۔“

الطاف گوہر نے پہلی ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک دن مختار صدیقی کے ہمراہ وہ میراجی کے گھر گئے۔ مختار صدیقی نے کھڑکی کے قریب جا کر آواز دی ”میراجی صاحب“ اندر سے آواز آئی ”آئیے“ ہم اندر گئے۔ متوسط گھر کا کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ ہوا کے جھونکے سے گلی کی بو کمرے میں آگئی۔ میراجی نے کہا ”یو آر ہی ہے۔ ابھی ٹھیک کیے دیتا ہوں“ اور یہ کہہ کر انھوں نے کچے بعد دیگرے پانچ سات بیڑیاں سسکا گئیں اور دو دو چار چار کنٹینر لگا کر کمرے میں ادھر ادھر بھینک دیں ”ایک اور جگہ لکھا ہے کہ“ پوچھنا میں ایک مشاعرہ پورا تھا۔ بڑے عظیم الشان بیانیہ پر، خوش، جگر، فراق سبھی تھے۔ میراجی کئے اور حاضرین کی طرف پہنچ کر کے پڑھنے لگے۔ ”نگری نگری پھر اسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔“

یہ اور اسی قسم کے بے شمار واقعات آپ کو ان تحریروں میں ملیں گے جو ان کے دوست احباب نے میراجی کے بارے میں لکھی ہیں۔ یہ سب واقعات انتہائی دلچسپ ہیں۔ آپ بھی ان سے یقیناً لطف اندوز ہوئے ہوں گے لیکن ان واقعات نے ایک طرف میراجی کو افسانہ بنا دیا اور دوسری طرف شاعری کی طرف سے توجہ ہٹا کر اس کا رخ ان کی ذات کی طرف کر دیا۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ میراجی کی تخلیق سے میراجی کی طرف سفر کیا جاتا اور پھر اسی کے ساتھ فوراً سفر واپسی یعنی میراجی سے پھر تخلیق کی طرف۔ یہاں عمل الٹا ہوا۔ میراجی نے اپنی مشہور تصنیف ”اس نظم میں“ کے دیباچہ میں خود لکھا ہے کہ ”شاعر کے نام کی طرف نہیں بلکہ کام کی طرف دیکھا جائے۔“

آئیے اب ان کے حلیے، ان کے گولوں، ان کی بغیر حیب کی چٹلون، ان کی لٹوں، ان کی مالا، ان کی شراب نوشی اور عجیب و غریب حرکات کو چھوڑ کر ان کے کام کی طرف دیکھتے ہیں۔ ان واقعات کو سن کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساری عمر یہی ڈھونگ رہا کرتے رہے اور

شاید انھوں نے تخلیقی سطح پر کوئی خاص کام نہیں کیا۔ اس تصویر سے ایک غیر ذمہ دار اور
 بھون انسان کی تصویر مزوراً بھرتی ہے، جو میراجی یقیناً نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے
 چراغ کی بتی کو دونوں سروں سے یقیناً جلا دیا اور صرف ہلکے ۲۷ سال کی عمر میں ۳ نومبر ۱۹۴۹ء
 کو مر گئے۔ اس مختصر سی عمر میں میراجی نے اتنا کچھ کر آج صرف اُن کی کلیاتِ شاعری ہی ۱۰۰
 صفحات پر مشتمل ہے اور حال ہی میں اردو مرکز لندن سے شائع ہوئی ہے۔ ان کی تصانیف
 میں جہاں مشرق و مغرب کے نغمے (۱۹۵۸ء)، اس نظمیں (۱۹۶۳ء)، نگار خانہ (۱۹۵۰ء)
 غیسے کے آس پاس (۱۹۶۳ء) شامل ہیں وہاں میراجی کے گیت (۱۹۶۳ء)، میراجی کی نظمیں
 (۱۹۶۳ء) گیت ہی گیت (۱۹۶۳ء) پابندِ نظمیں (۱۹۶۸ء) اور تین رنگ (۱۹۶۸ء) شاعری
 کے وہ مجموعے ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو نئے امکانات سے روشناس کرایا اور اسے اس
 راستے پر ڈال دیا جس پر وہ آج کامرزن ہے۔ ان کے علاوہ انھوں نے نثر میں بھی اتنا کچھ کر
 اگر اسے یکجا کر دیا جائے تو ایک ضخیم کتاب وجود میں آئے گی۔ شاعری کی طرح ان کی نثر بھی
 یکجا و مرتب کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ میراجی کی پوری تخلیقی شخصیت سامنے
 آجائے اور نئی نسل کو معلوم ہو سکے کہ میراجی نے جدید ادب کو کن نئے امکانات سے روشناس
 کیا ہے بحیثیت مجموعی یہ اتنا نیا اور پُر اِذا امکانات کا کام ہے کہ بعض لوگوں نے طویل عمر
 پا کر اور باقاعدہ زندگی گزار کر بھی انجام نہیں دیا۔ میراجی اذ سر تا پا تخلیق تھے۔
 اس سوال نے مجھے اکثر یہ نشان کیا ہے کہ آخر اس ساری تخلیقی سنجیدگی اور گہرے
 تخلیقی انہماک کے باوجود انھوں نے یہ تحلیل کیوں بنایا اور ساری عمر اپنی زندگی اس طور
 سے کیوں گذاری۔ خود کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اُس دور میں جب وہ ادب کی
 دُنیا میں کچھ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے اور اپنے اور دوسری زبانوں کے شعراء کے
 کلام اور حالات کا گہرا مطالعہ کر رہے تھے، انھوں نے اپنے تخلیقی کرب و اضطراب کے
 پیش نظر یہ سوچا کہ اگر وہ مجدی بھی کریں جو دوسرے عظیم شعراء نے کیا ہے تو لوگ نہ صرف اُن کی
 طرف متوجہ ہوں گے بلکہ ان کی شہرت تیزی سے چاروں طرف پھیل جائے گی۔ اس وقت
 میراجی کی عمر ۲۲-۲۳ سال تھی اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہ عمر خواب دیکھنے کی عمر ہوتی ہے۔

اس زمانے میں چند ہی داس ان کا محبوب شاعر تھا۔ چند ہی داس نے رامی دھوپن سے عشق کیا۔ میراجی نے میراسین کے عشق کا افسانہ بنادیا۔ بودلیئر دوستوں کو دشمن بنانے میں بددلیلی رکھتا تھا۔ میراجی بھی اس سے کم نہیں تھے۔ "مشرق و مغرب کے نغمے" میں میراجی نے بودلیئر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے کئی نظمیں اپنی ہی ذات کے لیے لکھی ہیں۔ میراجی نے بھی ابتدائی دور کی شاعری اپنی ذات کے لیے کی۔ بودلیئر کے بارے میں میراجی نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ لاشعور کا شاعر تھا۔ وہ نئے احساسات، نئے لہجے، نئے انداز بیان اور نئی زبان کا شاعر تھا یہی کام میراجی نے بھی کیا۔

بودلیئر نے سماج کے خلاف احتجاج کرنے کا یہ طریقہ نکالا کہ اپنا سرمند واکر، اس پر ہزار رنگ پھرا دیا اور احتجاج کی عبارت سر پر لکھ کر اور ایک سیکڑے کو دھاگے میں بانٹ کر پیرس کے ایک دستوران کے باہر کھڑا ہو گیا اور سیکڑے سے مخاطب ہو کر احتجاج کرتا رہا۔ میراجی نے بھی ایک بار اسی قسم کی وضع اختیار کی۔ اخلاق احمد دہلوی نے لکھا ہے کہ "میراجی نے وہی میں جب ایک مرتبہ نیا سال آنے پر احباب کے اصرار پر نیا سوٹ پہنا اور اپنا وہ چارلی چپلن والا جوتا بھی بدل ڈالا اور کلاسک گھیل کی وضع کی موچکیں بھی حذف کر دیں تو ان سب کو بھی حیرت ہوئی جن کے اصرار پر وہ سوٹ بوٹڈ بنے تھے اور سب نے سمجھا کہ نیا سال میراجی کے نئے لباس سے شروع ہو رہا ہے لیکن جب پوری طرح ٹپ ٹپ ہو کر انھوں نے سر پر استرا پھر دیا اور چاند سے سر پر ہنسی بھرا کر پینٹ کرایا اور وہ مالا میں جو قمیض کے اندر رہتی تھیں باہر کوٹ کے کالر پر سن لیں تو ان کے مغز میں کو کہنا پڑا کہ کوئی لباس میراجی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

بودلیئر نے اپنی ماں کو لکھا "کبھی کبھی مجھے تین تین دن بستر پر لیٹے رہنا پڑتا ہے کیونکہ میرے پاس دھلے ہوئے کپڑے پہننے کو نہیں ہوتے یا کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ سچ پوچھو تو شراب ورافیون کا ست ڈکھ کا بدترین درتو ہے۔" چھٹی دفعہ جب آپ نے مجھے مہربانی سے ۵۰ فرینک بھیجے تھے تو میں نے دو روز کے کچھ نہیں کھایا تھا۔ دو روز یعنی ۸۸ گھنٹے میں نہ میراجی اپنے دوست عبداللطیف کو ایک خط میں لکھتے ہیں "رات کو روز دفتر میں سوتا

تھا یعنی ریہرسل روم میں۔ آج اس کی چابی وقار صاحب کی جیب میں ان کے ساتھ چلی گئی۔ جب سے آپ گئے ہیں صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا مختار اپنے حساب میں ہوٹل سے کھلا دیتا ہے۔ دوپہر کا کھانا دشوانندن اپنے گھر سے لادیتا ہے۔ مانگ کر کھاتا ہوں اور قرض کی مشرب پیتا ہوں۔ اللہ ایک اور خط میں لکھا ہے ”تین دن بھوکا رہنے سے طبیعت صاف ہو گئی“ لکھ بودلیہ ساری عمر قرض خواہوں سے جان نہ چھڑا سکا۔ میراجی بھی ساری عمر قرض لیتے رہے۔ ان میں پشمان بھی شامل تھے جو انھیں ساری عمر ڈھونڈتے رہے۔ ایڈگر ایلن پو کے بارے میں میراجی نے لکھا ہے کہ ”کوئی اسے شرابی کہتا ہے۔ کوئی اعصابی مریض، کوئی اذیت پرست اور کوئی جنسی لحاظ سے ناکارہ ثابت کرتا ہے اور ان رنگ رنگ خیال کریٹوں کی وجہ سے اصلیت پر ایسے پردے پڑ گئے ہیں کہ اٹھائے نہیں بنتا ہے“ لکھ اس وقت جب میراجی نے یہ الفاظ لکھے تو میراجی ایک نارمل سے انسان تھے لیکن جب ان تصورات کو انھوں نے اپنا کر زندگی کے روپ کو بہروپ بنایا تو آج ہم بھی ان کے بارے میں یہی کہہ رہے ہیں جو انھوں نے ۲۲-۲۳ سال کی عمر میں ایڈگر ایلن پو کے بارے میں کہا تھا کہ ”ایڈگر ایلن پو مر چکا ہے۔۔۔۔ شاعر مذکور اپنی ذات اور شہرت کے لحاظ سے تمام ملک میں پہچانا جاتا تھا لیکن کہیں بھی اس کا کوئی دوست نہ تھا“ لکھ اب ملاحظہ فرمائیے کہ جب میراجی کا انتقال ہوا تو اختر الایمان نے بتایا کہ ان کے چنانے میں گنتی کے چار آدمی تھے۔ اختر الایمان، مہندر ناتھ، مدھو سون اور ان کے ہم زلف سندن۔

پرنک بیوی کے بارے میں میراجی نے لکھا ہے کہ اس کی بیوی ایک ایسا سایہ بن جاتی تھی جسے حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہوئے سایہ میراجی کی شاعری میں اسی نوع کی علامت بن کر بار بار آیا ہے۔ میراجی نے لکھا ہے کہ ایڈگر ایلن پو عورت کے سجائے عورت کے تصور کی پوجا کرتا تھا۔ لکھ میراجی کی شاعری کے بارے میں نقادوں نے لکھا ہے کہ ”میراجی کو تصور سے پیار ہے۔ تصور میراجی کا آدرش ہے۔ منظر بھی منظر بن کر نہیں تصور بن کر شاعری میں آتا ہے“ لکھ

”اے غمخوار کو میں اپنے بٹاکر دہا
 اسی پردہ کے نہاں خانے میں لے جاؤں گا
 بند جوتا ہوا اکھٹا ہوا دروازہ ہے
 ہاں یہی منظر لبر پیر بلاغت اب تو
 آئینہ خانے میں آنکھوں کے جھلکتا ہے مدام“۔

یہ سب حوالے میں نے اس لیے دیے تاکہ یہ بات آپ کے ذہن نشیں کر سکیں
 کہ میراجی کے تخلیقی ذہن کی تشکیل کے دور میں انھوں نے اپنے پسندیدہ اور بڑے شعرا کی
 وہ سب حرکات و سکنات، جو انھیں اچھی لگیں، اختیار کر لیں اور اپنی زندگی کے روپ کو
 بہروپ بنالیا۔ اس طرح انھوں نے متفنا دھن امر کو اپنی ذات میں جمع کیا اور اس جمع آدمی
 سے اپنے خارجی وجود کو پلو کر لیا۔ بودیسٹ، ایڈگر الین پو، ہائسن، میلٹن، اور چٹکی
 وغیرہ سے شاعرانہ ثانی ڈالنے میراجی کو تخلیق کیا اور پھر ساری عمر بچے تخلیق کیے ہوئے میراجی
 کے روپ بہروپ میں وہ ایسی زندگی بسر کرتے رہے جیسی کہ انھوں نے ان کی زندگی کے تضاد
 پہلوؤں کا ایک ایک ثبوت، مشرق و مغرب کے نغمے سے ملتا ہے۔ اسی لیے میراجی کے
 مطالعہ کے لیے ان کی یہ کتاب بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔

میراجی کی پیدائش (۱۹۱۲ء) اور وفات (۱۹۳۷ء) کے درمیان دنیا دو عالم گیر جنگوں
 کا شکار ہوئی جس کے نتیجے میں سارا معاشرتی، فکری و معاشی نظام درہم برہم ہو گیا اور
 سارا روایتی اخلاقی نظام، سماجی اقدار اور انسانی رشتے ٹوٹ پھوٹ کر بے ربط و بے معنی
 ہو گئے۔ مغلوب قومیں آزادی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام
 آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔ قدیم و جدید کی حدیں نہایاں ہونے لگیں۔ روایتی و قدیم اقدار سے
 بغاوت ایک عام دھان بن گیا۔ مارکس، فرائڈ اور سٹائن سٹائن کے نظریات نے نئے معاشی
 انسانی، ذہنی اور سائنسی علوم کے امکانات دکھ دیے۔ برصغیر بھی اس بدلے ہوئے تناظر
 سے متاثر ہوا اور یہاں بھی صورت حال تیزی سے بدلنے لگی۔ اخلاص، مایوسی، بیروزگاری
 اور بے یقینی نے نوجوان نسل کو گھیر لیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مستقبل گم ہو گیا ہے۔ میراجی

ہی اسی نوجوان نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ بے یقینی ہے روزگاری اور بے معنی رسمی اخلاقیات سے پریشانی ان کے لیے ایک زندہ حقیقت بھی تھی اور احساس کا حصہ بھی۔ میراجی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ دیکھا اور جو کچھ محسوس کیا اسے اپنے لفظوں اور روپ بہ روپ سے دوسروں کو دکھا بھی دیا۔ میراجی نے لکھا:

”مستقبل سے میرا تعلق ہے نام سنا ہے۔ میں صرف دو زمانوں

کا انسان ہوں۔ ماضی اور حال۔ یہی دو دائرے مجھے ہر وقت گھیرے

رہتے ہیں اور میری عملی زندگی بھی انہی کی پابند ہے۔“

اگر اس زاویے سے میراجی کے فکر و عمل کو دیکھیے تو وہ بامعنی نظر آتے ہیں بغیر مستقبل کے زندگی گزارنے والا نوجوان اس معاشرے میں اسی انداز سے اور اسی طرح زندگی گزار سکتا تھا۔ میراجی کا خادجی روپ ان کے داخلی وجود کا نتیجہ تھا اور اس طرح میراجی اس معاشرہ کے عام نوجوان کی روح کا زندہ اور جیتا جاگتا پیکر تھے۔ انھوں نے نہ صرف لفظوں سے بلکہ اپنے خوابوں کے ساتھ اپنی زندگی کو جس سانچے میں ڈھالا وہ بے مستقبل نوجوان کی ترجمان تھی۔ کیا ہم اسے بغاوت نہیں کہیں گے؟ کیا کوئی نوجوان اپنی روح کے اظہار کے لیے رسمی اخلاقیات میں گھرے ہونے کے باوجود یہ صورت اختیار کرنے کی جرأت کر سکتا ہے جس کا اظہار میراجی نے کیا!۔ ذرا میراجی کے حلیے کو ان کے انوکھے روپ بہ روپ کو اس نقطہ نظر سے بھی دیکھیے تو آپ کو ان کے خارجی و داخلی وجود کے اظہار میں گہری معنویت نظر آئے گی۔ اسی لیے میراجی نے اپنے دوست عبداللطیف کو ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۶ء کے ایک خط میں لکھا:

”میں وہی چھوڑ کر بمبئی کے گرد و نواح میں ہوں۔ پہلے دفتری

میزوں پر سوتا تھا۔ اب فرش پر براجمان ہوتا ہوں۔ خود کو کبھی معمولی اور کبھی پہنچا ہوا بڑا فقیر تصور کرتا ہوں اور دنیا شاید مجھے بھکاری سمجھتی ہے۔ سچ ہے سماج کے فرائض جس طرح دنیا انھیں سمجھتی ہے میں نے جس طرح میں انھیں سمجھتا ہوں! پورے نہیں کیے۔ لیکن

میں نے اپنی جسمانی زندگی سے زیادہ جس قدر ذہنی زندگی بسر کی ہے اس کا لحاظ کسے ہو گا؟ ۱۔ ۲۔ ۳۔

”ذہنی زندگی“ کی بات کر کے اسی خط میں میرا جو کچھ لکھتے ہیں اس سے سارے سماجی و فکری نظام کے خلاف بغاوت کا پہلو واضح طور پر اجاگر ہوتا ہے:

”افسوس یہ بھی ایک سوال ہے اور سوال بھکاری کی دوسری علامت۔“

کیا میں کبھی اس قابل نہ ہو سکوں گا کہ سوال کے سنبھالنے لپے آپ کو فیصلے کا اہل ثابت کر سکوں۔ ہرگز نہ ترین چیز کے نام پر کہتا ہوں کہ یہ احساس کمتری نہیں، یہ وہی ”جونیات“ ہیں جس نے میرے احساسات اور خیالات کو تو نفیس بنایا لیکن جو میرے واقعات پر دوزخ کو دنیا کی نظریں نفیس نہ بنا سکے۔ میں دلی، مہینوں بلکہ بعض دفعہ ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ سال تک نہیں نہایا کرتا۔ دنیا کو یہ بات ہی معلوم ہوتی ہے اور میں اسے سمجھتا ہوں۔ میرے کپڑے اکثر پیلے دکھائی دیتے ہیں۔ دنیا بڑا مانتی ہے، میں مانتا ہوں... بعض دفعہ خالی پیٹ زیادہ شرب پینے سے صبح مجھے اپنا بستر خود گھیرا محسوس ہوتا ہے تو میں اپنی زندگی کے اونچے نیچے کے ساتھ یہ بھی مویج سکتا ہوں کہ اس حالت کے دیکھنے والے چاہے میرے دوست یا طیر خواہ ہوں یا کوئی اور، ان کی طبیعت منقض ہوگی۔ مگر یہ بات، سوچنے کے باوجود اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس تمام صمدت حال، اس سلع، اس نظام حیات و کائنات کا مقصد کیا ہے؟ زیادہ تر لوگ مجھے خود غرض دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۔ ۲۔ ۳۔

اس اقتباس سے دہرہ پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ میرا جی جو کچھ کر رہے تھے یا جو کچھ انھوں نے کیا وہ بے غیری میں نہیں بلکہ شعور کی سطح پر کیا ہے۔ بڑے سوال یعنی نظام حیات و کائنات کا مقصد کیا ہے؟ انھیں پریشان کر رہے تھے۔ اپنے معیار زندگی کو بلند کرنا ہرگز ان کا مسئلہ نہیں تھا وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ یہ نظام جس کے خلاف وہ احتجاج اور بغاوت

کر رہے ہیں وہ نظام نہیں ہے کہ جہاں وہ سوال کے بجائے اپنے آپ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ وہ زندگی کی بے معنویت کو ظاہر کر کے دنیا کو تبدیل کرنے کا احساس دلانا چاہتے تھے۔ وہ اس شعور کو جو ان کے اندر تھا معاشرے کا حصہ بنا دینا چاہتے تھے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن جسے روایت و معاشرہ کے خلاف بغاوت کر کے میراجی نے جرات کے ساتھ کر دکھایا۔ فرزانوں کی اس دنیا میں دیوانوں کی بات سمجھنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔ وہ اس دور میں نئی نسل کے جذبات و احساسات، خیالات و حالات کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس طور پر ترجمانی و نمائندگی کسی دوسرے ادیب، شاعر، دانشور نے نہیں کی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ خود تو ساری عمر دکھ بھوگتے رہے، ذلیل و خوار ہوتے رہے، لوگوں کی نفرت کا نشانہ بنے رہے لیکن انہوں نے معاشرتی شعور پیدا کرنے میں وہ کام کیا کہ اس سطح پر شاید ہم کوئی دوسرا نام نہیں لے سکتے۔ نوجوان نسل ہی ان کی توجہ کا مرکز تھی۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ایک چھوٹا سا اقتباس میراجی کے الفاظ میں اور سن لیں:

”موجودہ صدی کی بین الاقوامی کشمکش سیاسی، سماجی اور اقتصادی
نے جو انتشار نوجوانوں میں پیدا کر دیا ہے وہ بالخصوص میراجی کو نظر رہا اور
آگے چل کر جدید نفسیات نے اس تمام پریشاں خیالی کو جنسی رنگ دیدیا۔۔۔
ویشنو خیالات نے نہ صرف مذہبی لحاظ سے اپنا نقش چھوڑا بلکہ اس کی ادبی
روایات بھی کچھ اس انداز سے بر دے کار آئیں کہ دل و دماغ ایک جیتا
جاگتا برند ابن برند بن کر رہ گیا۔“

اس اقتباس میں میراجی اپنے تخلیقی سفر کا راستہ بتا رہے ہیں۔ اس صدی کی بین
الاقوامی کشمکش نے سیاسی، سماجی اور اقتصادی سطح پر نوجوانوں کو انتشار کا نشانہ کر دیا۔ یہ
ان کا مرکز نظر رہے۔ جدید نفسیات نے اس پریشاں خیالی کو جنس کا رنگ دیدیا اور اس
رنگ سے میراجی نے جیتا جاگتا برند ابن آباد کر لیا۔ یہ ان کے بڑے سفر کی پہلی منزل تھی جس پر چل
کر وہ نئے طرز احساس نئے انسان اور نئی شاعری کو جنم دینا چاہتے تھے:

رات اندھیری بن ہے سونا کوئی نہیں ہے ساتھ
 یوں جھکولے پیڑ ہائیں، تھر تھر کانپیں بات
 دل میں ڈر کا تیروٹھا ہے ایسے پر ہے ہاتھ
 رہ رہ کر سوچوں یوں کیسے پوری ہوگی رات؟

.....

کیسے اپنے دل سے مٹاؤں برہ انگن کا رنگ
 کیسے سمجھاؤں پریم، ہسلی کیسے کروں سب کوگ
 بات کی گھڑیاں بیت نہ جائیں دُور ہے اس کلاویں
 دور وہیں ہے مہم کا اور میں بدلے ہوں بھیس

بھیس بدل کر میراجی دور وہیں کے سفر پر روانہ ہوئے تو انھوں نے غزل سمیت
 شاعری کی ان تمام اصناف کو ترک کر دیا جن سے معاشرہ مانوس تھا۔ بخور و اور اوزان
 کے سارے مروجہ نظام کو بھی توڑ دیا۔ (بخور و اوزان کے تعلق سے میراجی کی شاعری کے
 ایک الگ مطالعہ کی ضرورت ہے، نئی ہیئت اور شعری پیکر کا نظام انیسویں صدی کی حد
 مغربی شاعری سے لیا اور آزادی کے اس احساس کے ساتھ حقیقت و احساس کو اپنی شاعری
 میں سمو دیا۔ گیت اور آزاد نظم نئی نئی ہیئتوں کے ساتھ وہ نئی اصناف سخن تھیں جن سے میراجی
 نے اپنی نئی شاعری کا بندر بنی آباد کیا۔ اس حقیقت و احساس میں تجبوتی اخلاقیات کو
 توڑنے کا جذبہ بھی شامل تھا اور جدید نفسیات سے زندگی میں بنی پہلو کی بنیادی اہمیت کا شعور
 بھی شامل تھا۔ ہماری شاعری نے اس پہلو کو اب تک نظر انداز کر کے رسمی اخلاقیات کا ساتھ
 دیا تھا۔ میراجی نے اسے بھی توڑ دیا۔ اس نئے بندر بنی کے لفظیات کی نئی دنیا آباد ہوئی۔
 رموز و کنایات، طبیعیات و علامات بھی نئے آئے اور یہ سب چیزیں نئی ہیئت اور آزاد
 نظم کے چمکے میں کھل گئیں۔ اس سے طرز و اسلوب، زبان و میان سب بدل گئے، انہی
 سپاہیوں اور نئی حقیقتوں کے اظہار نے شعری گرفت کو مضبوط کر دیا۔ یہ یقیناً وہ شاعری نہیں

نئی، اردو شاعری کے قارئین جس کے عادی تھے۔ جو لئیر اور ملانے سے ملاقات اور شعری پیکروں کے احتمال کا جو شعور میراجی نے حاصل کیا تھا اسے نئی اردو شاعری کے قالب میں ڈھال دیا اور انسان کی داخلی دنیا کی بے باک خواہشات اور رنگ، سچی، حقیقی تصویروں کو اپنی شاعری میں جرأت رندانہ کے ساتھ اُجاگر کر دیا۔ اسی کے ساتھ نئی نظم و داخلی جذبات اور نفسیاتی حقیقتوں کا اظہار بن گئی۔ مغربی طرز احساس کا اپنے تہذیبی طرز احساس کے ساتھ تخلیقی سطح پر جو امتزاج میراجی نے کر دکھایا وہ اتنا مشکل اور بڑا کام تھا کہ یہ کام کسی اور سے نہیں ہوا۔ فیض نے یہ کام نہیں کیا۔ راشد نے بھی یہ کام نہیں کیا۔ ان کا تعلق غزل کی روایت سے کسی نہ کسی شکل میں باقی رہتا ہے اور ماوراء کی شاعری میں تو اثر شیرانی اور اردو غزل و شاعری کا کس و اثر بہت نمایاں اور گہرا ہے۔ اسی امتزاج، نئی سبک نئے شعور شاعری نئے موضوعات، نئی علامات اور لفظیات نے میراجی کی شاعری میں ابہام کو جنم دیا۔ جب ہر چیز نئی ہو، جب دو طرز احساس تخلیقی سطح پر شیر و شکر ہو رہے ہوں، جب نئی ہیئت میں قدیم طرز احساس یا قدیم ہیئت میں نیا طرز احساس نمودار ہوتا ہو تو ابہام ایک فطری عمل ہے۔ جب میراجی نے شاعری شروع کی تھی تو یہ ابہام بہت گہرا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے یہ عام شعور کا حصہ بنتا گیا ابہام کا رنگ بھی ہلکا پڑتا گیا اور آج جب ہم اس شاعری کو پڑھتے ہیں تو یہ زیادہ رواں، صاف اور پُر اثر نظر آتی ہے۔ آج اس رنگ نے نئی نسلوں کی شاعری میں اُتر کر اپنی اجنبیت دور کر دی ہے۔

اس ابہام کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ جنس ان کے اس پہلے سفر کی شاعری کا نمایاں پہلو ہے۔ میراجی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ”میری نظموں کا نمایاں پہلو ان کی جنسی حیثیت ہے۔ جنس کے بارے میں یہ بات واضح رہے کہ جنس ابہام کے پردوں میں چُھپ کر ہی جمائاتی سطح کو چُھو سکتی ہے۔ میراجی نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت جنس کی بات کرتا مرد و اخلاقیات کی سطح پر ایک ناپسندیدہ فعل تھا۔ اردو شاعری میں محبوب اس لیے بھی مذکر تھا کہ پردہ نشین محبوب کے پردہ کا پورا خیال رکھا جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اردو شاعری کا

محبوب کہاروں کے کاندھوں پر ڈولی میں سفر کرتا تھا۔ اسی زمانے میں اختر شیرانی نے پہلی بار عورت کا نام لے کر اظہارِ عشق کیا۔ بدلے ہوئے مزاج کی حدی میں یہ ایک نیا اندازِ سخن تھا۔ سلمیٰ اور بیچانہ کے ساتھ اختر شیرانی کی شاعری بھی شہرت کے بام پر چڑھ گئی لیکن غور سے دیکھیے تو اختر شیرانی کے ہاں بھی محبوب کا حرف نام ہی لیا گیا تھا۔ جنس اس کا موضوع ہی نہیں تھا۔ میراجی نے نہ صرف عورت کو بلکہ جنس کو اردو شاعری میں داخل کیا اور ہمارے شعور کا حلقہ بنا دیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ

”جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو میں قدرت کی بڑی نعمت سمجھتا ہوں اور جنس کے گرد جو آلودگی تہذیب و تمدن نے جمع کر رکھی ہے وہ مجھے ناگوار گذرتی ہے اس لیے ردِ عمل کے طور پر میں کونیا کی ہر بات کو جنس کے اس تصور کے آئینے میں دیکھتا ہوں جو فطرت کے عین مطابق ہے اور۔۔۔ جو میرا آدرش ہے۔“

یہاں دو لفظ ”ردِ عمل“ اور ”آدرش“ قابلِ توجہ ہیں۔ ردِ عمل سماج اور اس کی اقدار کے خلاف اور پھر علمِ بغاوت بلند کر کے اس اظہار کو اپنا آدرش بنانا۔ اس سفر میں میراجی نے ہندی شاعری کی طرف رجوع کیا جہاں اظہارِ عشق عورت کرتی ہے۔ جہاں ایک طرف کوشن مراری اور گوپیوں کی جمالیاتی و جنسی روایت موجود تھی اور ساتھ ساتھ بارہ ماسرہ کی روایت بھی موجود تھی۔ جہاں موسموں کے تعلق سے فطری جنسی اضطراب اور تقاضوں کا اظہار کر کے پیا کو یاد کیا جاتا ہے۔ یہ سفر اور یہ موضوع زندگی کے وسیع داخلی رشتوں کے حوالے سے ایک نیا سفر تھا۔ میراجی جب اس راستے پر چلے تو ایک طرف اختر شیرانی کی شاعری فضا میں تحلیل ہو گئی اور جنس میراجی کی انفرادیت بن کر ان کی شاعرانہ شہرت کا نشان بن گئی۔ اسی لیے میراجی نے علامات، تطبیحات و کنایات ہندی شاعری سے لے کر اسے اردو شاعری کی روایت میں جذب کر دیا اور جنس کو ابہام کے لطیف پردوں میں چھپا کر ایسی شاعری کی جیسی کہ وہ ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب انگارے شائع ہوا جس میں جنس کو موضوع بنایا گیا تھا اور معاشرے نے نشر میں یہ بے باکی دگت خانی دیکھ کر اسے ضبط کر لیا تھا ابہام

کے پردوں میں چھپی ہوئی میراجی کی شاعری کو ضبط کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس پس منظر میں دیکھئے تو میراجی کی شاعری کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ راشد و فیض کی شاعری کا باقاعدہ سفر ہی اسی زمانے میں شروع ہوتا ہے۔ لیکن اس موضوع، نئی ہیئت اور آزاد نظم کے شعوری و خفیی سطح پر استعمال کے پیش رو میراجی اور صرف میراجی ہیں۔ راشد و فیض انہما و بیان میں اردو وقاری روایت سے استفادہ کر کے اپنا رشتہ اس سے قائم رکھتے ہیں لیکن میراجی اس روایت سے بغاوت کر کے رد عمل کے طور پر ہندی شاعری کی روایت سے نانا جوڑ لیتے ہیں۔ ڈی ایچ لارنس، لودویگ اپگرالین پڑ ملارے اور فریڈرک کی جدید نفسیات کو اردو ادب کے مزاج و رنگ میں شامل کر دیتے ہیں۔ منٹو بھی اپنے مخصوص انداز میں اپنے افسانوں مثلاً کالی شکار، اڈھواں وغیرہ میں اس رجحان کی ترجمانی کرتے ہیں۔ عصمت چغتائی کا انسانہ لہجہ، حسن عسکری کا افسانہ پھسلن بھی اپنے طور پر یہی کام کرتا ہے لیکن میراجی کا کام ان سب سے بڑا تھا۔ اس سلسلے میں خاص طور پر آپ ان کی نظمیں: ”دکھ دل کا دارو“، ”سرگوشیاں“، ”سجواں سرسراہٹ“، ”دور و نزدیک“، ایک تصویر تین آسانی، ”اب جو بارے“، ”مگ آتے“، ”افتاد و غیور پڑھ بیسیے۔ روزن“، ”کھڑکی“، ”دروازے“ جنس ہی کے اشارے ہیں۔ میراجی نے اس شاعری سے اردو شاعری کو نئے امکانات سے روشناس کر کے نئے امکانات کے دروازے کھول دیے۔ اسی لیے وہ آج بھی اہم شاعر ہے۔ اس سلسلے عمل میں انھوں نے اردو شاعری کی روایت سے پورے طور پر نانا نہیں توڑا بلکہ اسے بدل کر ایک نیا روپ دے دیا۔ روایت کے بدلنے کے عمل میں جب صورت و احساس بدلنے میں تو روایت سے دور ہونے یا اس کے ٹوٹنے کا احساس ضرور ہوتا ہے لیکن جب نیا احساس پائی ہیئت مروج ہو جاتے ہیں تو پھر روایت کی کرنیں اس میں سے بھوٹنے لگتی ہیں اور وہ روایت ہی کا نیا روپ نظر آنے لگتی ہے۔ میراجی کے ہاں یہی ہوا ہے۔ آپ میراجی کی نظموں کو پڑھتے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ اردو شاعری نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ یہ فرد کہیں گے کہ یہ روایتی اردو شاعری سے مختلف شاعری ہے۔ میراجی نے قافیہ کی پابندی بھی کی ہے اور اسے توڑا بھی ہے۔ نظم محری کو بھی استعمال کیا ہے اور

نظم آواز کو بھی۔ ہیئت کے بھی تجربے کے ہیں اور اظہار احساس کے بھی۔ یہ وہ کام ہے جو آگے چلنے کی رو یا دوسرے زیادہ نہیں کرتی ہیں۔ میراجی نے ایک مختصر سی زندگی میں یہ سارا کام خود کر دکھایا اور ۱۹۴۹ء میں جب وہ مرے تو نئی شاعری مقبول و عام ہو کر نئی نسل کا حصہ بن چکی تھی۔ ۱۹۴۴ء کے قریب ان کا پہلا سفر مکمل ہو چکا تھا۔ ان کا پہلا مجموعہ ”میراجی کی نقوش“ جو اس سفر کی یاد دہانہ ہے، ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا۔

اس سفر میں خود میراجی نے ورائی اور تنہائی کے علاوہ کچھ نہ پایا۔ اس سفر کو پورا کر کے اب وہ ”دوسرے سفر“ کی تیاری میں لگ گئے۔ پہلے سفر میں اس سے زیادہ آگے جانے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ میرے پاس ایک نقشہ ہے جس کی ایک نقل بیدار بخت صاحب نے اختر الایمان سے لے کر مجھے بھجوائی ہے۔ اس نقشے میں میراجی اپنے نئے مجموعے مرتب کرنے پر غور کرتے نظر آتے ہیں اور ان مجموعوں میں وہ کلام شامل کرنا چاہتے ہیں جو ۱۹۴۳ء — ۱۹۴۷ء تک انھوں نے کہا تھا۔ اس نقشے میں وہ اپنی پہلی نظموں یعنی ”میراجی کی نقوش“ پانچ خانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ خانہ نمبر جنسی، خانہ نمبر دوہم، خانہ نمبر تین، رومانی، خانہ نمبر چار ذاتی اور خانہ نمبر پانچ نام نہاد ترقی پسند۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس تقسیم میں جنسی نقوش کم و بیش صرف بیس فی صد ہیں۔ ”میراجی کی نقوش“ سے بعد کے کلام میں ”جنس“ پوری زندگی کی اکائی کا جزو لاینفک بن کر داخل جذبہ بن جاتی ہے اور میراجی کا راستہ نہیں روکتی۔ اب وہ زندگی کو ایک نئے زاویے سے دیکھتے ہیں اور ”عمل“ کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں۔ عمل تغیر کا شواہد ہے۔ عمل سماج کو انجماد سے حرکت کی طرف لے جاتا ہے۔ اور بیٹے دن رات بن کر میراجی کے سامنے آتے ہیں :

میلے کپڑے کی طرح تلکی ہوئی تصویریں

بیٹے دن رات مرے سامنے لے آتی ہیں

.....

بات کیا ہے کہ وہ جیون جس کو

مشحول اپنے اجالے ہی سے دکھلاتی تھیں

دوبہاں کی لہر کے کرم جھکولے ہی سے جاگ اٹھا ہے
رات چھائی تھی مگر

رات بھی دن کی طرّت نو کو لے آئی ہے نہ

میراجی کی نظم "اجتا کے غارتی قوت عمل کا اظہار ہے۔ اسی نظم کے ہم سے وہ اپنا نیا مجموعہ "سلام مرتب کرنا چاہتے تھے۔ اس مجموعہ کا دبا چھپسی انھوں نے لکھنا شروع کیا تھا۔ اب ویرانی چھٹ جاتی ہے اور امید کی نئی کرن جگمگانے لگتی ہے۔ نظم "ایک منظر" کی یہ چند سطریں دیکھیے۔

میراجی ہم سے کیا کہہ رہے ہیں :

ابھی اچانک ایک پل میں ایک نوحہ ایک نغمہ بن کے ایسے گونج اٹھے گا
کہ دل کہے گا "میں بھی ہوں !"

ابھی اچانک ایک پل میں اس پہاڑ ہی کے پار موت کی گھٹاسٹ کے جا پھپھے گی
اور حیات کی دھمک بھی جگمگائے گی۔

ان کی ایک اور نظم جس کا عنوان ہی "ایک نظم" ہے اس بات کا اظہار ہے کہ وہ اب سچ سے مل کر ایک ہونے کی گہری تخلیقی خواہش رکھتے ہیں :

ایک نظم

اے پیارے لوگو !

تم دور کیوں ہو ؟

کچھ پاس آؤ ،

آؤ کہ پل میں

یہ سب ستارے

تار کیوں کے

اس پار ہوں تجھے

اے پیارے لوگو!
میں تم سے مل کر
بہتر بنوں گا،
ایسے اکیلے

یوں روتے روتے
آنسو ہیں گے
اور کچھ نہ ہو گا
تم پاس آؤ
پھر دیکھ لیں گے
دنیا ہے کیا کچھ
اور دین کیا ہے
پھر جان لیں گے
ہر سانس کیسے
آ نکھیں جھپکتے
اُن مٹ بنا تھا

لیکن محبت
یہ کہہ رہی ہے
ہم دور ہی دور
اور دور ہی دور
چلتے رہیں گے - اللہ

یہ بات قابل ذکر ہے کہ آخری ہند میں تذبذب موجود ہے۔ نظم ”بہاؤ“ میں میراجی زندگی کے آثار چرچاؤ اور نشیب و فراز کو پیش کر کے زندگی کی تعبیر بنا کر واضح کرتے ہیں۔ یہاں بھی قوت عمل اپنا اظہار اور موت پر زندگی کے غالب آنے کی خواہش کا اظہار کر رہی ہے :

گذرتی رہی زندگی جس طرح
گھٹتے ہوئے ریگتے ریگتے
جب آئے تو کاش آئے موت اس طرح
گھٹتے ہوئے ریگتے ریگتے

میں اک ہل میں اس کا گلا گھونٹ کر
گھٹتے ہوئے ریگتے ریگتے
بڑھوں گا اسے چھوڑ کر پشت پر
گھٹتے ہوئے ریگتے ریگتے ۲۹

دریائے مل کر ساگر بننے کی خواہش بھی اسی نئے احساس کا اظہار ہے جس کا اظہار نظم ”پردہ“ میں ہوا ہے :

پھر ساگر میں مل جاتے ہم
اور مل کر دھوم مچاتے ہم
یہ غیت ہمیشہ گاتے ہم
”سب گیتی ہی اٹھنا ہے“
لیکن کیا ہو

جب ایسا ہو

ہم اور دیں تم اور دیں

”ستھانی ایک دل چسپ نظم ہے جس میں وہ سکون سے ہنگامے کی طرف جانا چاہتے ہیں۔

سکون انجام دے اور ہنگامہ عمل حیات ہے :

سکون دور ہو جائے، ہنگامہ پیدا ہو، ہنگامہ شور و غصہ بنے
سامنے آئے، پہل میں سکون دور ہو جائے لیکن
مرے دل کے گہرے سکون میں جو امر سرانے لگی ہے اُسے
نظم ”یگانگت“ میں میراجی کے ان یہ احساس جاگنا ہے کہ جو شے اکیلے رہے اس
کی منزل فنا ہی فنا :

زمانہ ہوں میں، میرے ہی دم سے اُن مٹ تسلسل کا تجو لارواں ہے،
مگر مجھ میں کوئی برائی نہیں ہے
یہ کیسے کہوں میں

کہ مجھ میں فنا اور بقا دونوں آکر ملتے ہیں ۱۹۳۷ء

یہ میراجی کا سفر واپسی تھا جو ۱۹۳۳ء میں شروع ہوا اور ۱۹۳۸ء تک جاری رہا
اور انھوں نے اپنی وضع کردہ نئی روایت شعری کو اردو شاعری کی روایت کے ساگر سے
ملا دیا، لیکن اس تخلیقی سفر میں وہ بڑھال ہو چکے تھے، ڈکھ بھو گئے، گھٹے گھٹے
رینگتے رینگتے، ۱۰ ہسپتال میں انھوں نے ایک نرس کی کلانی چھا ڈالی۔ جب میراجی کو بھلنے
کی کوشش کی گئی تو انھوں نے کہا کہ وہ ایسا علاج پسند نہیں کرتے جس سے ان کے ”کمپلیکسز“
Complexes ختم ہو جائیں اور جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں وہ نہ لکھ سکیں۔ ۱۹۳۷ء تخلیق
تخلیق۔ یہی میراجی کا اردو شاعر ساری عمر وہ اسی کے حصول میں لگے رہے اور اردو شاعر کی
نئی حیثیت نئے موضوعات نئے جذبے نئے احساسات سے مالا مال اور اسے جدید دور میں
داخل کر کے بمبئی کے ایک ہسپتال میں رہ گئے۔ راشد نے میراجی کی وفات کے تقریباً بیس سال
بعد اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ میراجی اس زمانے کے سب سے قابل ذکر اسب سے زیادہ
جدت پرست اسب سے زیادہ لادخیز ذہن کے مالک اور سب سے منفرد شاعر تھے بلکہ میں نے
آج کی نگاہ میں اسی میراجی کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔

حوالے

- ۱۔ مشرق و مغرب کے نئے ، میراجی ، اکادمی پنجاب (ٹرسٹ) لاہور ، ۱۹۵۸ء ، ص ۸۔
- ۲۔ ”میراجی“ خلیل حسینی ، فزون لاہور ، اکتوبر ۱۹۶۵ء ، ص ۱۹۵-۲۰۰
- ۳۔ ”تین گولے“ سعادت حسن منٹو ، ”گنگے فرشتے“ مکتبہ جدید لاہور
- ۴۔ میراجی ایک قصور ، الطاف گوہر ، ”تحریریں چند“ اسلام آباد ۱۹۸۸ء ، ص ۱۰۵
- ۵۔ ”میراجی کی شخصیت“ ایضاً ، ص ۱۱۳
- ۶۔ ”میراجی کو بچنے کے لیے“ ڈاکٹر جمیل جاہلی ، تنقید اور تجربہ ، مشتاقی بک ٹراپ کراچی ۱۹۹۷ء اور نیلا دور کراچی شمارہ ۲۱۰-۲۲۰۔
- ۷۔ ”دیباچہ“ اس نظم میں ، ”میراجی“ ساقی بک ٹراپ ، دہلی ۱۹۴۳ء ، ص ۱۱
- ۸۔ مشرق و مغرب کے نئے ، میراجی ، ص ۱۶۲
- ۹۔ ”میراجی“ ، اخلاق احمد دہلوی ، پھر وہی بیان اپنا ، مکتبہ عالیہ ، لاہور ۱۹۷۵ء ، ص ۱۷۵-۱۷۶
- ۱۰۔ ”مشرق و مغرب کے نئے“ ، ص ۱۷۳
- ۱۱۔ ”شعر و حکمت“ مرتبہ ڈاکٹر مفتی تبسم حیدر آباد دکن ۱۹۸۸ء ، ص ۹۳-۹۵
- ۱۲۔ ایضاً ، ص ۱۰۶-۱۰۷
- ۱۳۔ ایضاً ، ص ۲۳۰
- ۱۴۔ ایضاً ، ص ۲۳۲
- ۱۵۔ ایضاً ، ص ۲۳۰
- ۱۶۔ ایضاً ، ص ۲۳۱
- ۱۷۔ ”میراجی کو بچنے کے لیے“ ڈاکٹر جمیل جاہلی ، تنقید اور تجربہ ، ص ۲۳۰
- ۱۸۔ کلیات میراجی ، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جاہلی ، اردو مرکز لندن ۱۹۸۸ء ، ص ۱۰۸-۱۰۹
- ۱۹۔ میراجی کی نقیص ، میراجی ، ساقی بک ٹراپ ، دہلی ۱۹۴۳ء ، ص ۱۲

- ۳۰ شعر و حکمت ، ص ۱۰۲
- ۳۱ ایضاً ، ص ۱۰۳
- ۳۲ میری بہترین نظم مرتبہ محمد حسن عسکری ، ساقی بک ڈپو دہلی ۱۹۴۳ء
- ۳۳ کلیات میراجی مرتبہ ڈاکٹر جمیل عالمی ، اردو مرکز لندن ۱۹۸۸ء ، ص ۳۳-۳۴۔
- ۳۴ میری بہترین نظم مرتبہ محمد حسن عسکری
- ۳۵ میراجی کی نظمیں ، میراجی ، ساقی بک ڈپو ۱۹۴۳ء ، ص ۱۲-۱۵۔
- ۳۶ کلیات میراجی ، اجٹا کے قمار ، ص ۱۷۸-۱۸۹۔
- ۳۷ ایضاً ، ص ۱۹۵-۱۹۶۔
- ۳۸ ایضاً ، ص ۱۹۷-۱۹۸۔
- ۳۹ ایضاً ، ص ۲۰۱-۲۰۲۔
- ۴۰ ایضاً ، ص ۲۰۵-۲۰۶۔
- ۴۱ ایضاً ، ص ۲۰۹-۲۱۰۔
- ۴۲ ایضاً ، ص ۲۳۷-۲۳۸۔
- ۴۳ میراجی کے ساتھ ایک شام ، انٹرویو اختر الایمان مرتبہ تصدق سہاروی ، مطبوعہ شب بخون ، الہ آباد ، دسمبر ۱۹۹۷ء شمارہ ۶۷ ، ص ۵۷۔
- ۴۴ ایضاً ، ص ۵۵۔

حسن عسکری کے افسانے

محمد حسن عسکری کو پہلی بار میں نے اس وقت دیکھا جب وہ عارضی طور پر انگریزی پڑھانے کے لیے میرٹھ کالج آئے تھے۔ شیروانی پہنچے ہوئے۔ پان کی لالی سے ہونٹ رچے ہوئے، ہاتھ میں کتابیں، آنکھوں پر عینک اونچی پیشانی تیل سے جھے ہوئے بال اور مانگ نکلی ہوئی یہ ہوا رنگ، چمکتی روشنی آنکھیں، چہرے پر بخیدگی، پھر برا بدن، دلے پتلے، خاموش، کھوٹے کھوٹے سے۔ اپنے خیالات میں مگن۔ ہمیشہ بہت کلاس سے نکل کر اساتذہ کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ کسی نے بتایا کہ یہ حسن عسکری ہیں۔ میں نے پوچھا وہی عسکری صاحب جن کے افسانے ساقی، ادیب لطیف اور ادبی دنیا میں شائع ہوتے ہیں اور وہ جو ہر جیسے "ساقی" میں "بھگلیاں" لکھتے ہیں۔ بتانے والے نے کہا کہ یہ تو معلوم نہیں البتہ یہ مشہور ادیب ہیں۔ میں نے انھیں حیرت و حمت سے دیکھا۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ میں تھوڑا بزرگ طالب علم تھا۔ شوق ادب و زندگی کا محور تھا اور ادیب بننے کا خواب زندگی کی تصویر تھی۔ عسکری صاحب کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا کہ ادیب کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ ان کے کہنے سے میرٹھ میں جیل پہل ہی ہو گئی۔ دائرۃ ادیب کی نشستوں میں گرمی آگئی۔ جیسے جیسے وقت گذر عسکری صاحب سے تعلقات بڑھنے لگے۔ کالج میں ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی پڑھاتے تھے اور پروفیسر کرا حسین اور پروفیسر غفور احمد رزمی بھی۔ صفحہ حسین ایم اے کر چکے تھے۔ قیصر زیدی ان سے بھی پہلے تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ انتظام حسین ایم اے کے آخری سال میں اور سلیم احمد ایف اے میں پڑھ رہے تھے۔ احمد بھٹانی بھی کالج میں تھے عسکری صاحب فرسٹ ایئر کی کلاس جیتے تھے جو بہت بڑی تھی۔ ان کی آواز چلتی اور پڑھانے کا بھی شہ پہلا تجربہ تھا۔ لڑکے طرح طرح کی شرارتیں کرتے۔ شور مچاتے اور وہ سب کچھ کرتے جو انہیں نہیں

کرنا چاہیے۔ ہم سب نے طے کیا کہ جب عسکری صاحب کلاس میں جائیں تو ہم سب مختلف دروازوں پر کھڑے رہیں اور کچھ اندر جا کر بیٹھ جائیں تاکہ ان کی اخلاقی مدد کی جاسکے۔ کچھ ہفتے اسی طرح گزرے اور پھر فخر الاسلام صاحب واپس آ گئے جن کی خصوصی عسکری صاحب کام کر رہے تھے۔ عسکری صاحب کالج سے تو الگ ہو گئے لیکن میرٹھ ہی میں رہے۔ محلہ مشائخان میں ان کا قیام تھا۔

۱۹۳۶-۱۹۳۷ء میں عسکری صاحب نے پروفیسر احتشام حسین کے ایمان پر اردو تحریک کی تیاری کی۔ رسیدی چھپیں، چندہ جمع ہوا لیکن ابھی جیسے کام پروگرام بن رہا تھا کہ گروہ منکشیشر میں ہندو مسلم فسادات ہو گئے۔ بہار، کلکتہ اور دہلی کے فسادات نے سارے بڑے عظیم کی صورت حال کو بدل کر رکھ دیا اور پنجاب کے فسادات نے رہی بھی کمر کو پورا کر دیا۔ پاکستان زندہ باد کے نعرباب بہت قریب سے سنائی دینے لگے تھے۔ اسی زمانے میں عسکری صاحب نے اپنا ایک مضمون ”میری“ دائرۃ ادبیہ میں پڑھا۔ یہ آخری نشست تھی جس میں شریک تھا۔ مضمون کے بعد بحث کا آغاز ہوا۔ پروفیسر شوکت سہزاداری مناظرہ کے ماہر اور سارے شہر میں منطقی مشہور تھے۔ انھوں نے تار تار عسکری صاحب کے مضمون پر اعتراضات کیے اور عسکری صاحب کو اس طور پر گھیرا کہ نکلنا مشکل ہو گیا۔ عسکری صاحب کچھ دیر تو بحث میں شریک رہے۔ آخر میں زحیٰ آکر کہنے لگے: ”سہزاداری صاحب! آپ سے بحث کرنے سے بہتر تو یہ ہے کہ آدمی مانتھا سوتے۔“

۱۹۳۷ء کے اوائل میں عسکری صاحب نے ایک افسانہ لکھا۔ اس کا ذکر وہ کتنی ہفتے سے کر رہے تھے۔ ہم نے کئی بار عسکری صاحب سے افسانہ سنانے کی فرمائش کی لیکن وہ ہر بار طرح دے گئے۔ یہ وہی افسانہ تھا جو اسی سال ”دوا اور افسانوں کے ساتھ“ ”قیامت بھر کا آب آئے نہ آئے“ کے نام سے کتابی صورت میں ساتی بک ڈپلے سے شائع ہوا۔ اس وقت تقسیم ہند کا اعلان ہو چکا تھا اور فسادات کی آگ چاروں طرف بھڑک رہی تھی۔ یہ کتاب بھی فسادات کا شکار ہو گئی۔ چند کاپیاں پاکستان ضرور پہنچیں اور ختم ہو گئیں۔ ”قیامت بھر کا آب آئے نہ آئے“ عسکری صاحب کا آخری افسانہ تھا۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان آ گئے اور لاہور میں ٹک گئے۔ اس کے بعد انھوں نے کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ وہ از سر تا پا پاکستانی فکر کے حامل تھے جس کا اندازہ اُن خطوط سے بھی کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے ڈاکٹر آفتاب احمد خان اور صدر شاہین و ممتاز شیریں کے نام لکھے اور جواب تخلیقی ادب اور نیا دور کراچی میں شائع ہو چکے ہیں۔

عسکری صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ”شاید میری فطرت کے آریائی اور سامی عناصر ایک دوسرے سے متصادم ہو رہے ہیں۔ ایک طرح سے یہ جنگ کج کل پوری دنیا میں جاری ہے لیکن“ آذری کا زمانہ گنے تک سلجھ کر کی حفاظت کے لیے شاید سائیت ہی کچھ زیادہ مفید ہے۔ ادب میں بھی (اختتامیہ، جزیرے ص ۲۷) پاکستان آکر عسکری صاحب نے اسی فکر کو گنے بڑھایا۔ پاکستانی ادب کی شناخت کی بحث اسی انداز نظر کا نتیجہ تھی اور اُس کے بعد جو کچھ انھوں نے لکھا اس میں سامیت کا عنصر بڑھتا اور گہرا ہوتا گیا اور وہ افسانہ نگاری سے دور اور فکر و خیال سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔

حسن عسکری کے افسانوں کی کل تعداد گیارہ ہے۔ ۲ اٹھ افسانے ”جزیرے“ کے نام سے ۱۹۴۳ء میں ساتھی بک ٹریڈرٹی سے شائع ہوئے جس میں ستمبر ۱۹۳۹ء سے فروری ۱۹۴۳ء تک کے افسانے شامل ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں اُن کا دوسرا مجموعہ ”قیامت ہر کتاب گئے ذکے“ کے نام سے شائع ہوا جس میں تین ”افسانے“ شامل ہیں۔ ”ذکرِ اوز“ اور ”گٹھلیوں کے“ نام۔ ۱۹۴۳ء میں لکھے گئے اور تقریباً سو تین سال بعد ان کا آخری افسانہ لکھا گیا جس کے نام پر کتاب کا نام لکھا گیا ہے۔ گویا ستمبر ۱۹۳۹ء سے فروری ۱۹۴۷ء تک تقریباً ساڑھے سات سال کا عرصہ حسن عسکری کی تخلیقی زندگی کا افسانہ دور رہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء سے وفات (۱۹۷۷ء) تک کوئی افسانہ نہ لکھنے کے باوجود، اُن کے افسانوں کے حوالے اور ان کا ذکر مختلف مضامین میں آتا رہا اور عسکری ہمیشہ افسانہ نگار ہمیشہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے رہے۔ ان کے افسانے جدید اردو افسانے کی تاریخ کا ناگزیر حصہ ہیں۔ شعور کی رو سے وہ بنیادی ٹیکنیک

ہے جسے عسکری نے زحرف متعارف کرایا بلکہ نہایت خوبی سے سمجھا کر اردو فکشن کے لیے نیا۔
راست کھولا اور اردو افسانے کو مغرب کے افسانے کے (دماغ میں داخل کر دیا) "حرام جادی" (۱۹۴۷)
اور چائے کی پیالی" (۱۹۴۸) اس تکنیک کی بہترین مثال ہیں۔ ۱۹۴۷ء کو سلسلے سے رکھ کر اس
کے بعد افسانے اور فکشن کو دیکھتے تو آپ کو اس تکنیک کے واضح اثرات نظر آئیں گے۔ اردو
افسانہ میں حسن عسکری کی یہی تاریخی و تخلیقی اہمیت ہے۔

عسکری کے افسانوں کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان میں پلاٹ نہیں
ہوتا لیکن داخلی و خارجی کیفیات کا حقیقت پسندانہ جزئیاتی اظہار ایسے توازن سے
ضمیر و شکر ہو جاتا ہے کہ "پلاٹ" نہ ہوتے ہوئے بھی "کہانی" پورے خود و خال کے ساتھ ابھر کر
قاری کو گرفت میں لے لیتی ہے۔ اسی کے ساتھ تنہائی کا احساس، نفسیاتی کش مکش اور
جنسیت کا فطری اظہار ایک طرز افسانے کی فضا میں رنگ بھرتا ہے اور دوسری طرف
ان کرداروں کو ابھارتا اور نمایاں کرتا ہے جن کے ارد گرد افسانے کا تار و پود
بُنا گیا ہے۔ اسی لیے "حرام جادی" کی آئلی اور "چائے کی پیالی" کی ڈولی ہمارے ذہن
پر نقش ہو جاتے ہیں۔

حسن عسکری کے افسانوں کے اسلوب میں حقیقت نگاری، اشاریت اور تخیل سب
کچھ ایک ساتھ ملے جلے ہوتے ہیں۔ یہ روایتی معنی میں رواں اسلوب نہیں ہے بلکہ ایک
آہستہ رد اسلوب ہے جس میں توازن بھی ہے اور شہر آؤ اور ضبط بھی پہلی نظر میں یہ
کھردرا اور خشک سا دکھائی دیتا ہے لیکن دراصل یہ اس مخصوص تکنیک کے فنی تقاضوں کے
محافظ سے کیٹا اسلوب ہے۔ اس میں زبان و بیان، روزمرہ و تلفظ و لہجہ بھی وہی استعمال
کیا گیا ہے جو اس کردار کی پوری طرح ترجمانی کر سکے۔

حسن عسکری نے تجزیے کے اہتمام میں لکھا ہے کہ "اب اردو ادب کو تخلیق کے
زیادہ تنقید کی ضرورت ہے" اور یہ بھی لکھا ہے کہ تخلیق اور تنقید جہاں مل کر ایک ہو جاتی
ہیں وہ کیریئر کچھ اور بہرہ ڈی ہے۔ تخلیق اور تنقید کے اس اتحاد کی ایک مثال ان کا
افسانہ "میلا دشمن" ہے۔ "گٹھلیوں کے دلم کو بھی اسی ذیل میں رکھا جاسکتا ہے اور

دوسری بہتر مثال ”ذکر افروز“ ہے۔ پیروڈی کا وہ راستہ جو حسن عسکری نے ۱۹۴۳ء میں دکھایا تھا آج بھی اسی طرح کھلا ہے اور کسی ایسے نئے ذہن کا منتظر ہے جو تخلیق اور تنقید کو ملا کر پیروڈی کی سطح پر ایک کر سکے۔

حسن عسکری کے افسانوں کے دو فزں مجموعے گزشتہ چالیس سال سے کم یاب بلکہ نایاب تھے۔ اردو ادب کی نئی نسل ان افسانوں کی تاریخی اہمیت اور گہرے فنی اثرات سے کم و بیش ناواقف ہے۔ اب جو یہ افسانے ”محمد حسن عسکری کے افسانے“ کے نام سے چھپ کر دوبارہ سامنے آ رہے ہیں میرا خیال ہے کہ اردو افسانے کے تعلق سے حسن عسکری کی تاریخی خدمات کا دوبارہ چرچا ہو گا اور ہمارے نئے افسانہ نگار یہ بھی دیکھیں گے کہ تنقیدی شعور سے جدید اردو افسانے کو کاٹ کر ہم نے ”علامت“ کو کیسی گہری کھائی میں دھکیل دیا ہے۔ حسن عسکری کے افسانے اس کھائی سے نکلنے میں ہماری مدد کریں گے۔

(۲۰ مئی ۱۹۸۷ء)

افسانہ نگار ابو الفضل صدیقی

جناب ابو الفضل صدیقی اروز بان کے وہ ممتاز افسانہ نگار ہیں جن کے ذکر کے بغیر اسد و افسانے کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی لیکن اس دعوے کے باوجود ان کا تذکرہ عام تنقید کی مضامین میں اتنا کم آتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کی کہانیاں عام طور پر طویل یا مختصر طویل ہوتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کے افسانے برصغیر پاک و ہند کے رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں اور ان کا صرف ایک حصہ چار مجموعوں کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ ایک مجموعہ ”اہرام“ کے نام سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا اور اس کے ۴۳ سال بعد ان کے ایک ساتھ تین مجموعے ”آئینہ“، ”انصاف“ اور ”جولامکھ“ کے نام سے او افر ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئے۔ ان تینوں مجموعوں کے صفحات کی تعداد تو ۸۷۷ ہے لیکن ان میں صرف چودہ افسانے شامل ہیں جب کہ ابو الفضل صدیقی نے کم و بیش دوسو سے زیادہ افسانے لکھے ہیں۔ ایک ناول ”تغزیر“ کے نام سے ۱۹۴۶ء میں اور دوسرا ”سرور“ کے نام سے ۱۹۵۶ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس میں کتابت کی اس قدر غلطیاں تھیں کہ اسے پڑھنا آسان نہیں تھا۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں ان کے افسانوں کا ایک اور مجموعہ ”چار ناولٹ“ کے نام سے شائع ہوا جس میں اردو ادب کی چار شاہکار کہانیاں شامل تھیں۔ یہ مجموعہ بھی اب کم پایا ہے۔ ان کے افسانے ”چڑھتا سورج“ کو ہم دنیا کی حکیم کہانیوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ اس پر ابو الفضل صدیقی کو یو ایس کو کابینہ الاقوامی انعام بھی ملا۔ ۱۹۸۳ء میں ان کے افسانے ”محل زمین کی تلاش میں“ کو منقوش صدارتی ایوارڈ ملا۔ ان کا ناول ”خرنگ“ جس کی چھ قسطیں نیا دور کراچی میں آج سے آٹھ دس سال پہلے شائع اور مقبول ہوئیں، ابھی زیر طبع ہے۔ یہ ضخیم ناول نشوونما کے موضوع پر

لکھا گیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اردو میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے مفرد ہے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو ابوالفضل صدیقی کی شکل دس فی صد تحریری کتابی صورت میں شائع ہوتی ہیں اور نوے فی صد تحریری یا نو مختلف رسائل کی زینت ہیں یا ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ صدیقی صاحب خط شکستہ میں لکھتے ہیں اور ان کا مسودہ نئی نسل کے بے علم کاتب عام طور پر پڑھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اسی لیے ان کی اشاعت مدیران کرام کے لیے ایک لاپرواہی مسئلہ بن کر رہ گئی ہے۔ اگر ابوالفضل صدیقی کی سب تحریریں یکجا ہو کر سامنے آجائیں تو آپ سب حضرات میرے اس جملے سے اتفاق کریں گے جس سے میں نے اپنی بات کا آغاز کیا تھا۔

ابوالفضل صدیقی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور پروان چڑھے وہ جاگیردارانہ ماحول تھا جس کا اپنا نظام صدیوں سے برصغیر میں رائج تھا۔ راجہ اور رعیت کا یہ ٹوٹا رشتہ حاکم و محکوم کا رشتہ تھا۔ زمیندار و جاگیردار اس کے نمائندے تھے۔ یہی ماحول ابوالفضل صدیقی کے ہاں پورے شعور اور پورے رچاؤ کے ساتھ اس طور پر آیا ہے کہ ان کے افسانوں میں یہ زندگی پوری طرح چلتی پھرتی اور حقیقی جاگتی نظر آتی ہے۔ اپنی کہانیوں میں انھوں نے ایسے ذوق کردار پیش کیے ہیں کہ یہ کام بہت کم افسانہ نگاروں نے اس انداز سے کیا ہے۔ ابوالفضل صدیقی صاحب کی ان کی نسل میں قاضی عہدست اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اگر آپ کو یہ دیکھنا ہو کہ برصغیر کے دیہات کی حقیقی زندگی کیا تھی۔ وہاں کی تہذیب کی نوعیت کیا تھی۔ اس کا نظام اقتدار کیا تھا۔ وہاں کے لوگ کس طرح سوچتے اور چیزوں اور ان کے رشتوں کو کس طرح دیکھتے تھے تو آپ ابوالفضل صدیقی کے افسانوں کو پڑھ لیجیے۔ وہ آپ کو اس تہذیب کی تہ و ثلث زندگی اس کے مسائل اور کلچر سے پوری طرح روشناس کر لوں گے۔ ہم نے اپنے سماج کی تطہیر کے لیے اب تک ادب کو استعمال ہی نہیں کیا ہے اسی لیے ہم اپنے ادب کی صحیح قدر و قیمت سے بھی پوری طرح باخبر نہیں ہیں۔ یہی جاگیردارانہ تہذیب آج بھی ہمیں پاکستان کے طول و عرض میں اسی صورت میں نظر آتی ہے جس صورت میں وہ ابوالفضل صدیقی کی کہانیوں میں موجود ہے۔

ابو الفضل صدیقی جاگیردار اندماحول کے بہرہ ورہ ضرور ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اس طور پر عوام کی نمائندگی کرتے ہیں کہ انسانیت کا چراغ روشن ہو کر لو دینے لگتا ہے۔ ان کے افسانوں میں انسان زندہ رہتا ہے۔ رحم اور انسانیت کی قدریں ابھر کر سامنے آتی ہیں اور زمیندار، کسان، عوام و خواص کے کردار اپنے حقیقی خدو خال کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ پریم چند نے بھی دیہات کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا تھا لیکن پریم چند کے ہاں صرف پچھلے طبقے کے مسائل عام طور پر ابھر کر افسانے کا تار و پود بنتے ہیں۔ پریم چند کے مقابلے میں ابو الفضل کے ہاں سارا دیہات اپنے پورے طبقاتی نظام کے ساتھ ساری زندگی کو جلتی ہوئی ہے اور دیہات کی زندگی کو پوری واقعیت اور پھیلاؤ کے ساتھ ہمارے سامنے لاکھڑا کرتا ہے۔ انھوں نے خاص طبقے کا فرد جوتے ہوئے بھی عوامی قوتوں کو کامیاب ہوتے دکھایا ہے اور برطنت بات یہ ہے کہ اس میں کوئی نعرے بازی ہے اور نہ کوئی بندھا کا فارمولا ہے۔ زندگی جیسی کچھ ہے اسے تشکیل کی آنکھ سے دیکھ کر پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے لاکھڑا کیا ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد نے ان کے ابتدائی دور کے افسانوں کے بارے میں کچھ سے تقریباً ۵۰ سال پہلے لکھا تھا کہ دیہات کے موضوعات پر لکھنے والوں میں پریم چند کے بعد ابو الفضل صدیقی دوسرے اہم لکھنے والے نئے افسانہ نگار ہیں لیکن ساتھ ساتھ شرننگد کی حیثیت سے وہ پریم چند سے بہتر لکھنے والے ہیں اور ان کا جمالیاتی شعور انھیں ایک مختلف افسانہ نگار بنا دیتا ہے۔ فی الحقیقت یہی ابو الفضل صدیقی کی انفرادیت اور یہی ان کا امتیاز ہے۔

میں اس وقت ابو الفضل صدیقی کی افسانہ نگاری پر تفصیل سے بات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور نہ میں ان کے مخصوص اسلوب اور زبان و بیان کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس وقت تو میں چند نکیریں سمجھ کر ان کا ایک خاکہ آپ کے سامنے پیش کر دیتا چاہتا ہوں۔ ابو الفضل نے ۱۹۳۶ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۹۴۶ء سے وہ مسلسل لکھ رہے ہیں جب ان کا افسانہ "سراج کا شکار" ادبی دنیا لاہور میں شائع ہوا اس وقت دنیا نے

ادب میں دو درجہ ان نمایاں تھے۔ ایک رومانوی رجحان اور دوسرا حقیقت نگاری کا رجحان۔ رومانوی رجحان کے افسانوی ادب کے نمایندہ سجاد حیدر بلیدم، ل احمد سلطان جتوئی اور نیا فتح پوری وغیرہ تھے اور حقیقت نگاری کے نمایندہ پریم چند تھے۔ ابو الفضل صدیقی نے اپنے معاصرین علی عباس حسینی اور اعظم کرپڑی کی طرح یہ دونوں اثرات قبول کیے ہیں لیکن ۱۹۳۶ء کی تحریک کے زیر اثر رومانوی اثر کم ہو گیا ہے اور سماجی شعور طبقاتی تقسیم اور حقیقت نگاری کے اثرات غالب آگئے ہیں۔ ابو الفضل نے اس میں یہ اضافہ اور کیا کہ شر کو کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ زندگی کی حقیقتوں سے ملا دیا ہے۔ اسی لیے وہ دوسرے افسانہ نگاروں سے پہلے بھی مختلف تھے اور آج بھی مختلف ہیں۔ وہ اردو زبان کے بڑے افسانہ نگار ہیں۔

ابو الفضل صدیقی سے قبل تو ہماری پوری صدی کی مخصوص تہذیب اور اس تہذیب کی مخصوص تصویر ان کی باتوں کی لہروں سے وجود پانے لگتی ہے۔ میں انھیں کم و بیش تیس سال سے جانتا ہوں اور میں نے انھیں ہمیشہ ایک ایسا انسان پایا جس کے پاس دل دردمند بھی ہے اور احساس غم گساری بھی۔ چھوٹے بچوں سے وہ ٹوٹ کر پیار کرنے والے۔ میرے ہاں آتے ہیں تو سب سے پہلے بچوں سے ملتے اور ان سے کھیلتے ہیں۔ ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ جب ان سے منٹ لیتے ہیں تو پھر میری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ میری دو سیلیں ان کے سامنے پروان چڑھتی ہیں۔ جب سے ڈاڑھی چھوڑ دی ہے تو کپڑوں سے بے نیاز ہو گئے ہیں ورنہ میں نے ہمیشہ انھیں اہتمام سے سٹے اور سیٹے سے پہنے ہوئے کپڑوں میں دیکھا ہے۔ گھٹنوں سے نیچی ڈھیلی ڈھالی شیر وانی۔ ایک ہرکاسفید پانچامہ سیاہ ٹوپی۔ کلائی پر گھڑی انگلی میں گونشی اور اچھ میں ڈراسا دوال۔ چہرے پر رعب اور متانت قدرے چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ کشادہ پیشانی، ساڈا لارنگ، بڑا ڈانڈا، اچھلی ٹھوڑی، لمبی ناک کسی حد تک لمبوترانچہرو، چھریاں، رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور عمر کی بھریاں چہرے پر پھیلی ہوئی۔ دانت بے دانت۔ ملیں گے تو مسکراہٹ اور خوشی کی روشنی وجود کے افق سے ظاہر ہونے لگے گی۔ باتیں کرتے ہیں تو ایسے جیسے افسانہ سنا رہے ہوں۔ واقعات کے بعد واقعات کا ایک سیل رواں ہوتا ہے۔

شکار کے رہا، ہتھیاروں کے عاشق، گھوڑوں کی ہر اول کے رازوں۔ میں نے ایک ڈائری
 دی اور کہا کہ اس میں گھوڑوں کے اعضا، قسبیں اور سارے سامان کے نام لکھ دیجیے۔ لکھے
 پہنچے گئے تو سینکڑوں الفاظ ڈائری میں درج کر کے دے گئے اور جو باتیں وہ گئیں وہ مفتوں
 زبانی سناتے رہے۔ کہنے لگے کہ میاں! گھوڑا اور بھوڑا ہاتھ پھیرنے سے بڑھتا ہے۔
 شام کو آجائیں تو گھنٹوں بیٹھے اُن لکھے افسانے سنو زبانی سناتے رہتے ہیں۔
 بعض محیر العقول اور بعض ناقابل یقین۔ میں نے اور سیک سفلی زمین نے کئی بار منصوبے بنائے
 کہ ان کی تصدیق کریں گے لیکن جب تصدیق کا موسم آتا تو ہم بھول جاتے۔ ایک دن آئے۔
 کہنے لگے ”میاں! کیا نئے خان بہادر آگئے ہیں؟“ میں نے پوچھا ”خان بہادر؟“۔
 کہنے لگے ”میاں! یہ جو بھونکنے کی آواز آ رہی ہے؟ کیا نئے کتے پال لیے ہیں؟“
 ابو الفضل صدیقی کو گھوڑوں کے علاوہ کتے پالنے کا بھی شوق رہا ہے۔ برسوں ان
 سے شکار کھیلا ہے۔ ہار کے اسٹیشن ماسٹر کو بھی کتے پالنے کا شوق تھا۔ ان کے پاس کہیں
 سے اعلیٰ نسل کے سفید کتوں کا ایک جوڑا آیا۔ ابو الفضل صاحب کو کتے اتنے پسند گئے
 کہ بچوں کی فرمائش کر دی کہ کئی بار کہا مگر اسٹیشن ماسٹر مال مال گئے۔ جب ہالی نمر سے گذر
 گیا تو ابو الفضل صدیقی کے اندر کا زمیندار جاگ اٹھا۔ اس کے کتے چوری کرادیے اور
 جب کتے ان کے پاس پہنچے تو اسی رات ان کے سارے جسم پر گہرا سیاہ خضاب لگوادیا۔
 خضاب ایسا کھلا کہ خود کتے بھی اپنے آپ کو نہ پہچان سکے۔

ایک دن کہنے لگے۔ ”میاں! دیکھو! مرغادو طرح سے اذان دیتا ہے۔ عام مرغادو
 کہتا ہے دانا گاؤں۔ دانا گاؤں۔ لیکن بعض مرغے منحوس ہوتے ہیں اور جب اذان دیتے
 ہیں تو کہتے ہیں چو پٹا گاؤں۔ چو پٹا گاؤں۔ جو مرغادو چو پٹا گاؤں کی ہانگ لگاتا ہے تو اس
 کے مالک سے نہ صرف مرغالے لیا جاتا ہے بلکہ چاول، گھی اور کھویرا بھی لیا جاتا ہے
 تاکہ دباؤں کے تدارک کے لیے اس منحوس مرغے سے نہجات حاصل کر لی جائے۔
 اور میاں! دیکھو! عام طور پر کسان کا مرغادو چو پٹا گاؤں کی ہانگ لگاتا ہے اور زمیندار
 کا مرغادو دانا گاؤں کی۔ پھر میں دیکھا اور شرارت آمیز ہنسی سے ہلکھلا اٹھے۔

پچھلے سال ۱۹۸۶ء میں دو جہیزے ایسی گرمی پڑی کہ ساری خلقت خدا تراہ تراہ
پکار اٹھی۔ ایک دن کہتے۔ کہنے لگے۔ ”میاں! معلوم ہے یہ گرمی اتنی مسلسل اور
اتنی شدید کیوں پڑ رہی ہے؟ یہ لونڈ کا سال ہے اور لونڈ کے سال ’چیت‘ دو جہیزے
کا ہوتا ہے بہت دیر مانتے سے پسینہ پونچھتے رہے اور اس بات کی وضاحت
کرتے رہے۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۷۳ء میں وہ بار بار اس بات کا ذکر کرتے تھے کہ مئی ۱۹۷۵ء
ان کی وفات کا مہینہ ہے۔ ہم نے بہت بچایا۔ کہنے لگے میری پیدائش پر پنڈت نے
جو زانچہ بنایا تھا اس میں یہ لکھا ہے۔ میں نے پوچھا۔ بڑے بھائی! کیا سارے
واقعات اسی طرح صحیح ثابت ہوئے ہیں جس طرح زانچے میں لکھے ہیں۔ کہنے لگے سب تو
ہیں لیکن خاصی تعداد میں صحیح ثابت ہوئے ہیں۔ میں ’مختار زمن‘ ابن الحسن، بیگم سلی
زمن انھیں بچھلتے۔ کچھ اثر بھی ہوتا مگر دو ایک دن میں پھر ڈائل ہو جاتا۔ ۳۱ مئی ۱۹۷۵ء
کی رات کو بارہ بجے ہم ان کے ہاں پہنچے اور کہا کہ ہم موت کے فرشتے کی تلاش میں آئے
ہیں۔ کیا وہ آچکا ہے یا آنے والا ہے؟ وہاں کے اور یہاں کے وقت میں تو کچھ
فرق نہیں ہے؟ بہت ہنسے۔ پھر ہمارے ساتھ گھر کے باہر سرنگ پر ٹپکتے
رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سر کا بوجھ اتر گیا ہے اور وہ اب ہلکے ہلکے ہو گئے
ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ۳۱ مئی ۱۹۷۵ء کی رات کو گزرتے اب بارہ برس ہوتے
آ رہے ہیں اور ابو الفضل صدیقی اسی طرح افسانے بنانے میں مصروف ہیں۔
خدا انھیں عمر و فلاح عطا فرمائے۔ انھوں نے اپنے قلم سے اردو ادب کو مالا مال
کیا ہے اور اسے ایسی کہانیاں دی ہیں جنھیں ادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں
کر سکتی۔ ان کے پاس ۱۲۲ قلم ہیں جن کے وہ بلا فکر و غیرے مالک ہیں اور
ابھی ایک ایک قلم سے انھیں کئی کئی کہانیاں لکھنی ہیں۔

یہاں تک پہنچا تو مجھے اٹھارویں صدی کے ایک شاعر ابن خلدون خان

کا ایک شعر یاد آیا۔ آپ بھی سن لیجئے اور مجھے اجازت دیجیے۔

ہماری بھی کہانی محلِ یہاں یوں ہی بنا دیں گے
کہ جیسے آج ہم لوگوں کے افسانے بناتے ہیں

(۳۹ مارچ ۱۹۸۷ء)

ابو الفضل صدیقی کے آخری لمحات

ہمارے بزرگ افسانہ نگار جناب ابو الفضل صدیقی ۱۶ ستمبر ۱۹۹۸ء مطابق ۲۲ محرم الحرام ۱۴۱۹ھ بدھ کے دن، شمالی ناظم آباد کے حنیف اسپتال میں ادونکے گریس منٹ تیسرے پیرائند کو پیارے ہو گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۹۸ء کو دن کے سادھے بارہ بجے انھوں نے اپنا دنیا افسانہ مکمل کیا اور بتایا کہ ان کی طبیعت کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہو رہی ہے۔ ڈو حائی بجے انھوں نے کاغذ اور قلم لیا اور اس پر اپنے ہاتھ سے لکھا کہ ”میری زبان ٹوٹ گئی ہے“ یہ کاغذ ان کے بچے جیے اور افسانہ نگار نذر الحسن صدیقی کے پاس محفوظ ہے۔ اسی وقت ان کے پوتے ڈاکٹر ندیم کو اطلاع دی گئی اور انھوں نے ابو الفضل صدیقی صاحب کو حنیف اسپتال کے انتہائی سنگمداشت کے وارڈ میں داخل کر لیا۔ دائیں طرف فالج کا اثر ہو چکا تھا۔ شام کو انھوں نے پھر کاغذ قلم سے لیے اشارہ کیا جو انھیں ہبیا کر دیے گئے۔ کم زور وہ گرفت انگلیوں سے کاغذ پر انھوں نے کچھ لکھا جو مشکل سے پڑھا جاسکا۔ اس پر انھوں نے میرا نام لکھا تھا۔ نذر الحسن نے مجھے مطلع کیا اور میں فوراً اسپتال پہنچا۔ وہ نیم بے ہوش تھے لیکن دماغ کام کر رہا تھا۔ مجھے دیکھا اور جذبات سے مغلوب ہو کر اشکبار ہو گئے اور اپنا ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ہاتھ میں ہاتھ لے کر اسے دبا یا۔ بہت دیر میں وہاں رہا۔ پھر ان کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی چڑھ گئی اور وہ شاید سو گئے۔ ۱۶ ستمبر کو میں پہنچا تو میں نے کہا بڑے بھائی! کچھ آپ کی اتنی دیر سال گرہ ہے، مگر وہ ماہ و سال سے بے نیاز تھے۔ جب تک وہ اسپتال میں رہے میں کم دبیش روز جانا رہا لیکن ان کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ فالج کا اثر باقی تھا۔ اسی عرصے میں دل ہی متاثر ہوا۔ پیشاب بند ہونے کی تکلیف ہی شروع ہو گئی۔

غذا ۱۲ ستمبر ۱۹۸۷ء سے بند تھی۔ صرف ڈرپ کے ذریعے گھوکو کو زور دوائیاں دی جا رہی تھیں۔
 ناک کے ذریعے سوپ ٹنکی سے پہنچایا جا رہا تھا۔ یہی حالت بدستور قائم رہی۔ سڈاکٹروں نے بتایا
 کہ عمر کی وجہ سے دواؤں کا وہ اثر نہیں ہو رہا ہے جو ہونا چاہیے۔ بلڈ پریشر اور نبض کی رفتار
 بھی ناہموار تھی۔ ذرا سی دیر میں بڑھ جاتی، ذرا سی دیر میں گھٹ جاتی۔ ۱۴ ستمبر کو ان کا بلڈ
 پریشر اچانک گرنے لگا اور اتنا کم ہو گیا کہ کم و بیش صفر تک آگیا۔ ڈاکٹر دوڑے۔ دل کی حرکت
 بند ہو چکی تھی۔ الٹ پلٹ کروا کر، بھسج کر اسے پھر سے متحرک کیا اور آکسیجن کی ٹنکی سانس
 کے لیے لگا دی۔ دو دن وہ اسی حالت میں رہے اور ۱۶ ستمبر کو اپنے معبود حقیقی سے جا
 ملے۔ ۲۸ اگست کو آخری بار وہ میرے گھر آئے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا کہ جمعہ کے
 جمعہ میرے ہاں آتے بچوں سے کھیلنے، اُن سے لڑتے۔ کبھی ان کو لڑاتے، کبھی ہنساتے اور
 ایسے خوش ہوتے جیسے دو جہاں کی دولت ان کے ہاتھ آگئی ہے۔ پہلے وہ میرے بڑے
 بیٹے خاور سے اسی طرح کھیلنے تھے اور اب وہ خاور کے بچوں سے اسی طرح کھیلنے تھے۔
 ان کے ہاتھ کی بید ہر بچہ بھیجنے کی کوشش کرتا اور اس طرح بچوں میں آپس میں لڑائی مچاتی۔
 وہ بہت دیر تک یہی تماشہ کرتے اور کرتے رہتے۔ چلتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے کہ
 میرے پاؤں کم زور ہو رہے ہیں لیکن میں گھر سے ہمیشہ کی طرح پیدل آیا ہوں اور اب اندھن
 کی طرف جاؤں گا۔ یہ اُن کے معمول کا آخری جمعہ تھا اور بدھ ۱۶ ستمبر ان کی خلیقی زندگی کا
 آخری دن تھا جب انھوں نے اپنا آخری افسانہ مکمل کیا۔ وہ لکھنے کے لیے پیدا ہوئے تھے
 اور آخر وقت تک لکھنے کے عمل میں مصروف رہے۔ قابل رشک ہیں وہ لوگ جو جس
 کام کے لیے پیدا کیے جاتے ہیں وہی کام دل لگا کر لگن کے ساتھ مگن ہو کر کرتے رہتے
 ہیں۔ پھر غلطیوں ان کے قدم چومتی ہیں اور شہرت ان کو ہر دم سلام کرتی ہے۔ ابو افضل
 صدیقی اردو دن ہاں کے بڑے افسانہ نگار تھے۔ اتنے بڑے کہ اردو ادب کا مورخ ان کے
 نام اور کام کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ سلطان حیدر خوش اور منشی پریم چند کے قریب
 کی اُس نسل سے تعلق رکھتے تھے جن میں علی عباس حسینی اور حیات اللہ انصاری کے نام آتے
 ہیں۔ انھوں نے ماہگیرانہ تہذیب کی جیتی جاگتی تصویریں اردو ادب کو دی ہیں اور جس طرح

عوام کے دیکھ دو اور مسائل ان کی تحریروں میں ابھرے ہیں اس طور پر کسی افسانہ نگار کے ہاں نہیں ملتے۔ ان کی نصف سے زیادہ تحریروں غیر مطبوعہ ہیں۔ متعدد افسانے اردو رسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔ ”اہرام“ ان کا پہلا مجموعہ تھا جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں ، افسانے تھے۔ ۱۹۶۲ء میں ”چار ناولٹ“ نامی مجموعے میں ان کے چار عظیم ناولٹ پاکستان میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد مکتبہ اسلوب کراچی سے ان کے تین مجموعے (آئینہ انصاف، جوالا مکہ) ایک ساتھ شائع ہوئے جن میں افسانوں کی کل تعداد چودہ ہے۔ ”سرور“ ان کا ناول تھا جو سلطان سنتر کراچی سے شائع ہوا تھا ”رنگ“ نامی ضخیم ناول ابھی تک بہت کے مرحلے سے گزر رہا ہے۔ کم و بیش ان کی دوسو کہانیاں ’خلکے اور تحریروں‘ ایسی ہیں جو ابھی تک یا تو غیر مطبوعہ ہیں یا کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوئیں۔ ہمیں مل کر ان کی ساری تحریروں کو یکجا و مرتب کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اردو ادب کا یہ انمول سرمایہ محفوظ رہ جائے اور آنے والی نسلیں ان کے مستفیض ہو سکیں۔

۲۸ مارچ ۱۹۳۵ء کو سلطان حیدر جوش نے ان کے پہلے افسانوی مجموعے ”اہرام“ کے تعارف میں لکھا تھا کہ ”میری دعا ہے کہ ابو الفضل صاحب دنیا کے ادب میں اس طرح چمکیں جس قدر ان کی بڑی چمک دار آنکھیں“۔ ڈی۔ بی۔ نے تک محدود رہنے والی مستقل مسکراہٹ اور مطالعہ کرنے والی نظریں چاہتی ہیں اور ماشاء اللہ ان کی بلند و بالا سرخ و سپیدہ منستی کی سطحی آزاد نوجوانی کا تقاضا ہے۔ اور ۶ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو جب ان کا انتقال ہوا تو سفید واڑھی نے ان کے چہرے کو نورانی بنا دیا تھا۔ بڑی چمک دار آنکھیں مسکرا کر چھوٹی ہو گئی تھیں اور سرخ و سپید رنگ پیلا اور میلہ ہو گیا تھا۔ یہی ان کی بھرپور زندگی کے طویل سفر کا نقطہ انجام تھا۔ لیکن جب میں نے چادر اٹھا کر ان کے چہرے کو دیکھا تو دلچسپ اور دل سے اترنے والی دھوپ کی طرح وہ مسکراہٹ اب بھی ان کے ذہان پر محفوظ تھی۔ وہ شاید بات کرنا چاہتے تھے مگر وہ بات کرنے کی منزل سے بہت لگے جا چکے تھے اور ان آنسوؤں سے بھی بے نیاز تھے جو ارد گرد کھڑے افراد خاندان

بہو میں بیٹیاں پوتے، نواسیاں، بھائی بھتیجے ان کی جدائی پر نالہ و درد کے ساتھ بہا رہے
تھے۔ نذر الحسن صدیقی مجھ سے چمٹ کر رونے لگے اور میر کا یہ شعر میرے ذہن کے
در پہ کے سے جھانکنے لگا:

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

(۲۰ ستمبر ۱۹۸۷ء)

جمیلہ ہاشمی کے دوناول

(۱)

جمیلہ ہاشمی کا یہ ناول ”چہرہ بہ چہرہ رد و پروا“ ایک ایسی کتاب ہے جسے ہم سب کو پڑھنا چاہیے۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنے اس ناول میں ایک ایسی شنازدلیکین عظیم ہستی کو موضوع بنایا ہے جس کا نام کچھ تک خود ایک افسانہ ہے۔ اس سلسلے میں قرۃ العین طاہرہ کے نام سے جانتے ہیں، ایک ایسی بے قرار روح کی مالک تھی جس کے پاس دل بھی بڑا تھا اور دماغ بھی جو حق کی تلاش میں ساری زندگی سرگرداں رہی اور حق کی تلاش ہی میں جان دے دی۔ حق ہی اس کا محبوب تھا جس کے غم بہر میں وہ ساری عمر تڑپتی رہی۔ آنکھیں جب محبوب کو دیکھنا چاہیں تو پھر کسی اور کو دیکھنے کی تمنا نہیں کرتیں۔ اُس نے رسم پرست معاشرے میں ایک عورت جو تے ہوئے بھی وہ کام کیا جو ایرانی معاشرے میں اس وقت بہت دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ اس نے فرسودہ قدردوں کو تشکیک کی نظر سے دیکھا اور انہیں سوال بن کر معاشرے کے شعور کو بیدار کر دیا۔ جب اپنی خادمہ بانی کو قریب بلا کر اُس نے کہا: ”تم نے کبھی خدا کو دیکھا ہے؟“ تو خادمہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

قرۃ العین طاہرہ نے پھر کہا۔ ”تم یہ سوچتی ہو کہ خدا کو نہیں دیکھ سکتیں، جو ہر شے میں جاری و ساری ہے، جو سب جگہ موجود ہے۔“ اور جب بانی نے یہ سنا تو کہا۔ ”آقا زادوی! اگر خدا ہر شے کے اندر موجود ہے تو

میرے اندر بھی موجود ہوگا۔

قرۃ العین طاہرہ نے پھر کہا۔ "کیا تم نے اس سے پہلے محسوس نہیں کیا کہ خدا تمہارے اندر موجود ہے۔ تم خدا کا ایک حصہ ہو۔"

انی نے دلواؤں کی طرح جواب دیا۔ "نہیں، لہذا آقا زادی نہیں۔ میں یہ سوچنے کی جرأت کیسے کر سکتی ہوں۔ میں اتنا بڑا بوجھ کیسے اٹھا سکتی ہوں۔ میں تو عرفِ بانی ہوں۔ ایک خادمہ میرے اندر بھلا خدا کیسے اتر سکتا ہے؟"

یہ سن کر وہ دھم سے گر پڑی اور پھر کبھی نہ اٹھی۔ سہائی کا یہی وہ تصور تھا جو قرۃ العین طاہرہ کا بنیادی مسئلہ تھا اور جسے وہ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلا دینا چاہتی تھی۔ قرۃ العین اسی نئے شعور کی علامت تھی اور یہی نیا شعور قرۃ العین کے مہدی موعود کا ظہور تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پورا ایران ہزار سال گذر چکے کے بعد اسام غائب کے ظہور میں آنے کی پیشین گوئی کا انتظار کر رہا تھا۔ قاجاری سلطنت زبردستی اور ایران کی روح خود کو دریافت کرنے کے لیے بے چین تھی۔ قرۃ العین طاہرہ نے اس روح کو علی محمد باب کے روپ میں دیکھا۔ حکم ہوا۔ "اتھو اور جو کچھ تم نے دیکھا ہے اسے لوگوں کو دکھا دو۔" اس نے سوچا کہ اب سیاہ رات کا سورج اُبھ گیا ہے۔ باب کا مذہب ایران کا اپنا مذہب تھا۔ اپنی وحی اپنے قوانین۔ اس نے قرآن کریم کو اعراب سے آزاد کر دیا تھا۔ طاہرہ قائم آل محمد کی تلاش میں بہت دور نکل آئی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ وہ کسی بڑے مقصد کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ یہ خدا داد ذہانت اُسے پہنچی نہیں ملی ہے۔ وہ ایران کے بے عمل حامد معاشرے کو دلائل عقل کی روشنی سے متحرک کر دینا چاہتی تھی۔ وہ ساری عمر اسی نئے شعور کے ساتھ زندہ رہی اور اسی شعور کا تخم سرزمینِ ایران میں بکھرنے لگی۔

حمید بائشی نے اسی عظیم عودت کی زندگی اور فکر و فلسفہ کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے جو آج ملٹی سے قرۃ العین تھی۔ قرۃ العین سے طاہرہ بنی۔ طاہرہ سے زریں تاج بنی اور پھر ام العالم بن گئی۔ اس موضوع پر یہ اردو زبان میں پہلا ناول ہے۔ عزیز احمد مرحوم نے قرۃ العین طاہرہ کو موضوع بنا کر "زریں تاج" کے نام سے ایک خوب عورت افسانہ لکھا تھا جو آج بھی اردو

کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس صدی کے اوائل میں مولانا عبدالعلیم شکر نے حسن بین صباح کی تحریک کو موضوع بنا کر اپنا ناول ”فردوس بریں“ لکھا تھا جو آج بھی اردو کے اچھے ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ ”تاریخ“ انسانی فکر، جدوجہد اور شعور و عمل کا وہ خزینہ ہے جس سے سینکڑوں ناولوں کے تادو پو و بنے جاسکتے ہیں۔ جس سے علم اپنے حال کو ماضی کی روشنی سے منور کر سکتے ہیں۔ عزیز احمد نے ”زین تاج“ اور ”جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں“ لکھ کر ہمارے دور میں جدید تاریخی ناول لکھنے کی بنا ڈالی تھی۔ جمیل ہاشمی نے اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ اب دیکھیں ہمارے نئے لکھنے والے تاریخ کو اپنے دور کے حوالے سے کیسے دیکھتے ہیں اور کیسے اپنے نئے ناولوں میں سموتے ہیں۔ مریضانہ ذہن کی رومانیت کا زمانہ گزر گیا۔ اب ہمارے تخلیقی فن کاروں کو چاہیے کہ وہ بہار ناول نویسی کی موجودہ روش کے اس جذباتی دلدل والے دائرے کو توڑ کر باہر نکلیں اور اردو میں محنت و انہماک سے تاریخی ناول لکھنے کے ایسے نئے دور کا آغاز کریں جس میں ایک طرت ماضی حال سے آملے اور دوسری طرت ہمیں زندگی کا نیا شعور بھی ملے۔ ایسا شعور جو ہمیں ذہنی سطح پر نئے سفروں پر گاسائے اور ہم ان جانی دنیاؤں کو دریافت کرنے پر نکل کھڑے ہوں۔ ہماری روح اس سفر کے لیے بے چین ہے۔ ہمارے ناول نگار اور ادیب و شاعر اس روح کو نئے سفر کا راستہ دکھا سکتے ہیں۔ ناول اس کام کے لیے سب ہم اور بڑا میڈیم ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ جمیل ہاشمی ہمارے لکھنے والوں میں وہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے تاریخ کے حوالے سے اس سفر کا آغاز کر کے ذہن انسانی کے نہاں خافوں میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں وہ لگن ہے جو لکھنے والے کو ہر دم نئے سفر پر آمادہ رکھتی ہے۔ سفر حرکت کی علامت ہے۔ ان جانی دنیاؤں کو جاننے کی خواہش کا نام ہے تخلیقی زندگی کا استعارہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ آج سے بائیس سال پہلے ان کا پہلا افسانہ جب ہفت روزہ ”نیل و نہار“ میں شائع ہوا تھا تو وہ افسانہ مجھے اچھا لگا تھا۔ اس کے بعد ان کے کئی افسانے نیل و نہار میں چھپے اور وہ سب کے سب مجھے اچھے لگتے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں ”داستان گزلاہو“ میں ان کا وہ ناولٹ چھپا جسے آج ہم ”آتش رفته“ کے نام سے جانتے ہیں اور حمار دو کے

چند اچھے ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ان کا ناول "تلاشِ بہاراں" چھپا، جس پر انہیں "آدم جی انعام" ملا۔ اس عرصے میں انہوں نے بہت سی کہانیاں لکھیں جن میں سے بیشتر "دنیا دور" کراچی میں چھپیں اور جو آج بھی پڑھنے والوں کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے بیشتر کہانیاں ان کے مجموعے "آپ بیتی جگ بیتی" میں شامل ہیں۔ پھر انہوں نے ایک ایسے موضوع پر ایک ناول "روی" کے نام سے لکھا جو اس سے پہلے برصغیر کی کسی زبان میں موضوعاً ادب نہیں بنا تھا۔ ہمارے ملک عزیز کے "ساقی و دق" صحرائی کہانی، جسے ہم چولستان کے نام سے جانتے ہیں اور جو جغرافیائی اعتبار سے بھاول پور کا حصہ ہے۔ اس کے بعد جمیل ہاشمی نے تین اور ناول لکھے جو ۴۴، ۴۵، ۴۶ء میں "اپنا اپنا جہنم" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ جمیل ہاشمی کے لکھنے کا اپنا انداز ہے۔ ایک اچھے فن کار کی طرح انسان اور انسانی رشتوں اور چیزوں کو دیکھنے کا اپنا ڈھنگ ہے۔ ان کے اسلوب پر "جو زلف کو زلف" کا گہرا اثر ہے۔ اب وہ "چہرہ بہ چہرہ روبرو" لے کر آئی ہیں۔ ان جانی چیزوں کو جاننا ان کا مزاج ہے۔ آج کل وہ منصور صلاح کی زندگی اور فلسفہ و تصورات کو اس لیے پڑھ رہی ہیں تاکہ وہ انسان منصور کو از سر نو تازہ کر سکیں۔ جمیل ہاشمی کا سفر جاری ہے۔ وہ سفر جو خانی انسان کو لافانی بنا دیتا ہے۔

جمیل ہاشمی کا تخلیقی مزاج یہ ہے کہ وہ اسلام لے کر آئے تو جاپا سختی ہیں لیکن اس کا پردہ چاک نہیں کرتیں۔ ان کی روح میں شاعری ہے اس لیے حقیقت ان کے ہاں افسانہ بن جاتی ہے۔ "چہرہ بہ چہرہ روبرو" میں داستان گو نے تاریخ اور اس کے واقعات سے انحراف نہ کرنے کے باوجود تاریخ کو افسانہ بنا دیا ہے۔ یہ کوئی ایسا رومانی معاشرتی ناول نہیں ہے جس میں موثر سٹائل کی روایتی کار کی تیز رفتاری اور بھائی جہازوں کا شور ہو بلکہ یہ ایران کی تاریخ کے اس دور کی کہانی ہے جب ایران کا سیاسی استحکام زوال پذیر تھا اور ایران کو ایک ایسی فکر کی ضرورت تھی جو اسے دوبارہ متحرک کر کے فرسودہ اقدار کی شدید گرفت سے آزاد کر سکے۔ جب مذہب محض ایک رسم بن جائے اور اس میں زندگی کو آگے بڑھانے کی قوت باقی نہ رہے۔ عدل و انصاف ختم ہو جائے جبر و استحصال

کے بوجھ سے عوام کی کمر لٹوٹنے لگے تو ایسے میں علی محمد باب اور بہار افندہ جیسے کردار تاریک کے سٹیج پر ظاہر ہوتے ہیں جو رسم پرست معاشرے کے ہاتھوں خود تو فنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن مذہب کی رسم پرستی کا ثبوت پاش پاش کر جاتے ہیں۔ جمیل ہاشمی نے اس ناول کو محنت اور لگن سے لکھا ہے۔ یہ ایک مشکل ناول ہے جسے پڑھنے کے لیے کپ کو بھی محنت کرنی پڑے گی۔ وہ لوگ جو محنت سے بھاگتے ہیں اور چیزوں کو محنت سے دریافت کرنے اور جاننے کے عادی نہیں ہوتے انہیں اس ناول کے سمجھانے اُن محکم محکم ناولوں کو پڑھنا چاہیے جو محض صفحے پلٹنے سے سمجھ میں آ جاتے ہیں اور جو عام طور پر تاجران کتب کے ہاں مل جاتے ہیں۔

”چہرہ بڑا چہرہ دروہ و دکانی نثر کے بارے میں ابھی ایک بات کہتا چلوں۔ اس ناول کے بعض حصے خوب صورت نثر کے نمونے ہیں جن میں مصنف کی باطنی کیفیت نے فکر و احساس کو ایسے اُجاگر کیا ہے کہ ایک جان دار تصور ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ مثلاً یہ چند جملے سنئے:

”سماوار کے قریب بیچ کر پیش سے دھوڑ سکون پاتا ہے۔ روح علم انگیز واقعات کو بھلا دیتی ہے۔ دل کار و بار حیات میں پھر خوشی تلاش کر رہا ہے کیوں کہ وقت بڑے سے بڑا زخم مندمل کر دیتا ہے۔ ہاں زخم بھر جاتے ہیں، مگر چٹان ٹوٹ جاتے تو پہاڑ کا وہ حصہ اسی طرح بد نما لگتا رہتا ہے اور اُسے صدیاں اور قریں بھی درست نہیں کر پاتی۔“ (ص ۱۰)

اب اس سے بالکل مختلف مزاج کے یہ چند جملے سنئے:

”تو میں صفحہ ہستی سے تاہیہ ہوئیں اور خود اُن پر اُن کی بہنیاں اٹائی گئیں۔ طوفان بھیجے گئے۔ زمین و آسمان میں کہیں امان نہ ملے۔ خوارزم شاہی سلطنت تباہ ہوئی اور یا جوج ماجوج کی قوم نے مشرق سے نکل کر ساری بادشاہتوں کو اکٹ دیا۔ بعد ازاں ایک قلعہ، داستان بن گیا۔ کیا یہ عبرت کافی نہیں۔ اسپین کا مسجدیں مٹنے لگتی تھیں کو باقی رہ گئیں۔ مگر اولاد آدم کسی دوسرے کے قلعے سے سبق نہیں سیکھتی۔ وہ تو یہ چاہتی ہے کہ سب کچھ اس ہی جیتے اُس پر گذرے۔ ہر زمانے کے سبق اس کے لپٹے پیدا کردہ ہونے چاہئیں۔“ (ص ۶۵)

اس نثر میں ایک دوسرے سے مختلف قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایک پر احساس حادی ہے۔ دوسرے میں تاریخ کو ایک دائرے میں سمیٹ کر یک جا کر دیا ہے۔ لیکن جمیل ہاشمی کے مزاج نے ان دونوں میں اپنے اندازِ نظر سے ایک ایسی خوش گوار ہم آہنگی پیدا کر دی ہے جس سے اندازِ بیان ٹوٹا اور تاثیر گہرا ہو گیا ہے۔

اسی طرح اس ناول میں جاہل مانا جاتیں آتی ہیں۔ یہ سب مانا جاتیں خود جمیل ہاشمی کی تخلیق ہیں جو ایک طرف ناول کے تاثر کو ابھارتی ہیں اور دوسری طرف آج کی زبان میں انھیں "نثری تخلیق" بھی کہا جاسکتا ہے۔

(۱۰ ارمی ۱۹۷۹ء)

(۳)

آج جمیل ہاشمی اردو دانوں کے لیے ایک ایسا نام ہے جس نے اردو نثر میں اعتبار کا درجہ پالیا ہے۔ وہ اعتبار جو اچھا اور مسلسل لکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ادب جمیل ہاشمی کے لیے تعلقاتِ عامہ، آرائشِ محفل یا حصولِ شہرت کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ زندگی کا وہ خواب ہے جس کی تعبیر ان کی کہانیاں ہیں۔ وہ کہانیاں جو زندگی کے باطن میں چھپی ہوئی ہیں اور صرف اُن کو نظر آتی ہیں جو زندگی کے آئینے میں اپنے تجزیوں اور محسوسات کی جھلک اس طرح دیکھتے ہیں جیسے دو لہا دلہن آدمی مصحف میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ یہی جمیل ہاشمی کا تخلیقی عمل ہے جس میں اندھیارے اُجالوں میں اور روشنی ظلمت میں مل کر ایسے رنگ بناتے ہیں جن میں روشنی تاریکی کو اور اجالا اندھیارے کو بدل دیتے ہیں۔ اسی تخلیقی عمل سے وہ نغمہ پھونکتا ہے جو جمیل ہاشمی کی نثر کو نذرِ ظہور کے تڑکے کا سازِ رنگ اور سماں عطا کرتا ہے۔ یہ رنگ اور سماں ان کی نثر کو ایک ایسی فضا دیتا ہے جو اس دور کے دوسرے لکھنے والوں میں کسی بھار اور کم کم نظر آتی ہے۔ جمیل ہاشمی کی نثر میں یہ بات ہے ہمیشہ محسوس ہوتی ہے اور آج جب "دشتِ سُوس" پر کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو ہمیشہ کی طرح آج

ہیں ان کی نشر کا مریخ چمن مجھے نغموں پر کسانے لگا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ہاں بات کو کیسے
 نغموں تو میری نظر پر ہر کتاب کے عنوان پر پڑی جس کی ذیلی سرخی "حسین بن منصور حلاج۔
 ایک غنائیہ" ہے اور اس کے تین حصوں کے ہم۔ صدائے ساز، نغمہ شوق اور زمزمہ موت
 ہیں۔ یہ عنوانات جلیلہ ہاشمی نے اپنے تخلیقی مزاج اور اپنے احساسات کی مناسبت سے
 رکھے ہیں۔ ان سب میں نغمہ و ساز مشترک ہیں۔ اسی مزاج نے جلیلہ ہاشمی کی نشر کو ایک ایسا
 رنگ دیا ہے جس میں نغمہ شامل ہے اور ایک ایسا روپ دیا ہے جو ساز کی صدا سے دیک
 اُٹھتا ہے۔

خواتین و حضرات! ہمارے دور میں ابھی نشر لکھنے کا شوق ماند پڑ گیا ہے اور وہ ماند گئی
 شوق نئی نئی پناہیں تراشتی ہے۔ جلیلہ ہاشمی کی نشر اپنی مدھم دھم اور اپنی دھیمی سُرروں والی
 نغمگی سے مسحور کرتی ہے۔ اُن کے ہاں روک ٹوک کی ہر حقیقت نگاری والی نشر نہیں ملتی بلکہ نغمے
 میں رہی ہوئی وہ نغمہ سُلّتی ہے جس میں شاعری کی روح نشر کے قالب میں اُتر کر زندگی کی نوید
 دہتی ہے اور عشق کا احساس اور اس احساس سے پیدا ہونے والا شوق مریخ گلاب ہی کہ
 اُن گپڈ ٹیڑیوں پر لے جاتا ہے جہاں منصور حلاج کی طرح عشق کی نشانیاں، توفیق اور مہربانیاں
 مجھریوں کی منزل سے دور لے جا کر انا الٰہی سے قریب کر دیتی ہیں اور عاشقوں کے قبیلے
 با وضو ہو جاتے ہیں۔ منصور حلاج نے کہا تھا: "عشق ہی مریخ گلاب ہے اور عشق ہی مریخ
 زندگی ہے۔" اور اسی سے جلیلہ ہاشمی کی تخلیقی قوت کا خمیر اُٹھتا ہے اور ایک ایسی نشر کو وجود بخشتا
 ہے جو پڑھنے والے کو سرشاری کی کیفیت میں لے جاتا ہے۔

خواتین و حضرات! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ دو لوں وقت مل چکے
 ہیں۔ میں تو یہ بات کہہ کر آپ کی توجہ جلیلہ ہاشمی کی نشر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔
 وہ نشر جس کی سمجھتی ہمارے دور میں سوکھ رہی ہے اور جس کی آب یاری پھر سے ہماری
 نئی نسل کو کرنی ہے اس نشر کو محسوس کرنے کے لیے میں آپ کو چند جملے پڑھ کر سنا رہا ہوں۔
 آپ اسے سنیں اور دیکھیں کہ اس نشر کی خوشبو دوسری حقیقت نگاری والی نشر کی خوشبو
 سے کتنی مختلف ہے۔

”مسجد کا صحن نمازیوں سے گڑھا اور میناروں پر ڈرتے سورج کی آخری کرنیں گھگرنگ روشنی سے دھندلے سفید اُجالے میں اور پھر دھواں دھواں نیلے اندھیرے میں بدل رہی تھیں۔ مؤذن نے اپنی جگہ سنبھالنے کے لیے پہلی سیڑھی پر قدم دھرا، وضو خانوں میں پانی رواں ہونے کی صدائیں آئیں اکار واؤں کے سالار اونٹوں کو روکے رکھنے کا حکم دے کر سار ہاتھوں کی معیت میں دالان درو دالان اونچی چھتوں سے مزین صحنوں میں داخل ہوئے۔ لوگ درود و سلام میں مہک اور پھر خاموش ہو گئے۔ اذان کا جلال آسمانوں اور زمینوں پر منکشف ہوا۔ اونچے ایوان سبزہ زار اور باغوں سے گھری بستی میں یہ مشکبو گونج ہوا کے ساتھ ساری پستیوں اور بلندیوں پر جاری و ساری بلند ہوئی۔

در ویشوں کی ایک ٹمکڑی اپنے فرفلوں کو سنبھالتی ہاتھوں سے کٹھاہ تھا مے ایک اندازِ مستان سے چلتی اپنے نعروں کے خوش کو اپنے سینوں میں دبائے ملحقہ خانقاہ سے اگر نمازیوں کی صفوں میں شامل ہو گئی۔ یہ غیب و حضور کی کیفیت سے سرشار عجیب لوگ تھے کہ جب مسجد کے لیے کھینکے تو انھیں اٹھنے کا ہوش نہ رہتا۔ جب اٹھتے تو امام کی آواز سنائی دینے کے باوجود کھڑے رہتے۔ یہ کسی نماز میں سرشار تھے؟

نمازی اندر ہی اندر بیچ و تاب کھا رہے تھے، جب انھیں نماز کا ہوش نہیں تھا تو یہ جماعت میں کیوں شامل ہوئے تھے؟ آج سے پہلے ایسی کسی جماعت نے نماز میں شرکت نہ کی تھی جو امام کے پیچھے اپنی الگ نماز میں مشغول ہو۔ خانقاہ میں یہ کہاں سے وارد ہوئے تھے؟

اس نشر میں آہستہ پن ہے نغمی ہے اونچی لے میں نرم آواز رس گھولتی ہے۔ اس میں حقیقت سے جان دار تصویریں بنانے کی قوت موجود ہے۔ یہ تخلیقی نشر ہے۔ جمیلہ ہاشمی کلکشن نگاروں کی جد نپل میں اسی لیے امتیاز رکھتی ہیں۔

(۳۱ جنوری ۱۹۸۳ء)

جمیلہ ہاشمی کے آخری لمحات

۱۷ نومبر ۱۹۲۹ء کو گوجرہ میں پیدا ہونے والی جمیلہ ہاشمی ۱۰ جنوری ۱۹۸۸ء کو لاہور میں وفات پائی۔ یہ سب کچھ یوں اچانک ہوا کہ قضا و قدر کی اس سفاکی پر یقین نہیں آتا، جیسے مرنا نہ ہو چیل جھپٹا ہو، چیل آتی اور زندگی کے ہاتھوں سے، جھپٹا مار کر، جمیلہ ہاشمی کو ابد کی فضاؤں میں اڑا کر لے گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے کہ ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور میں ایک مختصر سی کہانی چھپی۔ کہانی کا نام تھا "دو خط"۔ پڑھی تو بھی لگی۔ اس کے بعد اور کئی کہانیاں اس افسانہ نگار کی پڑھیں اور وہ بھی اچھی لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اردو افسانے میں نیا اور تازہ خون شامل ہو رہا ہے۔ جب بھی جمیلہ ہاشمی کی کوئی کہانی چھپتی میں شوق سے پڑھتا۔

۱۹۵۹ء کے دسمبر کی آخری تاریخیں تھیں اور نئے سال کا سورج نئی سنگوں اور دلوں کے ساتھ طلوع ہونے کے لیے تیار تھا۔ انھیں تاریخوں میں کراچی میں رائٹرز کنونشن ہوا۔ اس وقت کراچی متحدہ پاکستان کا دار الحکومت تھا اور مشرقی پاکستان ہمارے جسم قومی میں دل کی طرح دھڑکتا تھا۔ ادیبوں کے اس کنونشن کے سلسلے میں میرے اور قرۃ العین حیدر کے زبے یکام لگا یا گیا کہ بعض ادیبوں کو کراچی اسٹیشن سے لاکر انھیں ان کی قیام گاہ تک پہنچایا جائے۔ اس زمانے میں ہوائی جہاز کا سفر اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ ریل ہی وہ تیز رفتار سواری تھی جو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی تھی۔ ہوائی جہاز کے سفر کا مزا اور اخبارات میں بیان پھپھرانے کا جسکے ابھی نہیں پڑا تھا اور

تعلقات عامر کے دفاتر بھی نہیں کھلے تھے۔ اُس زمانے کا ادیب آج کے ادیب کے مقابلے میں یقیناً پس ماندہ تھا۔ وہ زیادہ پڑھتا تھا اور زیادہ بحث کرتا تھا اور حیات و کائنات، سماج اور زندگی کے مسائل پر ایسے غور کرتا تھا جیسے یہ اُس کے اپنے مسائل ہوں اور انہیں سلجھانا اس کی اپنی ذاتی ذمہ داری ہو۔ میں اور عینی بھگیم (قرۃ العین حید) کو ہم سب اسی نام سے پکارتے تھے (اسٹیشن گئے اور چند ادیبوں کو ان کی قیام گاہ تک پہنچادیا۔ انہیں ادیبوں میں سفید گرم چادر لپیٹے ایک صحت مند جوان کی لنگی بھی تھی۔ بھٹاڑ ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ وہی خاتون ہیں جن کے افسانے میں نے "لیل و نہار" میں پڑھے تھے۔ نام جس نے آج ساری اردو دنیا میں مسلسل اور اچھا لکھنے سے اعتبار کا درجہ پایا ہے 'جمیلہ ہاشمی' تھا، اسے نام کی مناسبت کہنے یا تذکیر و تانیث کی مطابقت۔ اس دن سے مرنے کے دن تک، دوستی و غلوں کا رشتہ ماہ و سال کی گردش سے بے نیاز ہو کر قائم رہا۔ آج یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ رشتہ سدا سے تھا اور سدا رہے گا۔ جمیلہ ہاشمی کا نام نیا دور کراچی کی مجلسِ ادارت کی آج تک زینت ہے۔

ابھی پچھلے دواں جمیلہ ہاشمی ۸ دسمبر ۱۹۸۷ء کو میری بی بی نرن کی شادی میں شرکت کے لیے کراچی آئی تھیں اور ۷ دسمبر ۱۹۸۷ء کو ان سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی جب وہ شادی کی تقریبات سے نمٹ کر اپنی بیٹی عاشری کے ساتھ اپنے گاؤں خانقاہ شریف جا رہی تھیں۔ ان دس دنوں میں وہ خوش و خرم رہیں۔ لڑکیوں کے ساتھ گلے بجانے میں شریک رہیں۔ جھندی میں آئی گئیں۔ دلچسپی میں شرکت کی۔ پرہیز بھی کیا۔ بد پرہیزی بھی۔ پرہیز میری مروت میں اور بد پرہیزی اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر۔ میں شاید واحد آدمی تھا جس کا وہ لحاظ کرتی تھیں۔ ایسا لحاظ جیسا بہنیں بھائیوں کا کرتی ہیں۔ وہ ذرا بیطیاس کی مریض تھیں۔ میٹھا کھا رہی ہوتیں تو مجھے دیکھ کر ہلیٹ دور کر دیتیں۔ جس دن بد پرہیزی کا ارادہ ہوتا اور نیت ڈال ڈال کر ہوتی تو میرے ساتھ کھانا نہ کھاتیں۔ جمیل صاحب! میں نے ناشتہ دیر سے کیا ہے۔ میں بعد میں ٹھہر کر کھاؤں گی۔ جب لاہور یا خانقاہ شریف سے آئیں تو میرے سب بہن بھائیوں سے ملتیں۔ میری بیوی کی تو ایسی گردیدہ تھیں کہ تحریف

کرتے کرتے زبان سٹوکھ جاتی۔ اپنی بیماری کا کہیں ذکر نہ کرتیں۔ جمیل بی کیسی ہیں آپ۔ میں پوچھتا۔ اچھی ہوں جمیل صاحب۔ نیا ناول شروع کر دیا ہے۔ موضوع فوراً بدل جاتا اور مسلم اسپین کی تاریخ پارینہ کا قصبہ چھڑ جاتا جس پر وہ اپنا نیا ناول لکھنے کی تیار ہو گئی گذشتہ دو سال سے کر رہی تھیں۔ جمیل صاحب! یہ ناول آپ کو پسند آئے گا اور اس بار آپ مجھ سے ضرور کہیں گے: جمیل بی! یہ وہ تحریر ہے جس کا مجھے انتظار تھا۔ میں بھی جمیل بی سے بہت توقعات رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ ایسے ناول یا افسانے لکھیں کہ زندگی ہی میں کلاسیک بن جائیں۔ کچ جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں اتنا دوسرے کہہ سکتا ہوں کہ جمیل ہاشمی نے اردو ادب کو ایسی کہانیاں، ناولٹ اور ناول دیے ہیں کہ ان کا نام تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ آتش رفته، روہی اور دشتِ سُوس وہ ادب پارے ہیں جو کہنے والے زمانوں میں بھی تازہ و زندہ رہیں گے۔

۱۹۷۹ء میں میری بیوی اور جمیل ہاشمی نے حج کا پرہیز کرنا بنایا۔ طے پایا کہ میں اور میری بیوی کراچی سے جدہ ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچیں گے اور جمیل ہاشمی اور ان کے میاں سردار احمد اویسی لندن سے جدہ ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچیں گے اور ہم سب ۸ اکتوبر کو مکہ معظمہ کے یہاں ملیں گے۔ ۸ اکتوبر کو ہم دونوں سارے دن ان کا انتظار کرتے رہے مگر وہ..... نہیں آئے۔ تین چار دن بعد کسی نے کراچی کا اخبار ”جنگ“ لا کر دیا تو ایک خبر پر میری نظر جمی اور میں ستانے میں رہ گیا۔ میاں سردار احمد اویسی اُس وقت وفات پا گئے جب ان کا جہاز جدہ کے ہوائی اڈے پر اتر رہا تھا۔ ان کی میت کراچی واپس لائی گئی۔ جمیل ہاشمی اور ان کی اکلوتی بیٹی عاشری ساتھ تھیں۔ سردار احمد میرا آدمی تھے۔ سیدھے سادے، شریف النفس اور وضع دار۔ جمیل ہاشمی کا ایسا خیال رکھنے جیسے مالی تازہ گلاب کا رکھتا ہے۔ ساری ذمہ داری، گھر کی، باہر کی، خود اٹھاتے اور جمیل کو لکھنے پڑھنے کے لیے تازہ دم رکھتے۔ جو وہ کہتے وہ کرتے، عاشری کو ہر دم اپنے ساتھ رکھتے، جو اُس کے منہ سے نکلتا پورا کرتے۔ تازہ دم میں علی بیٹی اپنی باپ کے راز گئی تھی اور جمیل کا ہاتھ لے کر بھگڑا اور مقدموں کے نشے کے لیے اکیلی رہ گئی تھیں۔ جس پامردی سے انھوں نے زندگی کے جھیلوں کا مقابلہ کیا

جمیلہ کی زندگی کا وہ نیا رخ سامنے آیا جو اب تک ٹھپا ہوا تھا۔ انھوں نے جیٹی کے ساتھ مل کر زمیनों اور جائداد باغ کے انتظام کو ایسے طریقے سے چلایا کہ سب دیکھتے رہ گئے۔ پہلے باپ کی لاش عاشی اپنے گاؤں لے کر گئی تھی اور ۱۹۸۸ء کو وہ اپنی ماں کی لاش اپنے گاؤں لے کر گئی تاکہ آہائی قبرستان میں سپرد خاک کر دے۔ مصطفیٰ نے کہا تھا:

کیا تماشا نظر آتا ہے انھیں، حیراں ہوں

یا رکیوں خاک کے پردے میں چلے جاتے ہیں

۱۰ جنوری ۱۹۸۸ء — میں اسلام آباد میں تھا کہ کراچی سے فون آیا۔ جمیلہ ہاشمی بہت بیمار

ہیں اور انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں کل رات سے داخل ہیں۔ میں نے لاہور میں فون کیا۔ عاشی نے اٹھا یا۔ وہ رو رہی تھی۔ اکل میں کیا کروں۔ جیٹی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اکل میں کیا کروں۔ میں نے تسلی دی۔ ڈھارس بندھائی اور کہا میں ابھی دو بارہ فون کرتا ہوں۔ کشور ناہیدہ کو فون کیا۔ وہ نہیں ملیں۔ سائرہ ہاشمی کے گھر فون کیا۔ وہ بھی نہیں ملیں۔ انتظار حسین کو فون کیا۔ وہ بھی نہیں ملے۔ معلوم ہوا تھا کہ کراچ لاہور خالی ہو گیا ہے۔ دو بارہ عاشی کو فون کیا۔ جمیلہ ہاشمی کے بہنوئی یعقوب خان صاحب بول رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ کل رات ساڑھے دس بجے کے قریب اچانک طبیعت خراب ہوئی، فوراً ہسپتال لے گئے۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کیا تو بلڈ پریشر کی مشین خط مستقیم بنا رہی تھی۔ خون میں شکر کی سطح ۳۹۶ ہو گئی تھی اور اسی وجہ سے دلخ متاثر ہو گیا تھا۔ رات سے لے کر دوسرے دن ایک بجے تک انھیں زندہ کرنے اور زندہ رکھنے کی کوششیں کیجائے لاہور کرتے رہے۔ جب سانس کا درجہ گاڑ ٹھٹھے لگتا تو وہ سانس بحال کرنے اور زندہ کرنے کے لیے پسلیوں اور سینے کو دھاتے۔ بجلی کے جھکے دیتے۔ اس عمل سے پسلیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ دس بارہ گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد وہ اس فراس کی کیفیت سے باہر نکلے اور ایک بچ کر تین منٹ پر اعلان کیا کہ مریض نے دم توڑ دیا ہے اور وہاں چلا گیا ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ میں نے پوچھا عاشی کہاں ہے؟ وہ دباڑے مار کر رو رہی تھی۔ اکل میں کیا کروں۔ اتنی مجھے چھوڑ کر مٹی گئی جی۔ میں نے مقدمہ بھرتی لینے کی کوشش کی اور کہا میں جلد پہنچا ہوں۔ اس وقت تک جمیلہ ہاشمی کی نیت ہسپتال میں تھی، مگر

نہیں آئی تھی۔ میں نے اسلام آباد سے لاہور پہنچنے کے استقامات کیے اور ساڑھے تین بجے کے قریب پھر فون کیا۔ عاشی فون پر تھی۔ اب اُس کے آنسو سوکھ چکے تھے اور ساراظم دل میں اُتر گیا تھا۔ انکل میں امی کی تدفین کہاں کروں۔ بیٹا! میں نے کہا۔ لپے گھاؤں میں۔ میں انشا اللہ ۲۴ بجے کے جہاز سے پہنچ رہا ہوں! انکل تو پھر دم میت کو ایک گھنٹے میں خانقاہ شریف لے جائیں گے۔ میں نے پھر تلی تشفی کی باتیں کیں اور فون رکھ دیا۔ ابھی فون رکھا ہی تھا کہ اختر جمال کا فون آیا۔ بھائی! میں نے بہن سے بات کی ہے۔ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ خانقاہ شریف چلوں گی۔ ۱۱ جنوری کو ہم تینوں اسلام آباد سے لاہور، لاہور سے ملتان اور ملتان سے گٹاڑی میں خانقاہ شریف پہنچے تو ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ قبرستان پہنچے تو جمیلہ ہاشمی کی کچی قبر پر حافظ صاحب قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ جہاد کی ہوا تیر کی طرح جسم میں پوست بڑھ گئی۔ ہوا سرد اور تیز ہو تو آنسو بھی آجاتے ہیں۔ میں نے آنسو پونچھے اور ہوا کے دُغ کی طرف پیچھے کر لی۔ فاتحہ پڑھی اور جمیلہ ہاشمی کے بلغ میں آگیا جہاں گلاب کے بے شمار پودے دم سادھے چُپ چاپ کھڑے تھے۔ کشور ناہید اور نثار عزیز بٹ تصویرِ غم بنی ساکت درمات سر جھکائے ہاشمی تھیں اور مصطفیٰ محمد سے کہہ رہے تھے :

تو جن سے گفتگو ہمیں، وہ یار مر گئے

جنسِ سخن کے اپنی خریدار مر گئے

(یکم فروری ۱۹۸۸ء)

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی کے افسانے اور ناول ماری اوروں دنیا میں حق و دل پہیے سے پڑھے جاتے ہیں۔ متعدد زبانوں میں ان کی کہانیوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ عصمت چغتائی نے اپنی کہانیوں کے ذریعے متوسط طبقے کی ان عورتوں کی ترجمانی کی ہے جو اب تک گونگی اور بے نام تھیں، انھوں نے ان کے باطن کی ان کہی کہانیاں، ایسے دل چسپ انداز اور انھیں کی زبان 'روزمرہ و محاورہ' میں، ایسی بے باکی سے سنائی ہیں کہ اس سے پہلے ایسی کہانیاں اس طور پر نہیں لکھی گئی تھیں۔ ان عورتوں میں کنواریاں بھی شامل ہیں اور شادی شدہ بھی۔ بے ادلا دلوریاں بھی ہیں اور بھرے پڑے گھر میں حکمرانی کرنے والی ساسیں، وادیاں اور تانیاں بھی۔ وہ ایک مقبول اور بے باک افسانہ نگار ہیں۔ وہ جب بھی پاکستان آئیں، اہل پاکستان نے نہ صرف اپنی محبت اور عقیدت کا برملا اظہار کیا بلکہ پرواز دار ان تک پہنچنے والے، ایک لکھنے والے کے لیے یہی عظمتوں کی معراج ہے کہ اس کی تحریریں کہنے کو گولی تک پہنچتی ہیں اور ان تحریروں کے پڑھنے والے اس کی تحریروں کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ اظہار محبت یا اظہار عقیدت پڑھنے والوں کی پسندیدگی کا سنہ بولتا ثبوت ہوتا ہے اور سرائیاں ہے کہ عصمت چغتائی ان گنت چنے ادیبوں میں سے ایک ہیں جو تقریباً پینتالیس پچاس سال سے مسلسل لکھ رہی ہیں جن کی تحریریں آج بھی اسی طرح پسند کی جاتی ہیں، جس طرح پہلے کی جاتی تھیں۔ میں بھی ان کا ایک قاری ہوں اور اس وقت سے ان کی تحریریں پڑھ رہا ہوں جب بحیثیت افسانہ نگاران کی شہرت کا آغاز ہوا تھا اور ان کے افسانے شاہد احمد دہلوی مرحوم کے ساتھی دہلی میں شائع ہوتے تھے۔ اس وقت میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا۔ یہ بات ۱۹۶۲ء

کی ہے کہ کالج کی لائبریری میں ایک کتاب آئی۔ کتاب کا نام تھا "میرا بہترین افسانہ" اور اس کے مرتب تھے محمد حسن عسکری۔ اس میں ۵ افسانے شامل تھے اور ہر افسانہ نگار نے اپنے بہترین افسانے کی نشان دہی کی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ اسے یہ کہانی کیوں پسند ہے۔ اس میں کم و بیش وہ سب افسانہ نگار شامل تھے جو آج اپنی غفلتوں کی انتہاؤں پر پہنچ چکے ہیں یا اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ مجھے یاد ہے اس مجموعے میں سعادت حسن منٹو، علی عباس حسینی، غلام عباس، کرشن چندر، اخوانِ برنوی، راجندر سنگھ بیدی، پتو دھری محمد علی اور رشید جہاں اور خود حسن عسکری صاحب کے افسانے بھی شامل تھے یہ سب لوگ وفات پا چکے ہیں اور اپنی دنیا تھا ان کا۔ آخر حسین رائے پوری، دیو ندر ستھیا رتھی، ممتاز مصطفیٰ اور عصمت چغتائی کے بھی افسانے شامل تھے۔ اس مجموعے میں اکثر ایسے افسانے بھی شامل تھے جو آج بھی اردو کے بہترین افسانے شمار ہوتے ہیں مثلاً پتو دھری محمد علی کا تیسری جنس، راجندر سنگھ بیدی کا دس منٹ بارش میں، سعادت حسن منٹو کا کالی شلوار، غلام عباس کا آئندہ، محمد حسن عسکری کا حرام حادی اور عصمت چغتائی کا افسانہ "تل"۔ آج چالیس پینتالیس سال بعد جب ان افسانوں کو یادوں کی بستی کے گنگی کو چوں میں دریافت کرتا ہوں تو دو قسم کی خوشبوؤں سے دل و دماغ معطر ہو جاتا ہے۔ ایک خوشبو اس چیز سے پیدا ہوتی تھی کہ افسانہ نگار نے "کہانی" کے موتی کو براہِ راست منظرِ ظہر زندگی کے سمندر سے حاصل کیا تھا۔ دوسری خوشبو اس تخلیقی عمل سے پیدا ہوتی تھی جس کے ذریعے افسانہ نگار نے اس اثر کو "لفظوں کی مدد سے" کہانی کے نقش میں اس طور پر بنایا تھا کہ کہانی کا لہر اثر پیدا ہو گیا تھا جس نے خود افسانہ نگار کے اندر پروردش پاکر اسے کہانی لکھنے پر مجبور کیا تھا۔ اسی لیے اس دور کی کہانیاں، آج کے دور کی کہانیوں کے برخلاف، بہت زیادہ مقبول تھیں۔ مزید یہاں علامتوں کا مسئلہ تھا کہ جس نے ابلاغ کو بے معنی بنا دیا ہے اور نہ اخبار کی سطح پر وہ پھوٹ رہی تھا جو آج کی کہانیوں میں عام طور پر نظر آتا ہے اس وقت کے لکھنے والے زبان و بیان پر قدرت رکھتے تھے۔ اخبار کو ادب کی بنیادی خصوصیت سمجھتے تھے۔ غلط زبان لکھنے پر فخر نہیں کرتے تھے اور اپنی بات کو اخبار کا حاسر پہنانے کے لیے

محنت کرتے تھے۔ اسی لیے ان لوگوں کی وہ کہانیاں جو آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے لکھی گئی تھیں آج بھی ہمارے احساس کے تاروں کو اسی طرح مرتعش کرتی ہیں جس طرح اس وقت کرتی تھیں جب وہ لکھی گئی تھیں۔ عصمت چغتائی کی کہانیاں اس وقت بھی اور آج بھی دو باتوں کی وجہ سے پسند آتی تھیں۔ ایک یہ کہ انھوں نے اپنے تجربے کے تانے بانے کو پُر اثر انداز میں کہانی کا روپ دیا تھا اور دوسرے اسے روزمرہ کی عام زبان میں ایسے سلیقے اور سگھڑ میں سے بیان کیا تھا کہ پڑھنے والا زبان و بیان کی دلی کشی سے کہانی کے اثر میں آجائے تھا۔ یہی وہ عمل ہے جو آج بھی موثر ہے اور ہمارے نئے لکھنے والوں کو عصمت چغتائی کی کہانیوں کے فن سے اسے سیکھنا چاہیے۔

(۲۰ مارچ ۱۹۸۶ء)

رضیہ فصیح احمد کے افسانے

افسانہ ہمیشہ سے ادب کی مقبول ترین صنف رہا ہے اور یہ صنف آج بھی اسی طرح مقبول ہے لیکن یہ شکایت عام طور پر سُسنے میں آتی ہے کہ آج کل افسانوں کے مجموعے نہیں بکتے۔ اس کے برخلاف یہ بھی اپنی جگہ ایک مسئلہ حقیقت ہے کہ کوئی رسالہ بغیر افسانوں کے فروخت نہیں ہوتا۔ اس سے اس بات کا پتا چلا کہ افسانہ سالوں میں تو مقبول ہے لیکن کتاب میں نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ افسانے چوں کہ پہلے رسالوں میں شائع ہو جاتے ہیں اور پڑھنے والے عام طور پر انھیں دہریں پڑھ لیتے ہیں، اس لیے جب یہ کتابی شکل میں آتے ہیں اور افسانوں کا قاری افسانوں کے مجموعے پر نظر ڈالتا اور دیکھتا ہے کہ یہ افسانے تو اس کے پڑھے ہوئے ہیں تو وہ جلدی سے کتاب بند کر کے اسی جگہ رکھ دیتا ہے جہاں سے اُس نے اٹھائی تھی۔ قاری کا یہ رویہ افسانوں کے مجموعوں کے ساتھ اس لیے درست ہے کہ زمانہ قدیم کے دانشوروں کا یہ نیک مشورہ کہ ”زن بوجہ مکن گرچہ حور است“ اس کی صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ دوسری طرف گذشتہ دس بارہ سال میں ایک اور تبدیلی آئی ہے۔ پہلے ہر رسالہ ادبی رسالہ ہوتا تھا جس میں افسانے بھی ہوتے تھے اور فکری و تنقیدی مضامین بھی۔ مسائل و مباحث بھی ہوتے تھے اور شعر و شاعری بھی۔ قاری ان سب چیزوں میں ایک ساتھ دلچسپی لیتا تھا لیکن اب ڈائجسٹوں نے ہر قسم کے افسانوں کا ٹھیکہ اٹھا لیا ہے۔ وہ پڑھنے والے کو اندھا کر دینے والی نہایت باریک کتابت میں اپنی زبان کے افسانوں کے علاوہ، گونہا کی دوسری زبانوں کے افسانے اخذ و ترجمہ

کر کے چھاپتے ہیں اور پانچ سلت روپے میں ڈھیر سا راستہ مال قاری کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ اسی لیے عام قاری سستی رومانی، معاشرتی، جاسوسی، جنسی، شہوانی، تاریخی، مذہبی، تبلیغی، سماجی، فراری کہانیوں کے لیے اردو زبان میں پھینے والے لاتعداد ڈائجسٹوں سے رجوع کرتے ہیں۔ انہیں ڈائجسٹوں میں منظر کشی، چند عصمت، بیدی، غلام عباس، عزیز احمد، قزوینی، حیدر، ابو الفضل صدیقی، رضیہ فصیح احمد کے افسانوں کے ساتھ ساتھ دوسرے اچھے اور بُرے لکھنے والوں کے افسانے بھی مل جاتے ہیں۔ ڈائجسٹوں میں محمود وایاز ایک صفت میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ ڈائجسٹوں کی حیثیت اس خیلے کی سی ہے جس پر ہر قسم کا سامان رکھا ہے اور اس کا مالک زبرد زور سے آواز لگا کر کہہ رہا ہے۔ ”ہر مال ملے گا چار آنے“ ڈائجسٹوں نے اسی لیے افسانے کے مجموعوں کی اشاعت کو شدت سے متاثر کیا ہے۔ اب ایسے سفیر ہی وقت میں اگر کوئی افسانہ نگار اپنا مجموعہ شائع کرتا ہے تو ہمیں مل کر اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور دل کھول کر اسے مبارکباد دینی چاہیے۔

رضیہ فصیح احمد ہماری ان خواتین افسانہ نگاروں میں سے ایک اور ممتاز ہیں، جنہوں نے ناول اور افسانے میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ ان کے اب تک چھ ناول، سیس، آبلہ پا، اک جہاں اور بھی ہے، انتظارِ موسم گل، متاعِ درد اور آزادِ عشق کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ”آبلہ پا“ پر انھیں ۱۹۶۴ء کا ”آدم جی ادبی انعام“ بھی ملا تھا اور انعام کی اسی رسمِ ثقل میں میری ان سے ڈھاکہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ ان چھ ناولوں کے علاوہ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ ”دو پائوں کے پیر“ اور ایک ناول ”تپتی چھاؤں“ بھی شائع ہو چکے ہیں۔ پیر کے لیے کہانیوں کا مجموعہ ”آئینہ“ ان کے نام سے اور ایک سفر نامہ ”میر پاکستان“ بھی شائع ہو چکا ہے۔ وہ شاعری بھی کرتی ہیں اور شاید مجھ سے بہتر شعر گوئی ہیں اور ساتھ ساتھ تصویریں بھی بناتی ہیں اور مجھ سے بہتر تصویریں بناتی ہیں۔ لیکن میں اپنی طرح ان کی شاعری و مصوری کے عمل کو ”ہیر پجیری“ کے ذیل میں لاتا ہوں۔ ان کی مصوری تو اس کام بھی نہ آئی کہ وہ اپنے افسانوں کے اس اچھے سے مجموعے ”پیر“ کے ساتھ ساتھ اس قدر ہی بنائیں۔ رضیہ فصیح احمد نے ڈرامے بھی لکھے ہیں اور بہت سے افسانے بھی جو ابھی بصورتِ کتاب وجود میں آنے کے لیے بے تاب

ہیں۔

رضیہ فصیح احمد کے اس مجموعے کے سمیت مسافروں میں پانچ اچھے افسانے شامل ہیں جن میں سے تین یعنی آگ اور پانی، پہلی دراڑ اور آشیاں گم کردہ دنیا اور میں شایع ہو کر ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکے ہیں۔ یہ پانچوں افسانے رضیہ فصیح احمد کے فن افسانہ نگاری کے نمایندہ افسانے ہیں اور یقیناً یہ ایسے افسانے ہیں جنہیں ایک سے زیادہ بار دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے۔ رضیہ فصیح احمد اپنے افسانوں کے کرداروں کو متوسط طبقے کی گھر بلوز زندگی سے بنتی ہیں۔ وہ متوسط طبقہ جو رسم پرست اور بزدل ہے، جو جمہور کی عزت و ناموس، اخلاقی وقار اور اقدار کو بندر یا کی طرح مٹوہ پتے کو سینے سے چمٹائے ہوئے ہے۔ یہ وہی متوسط طبقہ ہے جس کا خور و رضیہ فصیح احمد ایک حصہ ہیں اور اسی لیے جب وہ اس طبقے کی کہانی سناتی ہیں تو ان کہانیوں کی واقعیت اور سچائی، ہمیں متاثر کر کے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ بے سمیت مسافر میں اسی متوسط طبقے کا ماحول، زبان اور کردار سامنے آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں دو قسم کے کردار ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ایک وہ جو اس طبقے کے خیالات اور جذبات و احساسات کا نمایندہ ہے اور دوسرا وہ جو اس سے باغی ہے۔ "ڈائن" کی ندرت اور پہلی دراڑ کا اتحاد بالی نوجوانوں کے نمایندہ ہیں۔ "پہلی دراڑ" اس نقطہ نظر سے ایک نمایندہ کہانی ہے جس میں افسانہ نگار نے ایک ایسے متوسط طبقے کی کہانی لکھی ہے جسے اس نے "نئی فیملی" کا نام دیا ہے۔ رضیہ فصیح احمد کے ایک باغی نوجوان کے الفاظ میں جس کی "ہر روایت خود ساختہ اور بناوٹی ہے۔ ہماری نانی کو دیکھو وہیلا بھر پیار نہیں کرتیں ہم لوگوں کو، مگر جب کوئی آئے گا تو ایک ایک کو بٹائیں گی" کھجور سے دیکھا نہیں۔ آنکھیں ترس رہی ہیں اور جناب سینے سے لٹکائیں گی، بلائیں لیں گی" پیار کریں گی اور حکم دیں گی کہ سامنے بیٹھ رہو کہ دل بھر کے دیکھ لوں۔ یا راتنی ہنسی آتی ہے ان کی بناوٹ پر۔ مگر حیرت ہے کہ جیسے سب کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ چپ چاپ ان کے سامنے بیٹھ رہتے ہیں۔ میرا تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ یہی وہ گھٹن ہے جس سے اس طبقے کی نوجوان نسل دوچار ہے اور جو تیزی کے ساتھ اس مگڑی کے چلنے کو فوج کر پھینک رہی ہے۔ یہی وہ طبقہ

ہے جو تبدیلی کے عمل کو روکتا ہے، نام نہاد اقدار کا خود کو پامان سمجھتا ہے۔ لیکن جب نئی نسل اس حال کو توڑ کر نکلتی ہے تو احمد کا باپ، کہا یہی جانا ہے، حرکتِ قلب کے بند ہو جانے سے مرجاتا ہے۔ "ڈائمنڈ" کا ہیرو وسیعہ کار کے نیچے دب کر مرجاتا ہے اور "بے سمت مسافر" کا سچا و عظیم خود کشی کا منہم ارادہ کر لیتا ہے۔ سعید کی موت پر جب عدت روتی ہوئی داخل ہوتی ہے تو سعید کی ماں، جو اس طبقے کی نمائندہ عورت ہے، اندرت کے ہال نوچ کر دیوانوں کی طرح جھج کر کہتی ہے۔ "ڈائمنڈ کٹنی تو نے آخر میرے بچے کی جان لے کر چھوڑی اور عدت سوچنے لگتی ہے۔" تم اب بھی نہیں سمجھیں کہ ڈائمنڈ میں نہیں، تم ہو۔ سعید کو میں نے نہیں تم نے مارا ہے؟ اسی طرح آشیانہ گرم کردہ کی نو جوان لڑکی بیباک دہلی کہتی ہے کہ "تعلیم یافتہ اور آزاد خیال لڑکی پنٹھانوں کے وقیانوسی، سو فی صد مردانہ سماجی ڈھانچے میں خوش نہیں رہ سکتی۔ میں اپنی ماؤں کی سہی مجتہد میں یقین نہیں رکھتی، جہاں مرد کی ہر اچھی بری عادت سے پیار کیا جاتا ہے۔ ایسا پیار جیسا پاتو جانور اپنے مالک سے کرتے ہیں کہ جس وقت بھی آ یا اس کے جوتے چاٹنے شروع کر دیے۔ اس نے جب چاہا گو دہلی لے لیا، اپنے بستر میں سٹلا لیا اور جب چاہا بٹھو کر سے پرے دھنکڑ کر شکار پر چلا گیا۔ طرحی نکلی لڑکی کو جیون ساتھ چاہیے نہ پوجا کے لیے لیا تو ڈا پا لو کا جسم، اندرت کے لیے کوئی گھگھوڑا بے سمت مسافر کے سارے افسانوں میں پرکشش نظر آتی ہے۔ رضیہ فصیح احمد نے اس طبقے کی منافقت اور جذباتی مسائل کا پردہ بے پائی سے چاک کیا ہے۔

رضیہ فصیح احمد کا اسلوب ان کے افسانوں کے مزاج و ماحول کے عین مطابق ہے۔ اس میں دلچسپ روایتی بھی ہے اور زبان کا نکسالی پن بھی لیکن ان کی عبارت میں انگریزی الفاظ کا استعمال بڑی طرح کھٹکتا ہے۔ گزشتہ چار پانچ سال سے اس رجحان نے پھر زور پکڑا ہے کہ ہمارے لکھنے والے انگریزی الفاظ کا کافی تعداد میں استعمال کرنے لگے ہیں۔ اس عمل سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ ہم پھر سے مغرب کی طرف جارہے ہیں اور اپنے باطن کی گہرائیوں میں ہم نے اپنی تہذیب کو مستور کر کے مغرب کی فکر و تہذیب کو قبول کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ یہ عمل سرسید کے دور میں شروع ہوا تھا اور ہماری تہذیب کی روح اور مزاج کو بدل گیا

تھا۔ اس کے زیر اثر نہ صرف ہماری خواہشیں، ہماری منزلیں، ہمارے خواب، ہمارے اسالیب بیان اور ہماری اصنافِ ادب بدل گئی تھیں، بلکہ اردو زبان کے ٹچلے کی ساخت بھی بدل گئی تھی۔ آج جو ہم نشر میں ٹچلے لکھتے ہیں وہ میر آخن کی ”باغ و بہار“ یا شاہ عالم آفتاب کے ”تھیں اوجاں“ سے اسی لیے بالکل مختلف ہیں۔ یہ وہ نشر بھی نہیں ہے جو غالب کے خطوط میں نظر آتی ہے۔ اب اُردو ٹچلے پر انگریزی ٹچلے کی ساخت کا گہرا اثر ہے۔

جب تہذیب بدلتی ہے تو اس تہذیب کے اسالیب اور ٹچلے کی ساخت بھی بدل جاتی ہے۔ لیکن اگر یہ تبدیلی ہمارے شعور کا ایک حصہ بن کر آتی تو اس صورت میں ہماری تخلیقی توانائی بھی باقی رہتی۔ لیکن ہمارے ہاں یہ عمل بے سوچے بکھے ہو رہا ہے اور ہم رفتہ رفتہ کمزور تخلیقی قوت والی ایک ایسی بے جان سی ”چیز“ بننے جا رہے ہیں جیسے ہم ایک ایسی کاربن کاپی ہیں جس کو دیکھ کر یہ تو پتا چلتا ہے کہ اس پر کچھ لکھا ہوا ہے لیکن کیا لکھا ہوا ہے آتشیں شیشہ لگا کر بھی اس کا پتا نہیں چلتا۔ ہمارا موجودہ ادب اسی صورت حال کا ترجمان ہے اور اسی لیے وہ خود بھی ایک ایسی کاربن کاپی بننا جا رہا ہے جسے پڑھا نہیں جاسکتا۔ ہمارے معاصر ادب بھران بے چہتی، عدم شعور، انتشار کا انہار تو کر رہا ہے لیکن وہ اپنے قاری کو اپنے معاشرے کو کوئی جہت یا سمت نہیں دکھا رہا ہے۔ یہی بے سمتی ہمارا اجتماعی اور تہذیبی المیہ ہے اور رضیہ فصیح احمد اسی بے سمتی کے لیے کی ترجمان ہیں۔

مشرف احمد کے افسانے

مشرف احمد ان نئے افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جن کے تخلیقی سفر کو نہ صرف میں نے بغور اور مسلسل دیکھا ہے بلکہ جن کی تحریروں کو میں نے دل چسپی اور توجہ سے پڑھا ہے۔ ویسے بھی نئے لکھنے والوں کی تحریروں کو میں ہمیشہ دل چسپی سے پڑھتا ہوں اور ان لکھنے والوں کی تحریروں کو تو خاص طور پر مسلسل پڑھتا رہتا ہوں جن میں تخلیقی جوہر کی چمک مجھے نظر آتی ہے۔ اسی لیے ان تمام افسانہ نگاروں کے تخلیقی سفر کا میں عینی شاہد ہوں جو آج کے ادبی منظر کا حصہ بن گئے ہیں یا بننے والے ہیں۔ ادب تخلیق کرنا جان جو کھوں کا کام ہے جو مسلسل ریاض اور محنت کے ساتھ بے لوث عشق کا طالب ہوتا ہے۔ جو لوگ ادب سے پورا عشق نہیں کرتے یا اس عشق کو دیوانگی نہیں بننے دیتے، وہ ذرا دیر کو نور و روشنی محو رہ جاتے ہیں اور پھر شہابِ ثاقب کی طرح کائنات کی گہری تاریکیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ مشرف احمد نے ادب سے نہ صرف عشق کیا ہے بلکہ دیوانہ وار اس کی تلاش میں سفر بھی کیا ہے اور اب کئی سال کے بعد ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”جب شہر نہیں ہوتے“ سامنے آیا ہے۔ وہ جب اپنا مجموعہ میرے لیے لائے تو میں نے فہرست پر نظر ڈال کر کہا کہ ۲۳ افسانوں میں سے چار ایسے ہیں جو میں نے نہیں پڑھے تو انہیں اس لیے چرت نہیں ہوئی کہ ان کو معلوم تھا کہ میں اکثر ان کے افسانوں کے بارے میں بات کرتا رہا ہوں۔ لیکن اب تک یہ باتیں میں صرف ان سے ہی کرتا رہا ہوں اس لیے ضروری ہے کہ آج مشرف احمد کے افسانوں کے بارے میں آپ سے بھی کچھ باتیں کر دوں۔

مشرف احمد کے افسانوں کو ہم تین موضوعات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ افسانے

جن میں بے بختی، تنہائی اور بے بسی کا ناثر ابھرتا ہے۔ ان موضوعات پر انھوں نے زیادہ تر تمثیلی انداز میں لکھا ہے۔ ان افسانوں کو آپ علامتی بھی کہہ سکتے ہیں لیکن علامت نگاری زیادہ سچیدہ عمل ہے۔ ایک ایسا عمل جس میں ایک پوری نسل ناکام رہی ہے۔ مشرف احمد کے یہاں علامت نگاری کی کوشش تو ملتی ہے مگر وہ اتنے واضح انداز میں یہ کام کرتے ہیں کہ اگر اسے تمثیلی انداز کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

دوسری قسم کے افسانے وہ ہیں جن میں شہری زندگی کو انھوں نے ایک دوسرے انداز سے دیکھا ہے۔ شہر ایک سرد ہے جس میں شیشی عفریت کا نام ہے جس کے آہنی پنجوں اور دانتوں کے درمیان انسانی خواب، خواہش اور معصوم آرزو میں دن رات پستی رہتی ہیں۔ اسی لیے خود انسان ایک خوف زدہ ہے جس میں سرد اور مردہ عنصرین کر رہ گیا ہے۔ اس احساس کو بھی مشرف احمد تمثیلی انداز میں پیش کرتے ہیں اور یہ دونوں موضوعات ان کے یہاں بڑی سچائی اور خوب صورتی سے بیان میں آئے ہیں۔

تیسری قسم ان کے افسانوں کی وہ ہے جن میں وہ پاکستان کے عمومی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر لکھتے ہیں۔ ان کو اگر معاشرتی حقیقت نگاری کی روایت میں دیکھا جائے تو یہ وہ بنیادی روایت ہے جس میں مشرف احمد کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ایسے افسانوں میں ان کے یہاں تلخی زیادہ جڑھ جاتی ہے اور اسلوب میں طنز کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں تمثیلی انداز اگر وہ اختیار بھی کرتے ہیں تو وہ دھیمیا نہیں ہوتا بلکہ تیز ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان کی جدید نسل کو یہ احساس اگر ہے تو وہ بے سبب نہیں ہے۔ یہ وہ تینوں موضوعات ہیں جن سے بلاشبہ ہماری اجتماعی زندگی کے پورے دور کی نسبت قائم ہے اور مشرف احمد کا زیر نظر مجموعہ ان سب کا احاطہ کر کے ہمارے دور کی روح کو کہانیوں میں بیان کر دیتا ہے۔ اس لیے ان کی کہانیاں زندگی سے قریب ہیں اور اسی لیے میں انھیں "جدید افسانہ نگار" کہتا ہوں۔

مشرف احمد کے افسانوں کا اسلوب اور انداز تحریر بھی ان کے افسانوں کے موضوعات کی طرح متنوع رکھتا ہے۔ یہ اسلوب کہیں بیانیہ ہو گیا ہے کہیں تمثیلی انداز اختیار کر لیتا ہے۔

اور کہیں خود کلامی کی سطح پر آ جاتا ہے۔ لیکن وہ مبہم کہیں نہیں ہوتا۔ واضح اظہار، صاف اور تکمیلی تصویریں ان کے ہاں اکثر دکھائی دیتی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ وہی پیرایہ بیان اختیار کرتے ہیں جو موضوع کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ہمارے نئے افسانہ نگاروں میں باخبر افسانہ نگار کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کے چند ایسے افسانوں میں جن میں ان کا موضوع اور موضوع ایک جان ہو گیا ہے، جب شہر نہیں بولتے، خوف پرندے، درخت، بے نام گھلیوں اور محلوں کا فوج، موت، دیدار اور شہر، جگر کو شہر کیا جاسکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اسی انداز سے چلتے رہے تو وہ آگے بڑھ کر اپنا نامزدہ اسلوب وضع کر لیں گے، جو یقیناً ان کی پہچان بن جائے گا۔

مجھے مشرف احمد سے اردو افسانے کے تعلق سے، بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ مستقبل کے منظر میں مشرف احمد مجھے ایک روشن ستارہ بن کر چمکنے ہوئے نظر آ رہے ہیں اور اسی لیے مجھے ان کے تخلیقی سفر سے گہری دلچسپی ہے۔

زبان لگتے فرو ماند و راز من باقیست

بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست (عرفی)

(۱۹۸۶ء)

آصف فرخی کے افسانے

آج سے دو سال پہلے آصف فرخی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "آتش و فشاں پر پھلے گلاب" شائع ہوا تھا اور مجھے یاد ہے کہ اس کتاب کی تقریب سعید کے زیرِ مسرت موقع پر میں نے بھی اختصار کے ساتھ اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔ ۱۹۸۳ء میں آصف فرخی کی ایک اور کتاب شائع ہوئی اور ہر من پیسے کے ناول "سدا بہار" کا ترجمہ تھا اور اب ۱۹۸۴ء میں ان کے افسانوں کا نیا مجموعہ "اسمِ عظم کی تلاش" شائع ہوا ہے اور اسی کے ساتھ دونی کتابوں کی نوید دی گئی ہے۔ ایک کہانیوں کا مجموعہ جس کا نام "چیزیں اور لوگ" رکھا گیا ہے اور دوسری کتاب "قطب نما" کے نام سے جس میں لاطینی امریکا کے جدید افسانوی ادب کا انتخاب شائع کیا جائے گا۔ آصف فرخی جس خشوع و خضوع کے ساتھ وظیفہ ادب بکھینچ رہے ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ جلد یا بدیر اردو ادب کو ایسے سدا بہار ادب پاروں سے مالا مال کریں گے کہ آنے والا دور تخلیقی ادب کے حوالے سے آصف فرخی کو مقامِ ممتاز پر فائز کرے گا۔ کم از کم میں تو یہی سمجھ رہا ہوں اور زیادہ سے زیادہ میری یہ خواہش بھی ہے۔ یہ بات میں نے بڑی ذمہ داری کے ساتھ کہی ہے اور اس لیے کہی ہے کہ تخلیقی ادب کے لیے جس دیوانگی، جس لگن اور جس تیاری کی ضرورت ہوتی ہے آصف فرخی دن رات اس میں لگے ہوئے ہیں۔ ادبِ عشق کا نام ہے اور عشق جزوقتی نہیں ہوتا۔ وہ تو ہر لمحہ اپنے پورے وجود پر چھا پارہتا ہے اور تب کہیں جاکر نامِ لیلیٰ درِ دربان نہ ہوتا ہے۔ یہ بات کہہ کر میں نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ آصف فرخی نے اپنی منزل کو پایا ہے بلکہ ان کا یہ نیا مجموعہ پڑھ کر یہ بات اذ

واضح ہو گئی کہ وہ شہر بے چراغ سے تلاش کے سفر پر نکلے ہوئے ہیں تاکہ وہ بکا ولی کو پا سکیں۔ اردو ادب کی نئی نسل میں تلاش بکا ولی کی یہ خواہش مجھے اُس دورِ گذشتہ کی یاد دلاتی ہے جب مسلمانوں کی روحِ تخلیق ادب کے اسپہوں پر سوار آپ حیات کی تلاش میں نکلی تھی اور ساری دنیا کے کونے کونے کو چھان مارا تھا۔ اسی لیے میں جب آج کے لکھنے والوں کی تحریروں کو پڑھتا ہوں تو تلاش و جستجو اور تجربہ و شعور کے عمل و فکر کو دیکھ کر مجھے اردو ادب کا مستقبل روشن نظر آتا ہے اور اس مستقبل میں آصف فرخی کا چہرہ مجھے صاف نظر آتا ہے۔

”اسمِ اعظم کی تلاش“ میں آصف فرخی نے بیک وقت کئی کام کیے ہیں جن پر میں بات کرنا چاہتا تھا لیکن نہ تو اب اتنا وقت ہے کہ اس کا طلسم میں آپ پر کھولوں اور پھر ہوائی جہاز میں جہاں یہ سطور لکھتے وقت میں ہوں، میرے بائیں طرف جو صاحب بیٹھے ہیں، اخبار پڑھنے کے بہانے، میرے لکھے کو لوں پڑھ رہے ہیں جیسا یہ ان کا نوشتہ تقدیر ہو۔ بہر حال اختصار کے ساتھ میں اس وقت صرف چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

ایک یہ کہ یہ مجموعہ واقعی مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں آصف فرخی نے تکنیک اور اسلوب دونوں کے تجربے کیے ہیں۔ مکاشفہ، عہدِ جدید، اور ”یزید کی پیاس“ دونوں افسانے تکنیک کو کامیابی سے برتنے کی مثال ہیں۔ اسلوب میں آصف فرخی نے کئی لہجوں اور انداز کو ملا کر ایک رنگ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں اسطور کی رمزیت، داستانی انداز، مقدس صحیفوں کے اندازِ بیان اور تصوف کے مزاج کو شامل کر کے افسانے کی فضا کو پُر اثر اور طلسماتی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ سوال کو جواب اور جواب کو پھر سوال بنا کر پٹنے کے عمل سے اسلوب میں پراسراریت کا تاثر پیدا کیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ کہانیاں ان تاثرات کا اظہار ہیں جو معاشرے کے حوالے سے تخلیقی ذہن کے اس گروہ سے پیدا ہوئی ہیں جس سے نئی نسل دوچار ہے۔ یہ عمل خارجِ مین ہیں بلکہ باطن کے نہاں خاؤں میں ہو رہا ہے۔ اسی لیے جدید نسل خارج سے پلٹ کر باطن میں

اُترنے کو ترجیح دے رہی ہے۔ اس موضوع پر بات یقیناً کی جاسکتی ہے لیکن یہاں تو میں آصف فرخی اور جہد نیل کے افسانہ نگاروں کے تخلیقی عمل کو بیان کر رہا ہوں جو خوف، بے یقینی، باطن میں اٹھنے والے سوال، انجیل کی پرواز اور خواب دیکھنے کے افسانہ ساز سے پیدا ہوا ہے جہاں آصف فرخی کے الفاظ میں "افسانہ نگار یہ ذہن فنانہ سازی کو درون مہنی کا واحد ممکنہ ذریعہ اور کہانی کہنے کو آپ سے اپنے بارے میں باتیں کرنے کا بہترین طریقہ سمجھتا ہے..... جس میں حیرتیں اور لوگ حقیقت سے زیادہ اصلی معلوم ہوں۔" غیر مرئی بھی سامنے آجائے جس کے انجام میں ساری گتھیاں سلجھ جائیں۔ گلفام کو سبزی اور کلڑ ہارے کو جنگل میں کھوئے ہوئے بچے مل جائیں۔ (ص ۳) ان الفاظ میں آصف فرخی کا ماضی حال اور مستقبل سب موجود ہیں۔ کافکا کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ عام آدمی کو، جو کیڑا بن گیا ہے کیسے دوبارہ انسان بنائے۔ آصف فرخی کا بھی یہی مسئلہ ہے کہ وہ اس آدمی کو جو بددعا کے اثر سے بد صورت مینڈک بن گیا ہے دوبارہ ہانکا شہزادہ کیسے بنائیں۔ "کیسے بنائیں" کے لیے اسم اعظم کی تلاش ہی آصف فرخی کے افسانوں کے اس عجوبے کا بنیادی مسئلہ ہے جس میں قدیم وجد بد اثرات اور حکایات و اسطوریہ کر، یہ معلوم کرنے کے لیے، ایک نئے تخلیقی سفر پر نکلے ہیں کہ

"اگر کل صبح تک کہانی کے بادشاہ کو شہزادہ کے قتل سے باز رکھا

تو اس سے پوچھوں گا کہ ہار ہار بدلتے نمیند اور خواب کے اس سلسلے

میں میں کہاں ہوں؟ (ص ۵۸)

"کیسے بنائیں" اور "کہاں ہوں" کی تلاش میں، جیسا کہ میں نے ابھی

کہا تھا آصف فرخی نے مختلف اساطیر سے قدیم مذہبی و نیم مذہبی حکایات و داستانوں روایات سے، انجیل میں کھیلے جانے والے کھیلوں کے پولوں سے، مقدس صحیفوں سے تصوف کے کراماتی قصوں اور فلسفیانہ تحریروں سے لہجہ و اسلوب بھی لیا ہے اور نفس مضمون بھی اور ان سب کی مدد سے شعوری طور پر وہ فنی اثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے دل کشی، جاذبیت اور پراسراریت پیدا ہو سکے۔ یہ سب عناصر بھی عمل افسانہ ساز سے گذر رہے ہیں۔ اس

جموعے میں آصف فرخی کا فکر و فن "آتش فشاں پر کھیلے گلاب" سے یقیناً آگے بڑھا ہے۔ اہم علم کی تلاش میں ایک جہت ہے اور میرا خیال ہے کہ اگلے جموعے میں جو چیزیں اور لوگب کے نام سے شائع ہو گا وہ علامت نگاری کے حصار سے بھی باہر نکلیں گے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ بیرون مینی بیرون مینی کے ساتھ مل کر نئے افسانے کو ایک نئی جہت دے سکے گی۔ یہی کام پیغمبروں نے کیا ہے اور یہی کام نئی نسل کے تخلیق کاروں کو بھی کرنا چاہیے۔

(۱۳ نومبر ۱۹۸۴ء)

نذر الحسن، صدیقی کے افسانے

نذر الحسن صدیقی مجھے تین دھجوں کی بنا پر عزیز ہیں۔ ایک یہ کہ وہ میرے بزرگ دوست ابو الفضل صدیقی صاحب کے بھتیجے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ خوش اخلاق اور نیک دل انسان ہیں اور تیسری اور اصل بات یہ ہے کہ وہ نئے افسانہ نگاروں میں اپنے انداز اور شعور و احساس کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ پچھلے دس پندرہ سال سے ان کے افسانے ”نیا دور“ میں شائع ہو رہے ہیں بلکہ ان کی افسانہ نگاری نے نیا دور کی گود ہی میں شعور کی آنکھ کھولی ہے اور یہ ان کا پہلا مجموعہ (سر دھوکا نوچ) ہے جو کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ افسانہ ویسے تو ادب کی سب سے مقبول صنف ہے لیکن افسانے کی کتاب کم مقبول ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ افسانے کے قارئین جب کتابی شکل میں ان افسانوں کو دیکھتے ہیں جو وہ پہلے ہی پڑھ چکے ہیں تو وہ کوئی ایسی کتاب خرید لیتے ہیں جو انھوں نے نہیں پڑھی ہے۔ ان حالات میں میرا خیال ہے کہ نئے افسانہ نگاروں کو اپنے مجموعے میں کم سے کم آدھے افسانے ایسے شامل کرنے چاہئیں جو پہلے کہیں نہ چھپے ہوں۔

نذر الحسن صدیقی نے گاؤں دیہات کے ماحول میں آنکھ کھولی ہے۔ وہ خود ایک زمیندار گھرانے کے فرد ہیں۔ پاکستان بنا تو وہ اپنے والدین کے ساتھ یہاں گئے اور اس کے بعد ان کی ساری عمر اسی شہر کراچی میں بسر ہوئی مگر کراچی جو صنعتی و تجارتی مرکز ہونے کے علاوہ پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ جہاں مختلف علاقوں کے لوگ آباد ہیں۔ جہاں ہر بڑے شہر کی طرح وہ سارے مسائل موجود ہیں جن کا تعلق جدید شہری زندگی سے ہے۔ جہاں تضاد کا عنصریت اور بدلتی دنیا کے اثرات، سماجی زندگی کو لمحوہ بلمحوہ بدل رہے ہیں، جہاں

زندگی پے چیدہ اور زندگی سے پیدا ہونے والے تجربے اس سے بھی زیادہ بے چیدہ ہیں اور اسی وجہ سے "جدید" افسانہ نگار کا تخلیقی عمل بھی پے چیدہ ہو گیا ہے۔ یہ وہ تجربہ ہے جس سے ابوالفضل صدیقی کی نسل کو واسطہ نہیں پڑا تھا۔ جدید شہر ایک زندہ حقیقت ہے اور نذر الحسن صدیقی جدید شہر کی پے چیدہ زندگی سے پیدا ہونے والی پچھڑ تہذیبی، ذہنی اور مادی صورت حال کے افسانہ نگار ہیں۔ وہ جدید شہر جہاں اخلاقی قدروں میں سیلاب آگیا ہے، جہاں دولت عزت بھی ہے اور خدا بھی، نظام زندگی میں جہاں دولت مرکزی حیثیت اختیار کر لیتی ہے تو مادی قدریں سب قدروں پر غالب آجاتی ہیں اور تضاد نمایاں ہو کر زندگی کو زخمی و بیمار کر دیتے ہیں۔ انفرادی و اجتماعی سطح پر اخلاقی اقدار شکست و ریخت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ نذر الحسن صدیقی نے جدید شہر کی اسی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے جہاں فرد کا المیہ اجتماعی المیہ بن کر سامنے آتا ہے۔ اسی لیے میں نذر الحسن صدیقی کو "جدید" افسانہ نگار کہتا ہوں۔ یہاں میں نے لفظ "جدید" نئے یا نوجوان کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ اس افسانہ نگار کے لیے استعمال کیا ہے جو جدید صنعتی شہر کی پہچ در پہچ زندگی سے پیدا ہونے والے تجربات کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتا ہے۔ وہ جدید شہر جہاں احساسی مرگ اور احساسِ زیست زندگی کے تانے بانے میں بُنے ہوئے ہیں۔ یہی زندگی مجھے نذر الحسن صدیقی کے افسانوں میں ملتی ہے۔

جزئیات نگاری اسی لیے ان کے ہاں ایک فن کا درجہ رکھتی ہے جس سے وہ اپنی کہانیوں میں ایسے رنگ بھرتے ہیں کہ جدید زندگی کی واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ کرداروں کو وہ اس طرح اُبھارتے ہیں کہ کردار بنیادی طور پر "ٹائپ" ہوتے ہوئے بھی کہانیوں کے آئینے میں چلتے پھرتے، بھیجتے جاگتے نظر آتے ہیں خواہ وہ منشی جی (سر دلہو کا نوحہ) ہوں یا کرنل واحدی (ایک دو تین) یا جبار بھائی بھائی (روشن اندھیرا) ہوں۔ تکنیکی اعتبار سے بھی ان کے ہاں ایک موضوع ہے جو دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں خال خال نظر آتا ہے۔ "سر دلہو کا نوحہ" میں "وقت" کہانی سنانا ہے۔ کہانی ماضی و حال میں ساتھ

ساتھ چلتی ہے۔ "ایک دو تین" میں معاشرہ کہانی بیان کرتا ہے اور تین الگ الگ کہانیوں کو ایک رشتے میں پرو دیتا ہے۔

نذرا الحسن صدیقی ایک باشعور افسانہ نگار ہیں جنہیں یہ معلوم ہے کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں کیوں لکھ رہے ہیں اور کیسے لکھ رہے ہیں۔ اسی لیے ان کے ہاں ٹیکنیک کا تنوع بھی ہے اور اسلوب کا رچاؤ بھی۔ آج جب علامتی افسانے نے کہانی کا دائرہ اثر محدود کر دیا ہے اور اردو افسانے کو صرف ایک رنگ میں رنگ کرنا مقبول بنا دیا ہے نذرا الحسن صدیقی کی کہانیاں مجلسا دینے والی کو زورہ فضا میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کے احساس سے پڑھنے والوں کو تازہ دم کر دیتی ہیں۔ ان کے افسانے حسن سکری صاحب کے افسانوں کی طرح دھیمے دھیمے پھلتے ہیں اور پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ جدید افسانہ نگار کے اس مجموعے کو ضرور پڑھیں تاکہ "جدید افسانے" کے بدلے موسم کا پتہ چل سکے یا۔

سرسید احمد خان

سرسید احمد خان جو ۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو پیدا ہوئے اور جنھوں نے ۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو ۸۱ سال کی عمر میں وفات پائی، جنوبی ایشیا کے ان عظیم رہنماؤں میں سے تھے جن کے افکار اور جن کی قوت عمل نے یہاں کے مسلمانوں کی زندگی پر گہرے اور ان میں نقوش ثبت کئے۔ ایسے نقوش جن سے انسان کی سوچ بدل جاتی ہے اور جن سے معاشرہ تبدیل ہو کر نئی اور شاداب منزلوں کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں اٹھارویں صدی برصغیر کے مسلمانوں کے زوال کی صدی ہے۔ اس صدی میں تاج محل والی مغلیہ تہذیب انتشار کا شکار ہو کر کم زور چڑھاتی ہے اور سات سمندر پار سے آنے والی انگریز قوم اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ انگریزوں نے یہ اقتدار چوں کہ مسلمانوں کے جیسا تھا اس لیے وہ ان سے خاص طور پر اس لیے خائف تھے کہ کہیں دوبارہ مسلمان یہ حکومت ان سے واپس نہ لیں۔ اس کے لیے انگریزوں نے مسلمانوں کو معاشی و سماجی اعتبار سے کم زور کرنے کے لیے ایسی حکمت عملی اختیار کی کہ وہ رفتہ رفتہ کم زور و بے اثر ہو جائیں تاکہ وہ کچھ بھی سر نہ اٹھا سکیں۔ اسی حکمت عملی کے پیش نظر انھوں نے ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کی اور انھیں آگے بڑھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی نصف صدی بھی نہ گزری تھی کہ مسلمان تعلیمی اعتبار سے پیچھے ہٹ جاتی سطح پر کم زور اور معاشی لحاظ سے ٹوٹ گئے۔ ابھی نام کی بادشاہی قائم تھی اور بہادر شاہ ظفر انگریزوں کے وظیفہ خواہ کی حیثیت سے قلعہ معلیٰ کی چھار دیواری میں قید تھے۔ ۱۸۵۷ء جسے انگریزوں نے غدار اور مسلمانوں نے جنگ آزادی کا نام دیا، برصغیر کی تاریخ کا اہم موڑ ہے۔ اس سال بہادر شاہ ظفر معزول کر کے رنگون بھیج دئے گئے اور اب نام

کی بادشاہی بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ اس وقت مسلمان قوم ایک شکست خوردہ قوم کی نفسیات کی حامل تھی۔ اقتدار چھین جانے کا غم، پرانی تہذیب کی عمارت گرنے کا دکھ اور نئے حکمران انگریزوں کے رویے نے انہیں نئی تہذیبوں کو قبول کرنے سے دُور کر دیا۔ وہ اب بھی اپنے ماضی کی طرف دیکھ رہے تھے اور انہیں اقدار سے وابستہ رہنا چاہتے تھے جو اسلاف سے انہیں ورثے میں ملی تھیں۔ انگریزی تعلیم، جو وقت کی ضرورت تھی، اسے کفر کے مترادف قرار دیا گیا اور انگریزی ملازمت ایک اختلافی مذہبی مسئلہ بن گئی۔ اس طرح ایک عرصے تک مسلمان قوم ان معاشرتی اور تعلیمی تقاضوں سے محروم رہی جن سے برصغیر کی دوسری قومیں فائدہ اٹھا رہی تھیں۔

ایسے میں مسلمان مفکروں کے سامنے یہ بنیادی مسئلہ تھا کہ کس طرح مسلمانوں میں تبدیلی کی روح بھونکی جائے تاکہ وہ اپنے اندر کے خول سے باہر نکل کر دوجہد کے تقاضوں سے آنکھیں ملا سکیں۔ ۱۸۵۷ء میں سرسید احمد خان کی عمر چالیس برس کی تھی۔ یہ اس دور میں جدید نسل کے نمائندہ تھے۔ سرسید نے اس مسئلہ پر غور کیا، ساری صورت حال کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی ساری سیاسی، معاشرتی اور معاشی خرابیوں کا واحد حل یہ ہے کہ انہیں زریعہ علم سے آراستہ کیا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو نئے خیالات کی طرف مائل کیا جائے اور انہیں ترغیب دلائی جائے کہ وہ بدلے ہوئے منظر میں نئی تہذیب کے صحت مند عناصر کو اپنے اندر جذب کریں۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ اس کا تعلق مسلمانوں کی سوچ اور ان کے انداز فکر کو بدلنے سے تھا۔ سرسید احمد خان کا خیال تھا کہ مسلمان نئی تعلیم ہی سے اپنے اوقاف و عرصات سے نکل کر عہد جدید کی نئی قوتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ۱۸۵۹ء میں انھوں نے مراد آباد میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۶۲ء میں غازی پور میں ایک اور اسکول قائم کیا اور اسی سال سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد یہ تھا کہ جدید علوم کی کتابیں اردو زبان میں ترجمہ کی جائیں۔ متعدد کتابوں کے اردو ترجمے اس سوسائٹی سے شائع کئے گئے۔ ۱۸۶۹ء میں اپنے تعلیمی پروگرام کو آخری شکل دینے کے لیے سرسید نے انگلستان کا سفر کیا تاکہ وہ وہاں کے تعلیمی ادارے دیکھ سکیں اور انہیں غلط فہمیوں سے سلائیوں

کے تعلیمی ادارے قائم کر سکیں۔ برصغیر واپس آکر انھوں نے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کا مقصد نئے خیالات کی ترویج اور مسلمانوں کو توہم پرستی اور ہمارے خیالات کے حصار سے باہر نکالنا تھا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے مسلمانان ہند کی تعلیم کے لیے ایک کمیٹی بنائی جس کے وہ سکریٹری مقرر کئے گئے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ۱۸۷۳ء سے ۱۸۷۵ء تک کالج کے قیام کی ضروری تیاریاں کی گئیں اور ۲۳ مئی ۱۸۷۵ء کو مسلم ایجوکلو اور شیل کالج علی گڑھ میں کھول دیا گیا۔ اس کالج کی تعلیم میں سرسید نے جدید اور متبع تعلیم دونوں کو ایک نئے نظام میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ سرسید چاہتے تھے کہ مشرق اور مغرب کی تعلیم مل کر ایک نئی وحدت، ایک نئی اکائی بن جائے۔ کالج میں جدید تعلیم اور جدید مضامین کے ساتھ مذہبی تعلیم کو بھی اہمیت دی گئی۔

سرسید کا نقطہ نظر ان کے ایک جملے سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا

کہ :

”علی گڑھ مدرسہ کے قیام کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں قرآن

دوسرے پر سائنس اور سر پر لا الہ الا اللہ کا تاج“

اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سرسید مسلمانوں کو پیدا کر کے جہاں جدید علوم اور سائنس سے بہرہ مند کرنا چاہتے تھے وہاں وہ انھیں اپنے مذہب و عقائد سے بھی دور کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ دل سے چاہتے تھے کہ مسلمان مسلمان رہیں اور جدید روشنی سے راہ حیات میں منزل مقصود تک پہنچ جائیں۔ وہ بدلتے ہوئے زمانے کے تجویز چاہتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے فکری انجماد کو دور کرنا چاہتے تھے اور انھیں علمی، معاشرتی، سیاسی و ذہنی سطح پر دنیا کی وہ نئی ترقی یافتہ قوموں کے برابر لانا چاہتے تھے۔ اس تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان رفتہ رفتہ نئی تعلیم کی طرف گئے اور جدیدی جدید دور میں داخل ہو گئے۔ یہ سرسید کی فکری کا نتیجہ تھا کہ مسلمان آج جدید علوم سے بہرہ مند ہیں اور ان مسائل کے حوالے سے نکل آئے ہیں جس میں سرسید کے دور کے مسلمان گرفتار تھے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سرسید نے تین سطحوں پر کام کیا: ایک یہ کہ نئی تعلیم کی طرف رجوع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو موجودہ احساسِ ذلت سے نکالا جائے اور ان میں عظمتِ رفتہ کا احساس پیدا کیا جائے۔ اس کام کے لیے انھوں نے خود بھی ”تہذیب الاخلاق“ میں مضامین لکھے اور شبلی نعمانی کو خصوصیت کے ساتھ اس کام پر لگایا۔ شبلی کی بیشتر تصانیف اور مضامین اسی طرزِ فکر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ معاشرتی سطح پر انھوں نے دو سر کام یہ کیا کہ مسلمانوں کو فرسودہ رسم و رواج سے نکالنے اور ان کے ذہنوں میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے اجتہاد پر زور دیا۔ تیسرا کام یہ کیا کہ افادہ و عقل کے تصورات کو اپنے مضامین میں ایسی اہمیت دی کہ وہ عام طور پر مقبول ہونے لگے۔ ان فکری عناصر نے مسلمانوں کے بند ذہنوں کے درِ بچوں کو کھول دیا اور تازہ خیالات کی ہوا سے وہ تازہ دم ہونے لگے۔ سرسید نے بتایا کہ زندگی ایک ایسا راستہ ہے جس پر آگے چلتا ہوتا ہے اور زندگی آگے بڑھنے اور آگے چلنے کا عمل ہے۔

آج یہ باتیں عام اور معمولی نظر آتی ہیں لیکن انیسویں صدی کا تصور کیجیے کہ ان خیالات کو عام کرنے کے لیے سرسید کو کتنی جدوجہد، کتنی کوشش و کاوش، کتنی قوت اور کتنے اخلاص اور کتنی گہری فکر و نظر کی ضرورت پڑی ہوگی۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید نے صرف تعلیمی سطح پر کام نہیں کیا بلکہ ذہنوں کو بدلنے کے لیے ان تمام شعبوں میں کام کیا جن سے مسلمانوں کے فکر و نظر بدل سکیں۔ ان کا یہ دائرہ کار مذہب سے لے کر ملی و الوطنی خدمات تک، سیاسی سرگرمیوں سے لے کر سماجی خدمات تک پھیلا ہوا ہے۔ سرسید احمد کی سرگرمیوں میں آپ کو یکسانیت کے ساتھ فکر و عمل کا اتحاد نظر آئے گا۔ سرسید نے ذاتی طور پر زندگی میں بیک وقت دو سطحوں پر کام کیا۔ ایک سطح غور و فکر اور حکمت عملی وضع کرنا تھی اور دوسری سطح اس فکر اور حکمت عملی کو عملی جامہ پہنانے کی تھی۔ انھوں نے فکر اور عمل کو ملا کر ایک کر دیا اور اسی لیے وہ زندگی میں اس کامیابی سے ہم کنار ہو سکے جس کی آج وہ خود پہچان ہیں۔

آج سرسید احمد خان مسلمانوں کے نشاۃ الثانیہ کی علامت ہیں۔ مسلمانوں میں تعلیمی انقلاب ان کی پہچان ہے اور اس تعلیمی انقلاب کے لیے انھوں نے قلم اور زبان دونوں کو استعمال کیا۔ قلم سے انھوں نے مختلف مسائل و افکار پر جو کچھ لکھا وہ سولہ جلدوں میں شائع ہو چکا ہے اور زبانی جو کچھ کہا اس کے اثرات آج ہمیں نئے ذہن کی صورت میں ورثے میں ملے ہیں۔ سرسید کی وفات ۱۸۹۸ء سے لے کر اب تک تقریباً ۸۸ سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور ان کی فکر کلور یا آج بھی بھڑک رہی ہے اور ان کا بتایا ہوا راستہ آج بھی نشانِ منزل ہے۔ سرسید نے انگریزی تعلیم کو ہماری تعلیم کا حصہ ضرور بنایا ہے لیکن وہ اس تعلیم کو اردو زبان کے ذریعے دینے پر ہمیشہ زور دیتے رہے اور اس کو اصل ترقی کا ذریعہ سمجھتے رہے۔ اس سلسلے میں سرسید کے اپنے الفاظ میں ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ :

”انگلستان کی تہذیبی ترقی کی وجہ یہ ہے کہ اس کے تمام ادبی اور سائنسی علوم ملک کی اپنی زبان میں ہیں۔ پس وہ جو ہندوستان کی حالت کو ترقی دینے اور بہتر بنانے کی خواہش رکھتے ہیں یاد رکھیں کہ اس مقصد کے حصول کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ تمام جدید سائنسی اور ادبی علوم کا اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ الفاظ میں موٹے حروف میں ہمالیہ پر لکھ دوں تاکہ آنے والی نسلیں اس کو یاد رکھیں۔“

آج سرسید ہم میں نہیں ہیں۔ لیکن ان کے یہ الفاظ آج بھی ہماری منزل کا پتہ دے رہے ہیں۔ ہمیں انگریزی کو ضرور سیکھنا چاہیے۔ اور اس پر پوری قدرت حاصل کرنی چاہیے لیکن اسے ذریعہ تعلیم نہیں بنانا چاہیے، ورنہ ہماری تخلیقی صلاحیتیں کسی پوری طرح پروان نہیں چڑھ سکیں گی اور ہم ہمیشہ صرف نقل اور پیروی کے راستے پر چلتے رہیں گے اور اسی طرح دوسری قوموں کی

دیکھتے اور ان کے محتاج رہیں گے۔ آج پاکستان کے لیے سرسید کا یہی پیغام ہے اور یہی ہماری منزل اور یہی ہمارا راستہ ہے۔ جب تک ہم اس راستے پر نہیں چلیں گے اسی طرح بے شناخت، منتشر اور گمراہ رہیں گے۔

۱۰ فروری ۱۹۸۶ء

شبلی نعمانی

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد پر عظیم کے مسلمانوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ اب وہ حکمران نہیں رہے۔ مغلیہ سلطنت کا سورج غروب ہو چکا ہے اور انگریز اب اقتدار اعلیٰ کے مالک ہیں۔ سلطنت چوں کہ انگریزوں نے مسلمانوں کے چھینتی تھی اور ۱۸۵۷ء میں ان کا مقابلہ مسلمانوں کے تھا اس لیے جتنا ظلم و جبر ممکن تھا انگریزوں نے مسلمانوں پر توڑا۔ انگریزوں نے پوری کوشش کی کہ مسلمانوں کو ان تمام اساسی عہدوں اور کلیدی جگہوں سے ہٹا دے تاکہ آئندہ کسی قسم کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ اس عالم میں مسلمانوں میں شدید احساس بے چارگی پیدا ہوا۔ ایک طرف ان کا شاندار ماضی تھا پھر عظمت مغلیہ سلطنت کے نشانات سارے پر عظیم میں پھیلے ہوئے تھے اور دوسری طرف اب وہ معاشی سطح پر کنگال اور نفسیاتی سطح پر شدید احساس محرومی کا شکار تھے۔ یہاں رہے کہ ۱۸۵۸ء میں سرسید احمد خان کی عمر ۲۰ سال کی تھی اور شبلی نعمانی اسی سال پیدا ہوئے تھے۔ ان حالات کا جائزہ لے کر سرسید احمد خان نے محسوس کیا کہ اب مسلمانوں کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کریں۔ جدید علوم سیکھیں تاکہ بدلے ہوئے منظر میں خود کو پھر سے قائم کر سکیں۔ اگر اس دور میں اور اس موقع پر سرسید احمد خان یہ ذکر نہ کرتے تو مسلمانوں کی حالت کے سدھرنے کا امکان بھی باقی نہ رہتا۔ سرسید ایک عظیم رہنما تھے۔ عظیم رہنما کبھی اکیلا نہیں چلتا بلکہ اپنے ساتھ ہم خیال لوگوں کا ایک قافلہ لے کر چلتا ہے جس میں جوان اور بوڑھے، نئے اور پڑنے اور مختلف انبیال لوگ شامل ہوتے ہیں۔ جب ۱۸۷۵ء میں سرسید نے علی گڑھ میں محمدن ایٹھلو اور شبلی کالج قائم کیا تو یہ دراصل پر عظیم میں مسلمانوں کی نئی

زندگی کا پہلا مرکز تھا۔ ۱۸۶۲ء میں شبلی نعمانی کی عمر تقریباً ۲۵ سال تھی۔ وہ علی گڑھ گئے، سرسید سے ملے اور ان کے خیالات سے ایسے متاثر ہوئے کہ ان کے گرویدہ ہو گئے اور اسی سال کالج سے وابستہ ہو گئے اور ۱۸۶۸ء میں جب سرسید کا انتقال ہوا شبلی کالج سے الگ ہو کر اپنے وطن اعظم گڑھ واپس آ گئے۔

شبلی سرسید کے خیالات سے ہر درجہ متاثر تھے۔ سرسید کی طرح وہ بھی مسلمانوں کی ترقی، عروج کے خواہاں تھے اور چاہتے تھے کہ بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کو ذہنی بہتری سے نکال کر نئے راستے پر ڈالنا ضروری ہے۔ سرسید کا نقطہ نظر یہ تھا کہ زندگی ایک راستہ ہے جس پر ہمیشہ آگے چلنا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں خود سرسید نے جو پروگرام بنایا تھا اس کے چار پہلو تھے۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کو موجودہ ذلت پسندی کا احساس دلایا جائے۔ دوسرے یہ کہ انھیں اپنی عظمت رفتہ سے واقف کرایا جائے تاکہ ان میں احساس عظمت پیدا ہو کر اعتماد بحال ہو سکے۔ تیسرے انھیں جدید علوم اور سائنس کی تعلیم کی طرف رجوع کیسا جائے۔ چوتھے یہ کہ ان کے دل و دماغ میں یہ بات ڈالی جائے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو قیامت تک کے لیے آیا ہے۔ یہ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے والا مذہب ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں میں اجتہاد کی اہمیت و ضرورت پر زور دیا جائے تاکہ اسلام جو بظاہر ہندو مذہب کی طرح رسوم و رواج کا شکار ہو گیا تھا پھر سے نئی توانائیوں کو پیدا کر سکے۔ اسی طرح مسلمانوں کے ہندو ذہن کو کھول کر نئے خیالات کو اس میں داخل کیا جاسکتا ہے۔ شبلی نعمانی سرسید کی اس فکر اور سوچ سے پوری طرح متفق تھے۔ مسلمانوں کو اپنی موجودہ پسندی اور ذلت کا احساس دلانے کا کام مولانا الطاف حسین حالی نے کیا اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے واقعات و تاریخ سے روشناس کرانے، ان میں نیا اعتماد بحال کرنے اور ان میں جذبہ ترقی کو پیدا کرنے کا کام مولانا شبلی نعمانی نے کیا۔ جب شبلی سرسید کی وفات کے بعد علی گڑھ سے چلے آئے تو اس وقت تک مسلمان اس سمت میں لمبا راستہ طے کر چکے تھے۔ شبلی لعدنی نے نئی نسل کو دیکھ کر جو اس نئی تعلیم سے بہرہ مند ہو رہا تھا آئی تھی کہ علی گڑھ کی تعلیم نے کتنے نوجوان قریب لایا ہے لیکن خود علم بریلز میں آیا۔ شبلی نعمانی کا خیال تھا کہ ہیں انگریزی تعلیم و تہذیب

سے اسی قدر لینا چاہیے جس قدر وہ ہمارے لیے ضروری ہے۔ مغرب کی اندھی تقلید مسلمانوں کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں نے بنو عباسیہ کے دور میں یونانی علوم کو اس حد تک قبول کیا جس حد تک وہ ان کے لیے مفید تھے اور باقی حصے کو مسلمان مفکران نے دلائل کے ساتھ رد کر دیا۔ شبلی کے نزدیک کردار نئی نسل کی ذہنی تربیت اور اسلام پر ان کے عقیدے کو اسی وقت برقرار رکھا جاسکتا ہے جب وہ اسلام کی تاریخ اس کی عظمت اور اس کی بنیادی فکر سے نہ صرف واقف ہوں بلکہ اس پر پورا اعتماد بھی رکھتے ہوں۔ یہ ایک مثبت نقطہ نظر تھا اور شبلی نے عظیم مسلمانوں کی ترقی دہیاری کے لیے انہی خطوط پر کام کیا۔ اسی لیے شبلی نے اپنی تحریروں سے پُرانے علوم سے دل چسپی کو دو بارہ پیدا کیا۔ انھوں نے علم الکلام کو دوبارہ رواج دیا۔ شبلی نعمانی مغرب کی اندھی پیروی کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی روایات، اپنے دین کے وابستہ رہتے ہوئے جدید دور میں داخل ہوں۔ اسی صورت میں وہ صحیح معنوں میں ترقی کر سکتے ہیں۔ صرف مغرب کی پیروی اور انگریزوں کی کھٹکیں بند کر کے تقلید سے وہ کہیں کے ذریعہ گمے۔ یہ وہ نقطہ نظر تھا جو سرسید کی تعلیمی و فکری تحریک کا ایک حصہ ہوتے ہوئے بھی اس سے الگ تھا اور مسلمانوں کو ترقی کے راستے پر چلانے کا صحیح طریقہ تھا۔

شبلی نعمانی کی تصانیف پر نظر ڈالیں تو ہمیں ان میں غیر معمولی تنوع نظر آئے گا۔ ایک طرف انھوں نے المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق اور سیرۃ النبی جیسی تصانیف لکھ کر مسلمانوں کے عظیم شاندار ماضی کی نئی تشکیل کی۔ اسی کے ساتھ فلسفہ و کلام کے ذیل میں علم الکلام، الکلام الغزالی، سوانح مولانا روم جیسی تصانیف لکھ کر فکر و فلسفہ کلام کو دوبارہ زندہ کیا۔ ادبیات میں مولانا ریس و دبیر اور شعر العجم کے علاوہ ان کے وہ مقالات ہیں جو تعلیمی، تاریخی، ادبی، تنقیدی وغیرہ موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ تاریخ کے ذیل میں تاریخی مضامین اور اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ سب تصانیف اردو زبان میں ہیں اور اپنے اسلوب اور قوت بیان کی وجہ سے ہماری تاریخ کا حصہ ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے عربی میں بھی تصانیف کیں اور فارسی و اردو میں شاعری بھی کی۔

شبلی ایک عظیم مصنف ایک منفرد مفکر، ممتاز عالم اور پر جوش علمی انسان تھے۔ یہ سب چیزیں ایک ذات میں کبھی کبھی جمع ہوتی ہیں۔ شبلی نعمانی وہ عظیم انسان تھے جنہوں نے نئی فکر سے مسلمانوں کو آگے بڑھنے کا راستہ دکھایا، جنہوں نے اپنے عمل سے اپنی فکر کو عام و مقبول بنایا۔ اپنی تحریروں سے، اپنے مضامین سے، اپنی نظموں سے، اپنی تقریروں سے اپنی تصانیف سے مسلمان کے اندر ایک نئی روشنی پیدا کی۔ ان کے تین مردہ میں ایک نئی روح بھڑکی۔ تصنیف کی ایک عظیم روایت قائم کی جو آج بھی زندہ ہے۔ اپنی تصانیف کو اردو زبان میں لکھ کر خود اردو زبان میں نئی قوت و توانائی پیدا کی۔ سرسید احمد خان کی طرح علامہ شبلی نعمانی کا نقطہ نظر بھی یہی تھا کہ اردو و عظیم کی وہ واحد زبان ہے جس کے ذریعے مسلمانوں میں یک جہتی و وحدت پیدا کی جاسکے۔ شبلی نعمانی نے اس دور میں وہ کام کیا جو ان کے علاوہ کسی اور نے نہیں کیا۔ انہوں نے قدیم علوم سے مسلمانوں کی دوبارہ دل چسپی پیدا کی۔ مسلمانوں کی تاریخ کو عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق دوبارہ لکھا تاکہ بدلے ہوئے حالات میں مسلمان اس تاریخ کو دوبارہ دل چسپی سے پڑھ سکیں۔ اس کام کے لیے انہوں نے ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی تاکہ اس کو تحریک اور ایک ادارے کی شکل دی جاسکے۔ شبلی کا قائم کیا ہوا ادارہ مفتعلین آج بھی یہی خدمت انجام دے رہا ہے۔ شبلی کی فکر اور ان کی تحریروں سے مغرب کی اندھی پیروی نئی نسلوں کے لیے قابل قبول نہیں رہی۔ شبلی نعمانی نے سرسید تحریک کو اپنے رد عمل سے ایک نئی وسعت دے کر مسلمانوں کی رفتار ترقی کو تیز اور نئی فکر کو مسلمانوں کی اجتماعی فکر میں شامل کر دیا۔ فکر کا یہ وہی راستہ ہے جسے نئی نسل کے مفکروں نے قبول کیا۔ ۱۹۱۳ء میں شبلی نعمانی کے وفات کے وقت علامہ اقبال کی عمر ۳۷ سال تھی۔ شبلی نعمانی کی فکر اور روایت تصنیف و تالیف آج بھی مسلمانوں کی فکر میں جاری و ساری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی فکر برصغیر کی ملت اسلامیہ کے خون میں آج بھی گردش کر رہی ہے۔

اکبر الہ آبادی

میں اس وقت اختصار کے ساتھ اکبر الہ آبادی کے تعلق سے صرف چند باتیں کہنا چاہتا ہوں تاکہ اکبر کا زاویہ نظر آپ کے سامنے واضح ہو سکے۔

اکبر الہ آبادی کے بارے میں عام طور پر یہ کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ وہ مزاح نگار ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے لیکن صرف ایک حد تک۔ مزاح دراصل اکبر کے لیے اپنی بات کو عوام و خواص تک پہنچانے کا ایک وسیلہ ہے تاکہ لوگ ان کی بات کو دل چسپی سے سن کر لطف اندوز ہوں اور اس کا اثر قبول کریں۔ اکبر کے مزاح میں ایک جہت ایک ناویہ نظر ہے جو ہمیں کسی دوسرے شاعر کے ہاں نظر نہیں آتا۔ اس جہت کی وجہ سے کہ برصغیر میں انگریزوں کے غلبے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ وہ تہذیب جس نے ایک ہزار سال کے سفر حیات میں ایک صورت بنائی تھی وہ ٹوٹ رہی ہے اور اب وہ دن دور نہیں جب یہ تہذیب نئی مغربی تہذیب کے سامنے شکست کھا جائے گی اور اس شکست سے وہ الیب پیدا ہو گا کہ مسلمان اپنے تہذیبی نظام سے ہٹ کر زحمت مغلوب ہو جائیں گے بلکہ اپنی حقیقی تخلیقی قوت بھی گنوا دیں گے۔ وہ فکری سطح پر تقلید اور پیروی کا توہوں گے لیکن راہبر نہیں بن سکیں گے۔ جب انھوں نے اس بات کو محسوس کر کے تہذیب مغرب کی مخالفت کی تو انھیں رجعت پسند کہا گیا۔ دراصل سرسید اور اکبر ہماری قومی زندگی کے دو الگ الگ دھارے ہیں۔ سرسید مغربی تہذیب کے نمائندہ ہیں اور اکبر اپنی اس تہذیب کے ترچھان ہیں جو انگریزی اثرات کے ساتھ کم زور ہو کر بے معنویت کا شکار ہو رہی تھی۔ سرسید کا کام اپنے دور میں مشکل ہوتے ہوئے بھی آسان تھا اور اکبر کا کام آسان ہوتے ہوئے بھی مشکل تھا۔ اکبر نے اپنے دور میں جو کچھ کہا تھا آج وہ حقیقت بن کر

سامنے آگیا ہے۔ ہم تہذیب مغرب کے پرستار بن کر اب صرف اس راستے پر چل رہے ہیں جس راستے پر مغرب ہمیں چلا رہا ہے۔ اب علم وہ ہے جو مغرب سے آتا ہے۔ لیکن باتوں و انکشافات وہ ہیں جو مغرب میں ہوتے ہیں۔ آج اپنے چاروں طرف نظر دوڑائیے تو آپ واضح طور پر دیکھیں گے کہ اب جو کچھ ہمارے گھروں میں، دفاتروں میں، زمین و آسمان میں، ہر طرف نظر آتا ہے وہ صرف مغرب کی دین ہے اور وہیں سے آیا ہے۔ ہماری تخلیقی قوتیں اتنی کم زور ہو گئی ہیں کہ ہم اب کچھ کرنے کی شاید صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ اکبر نے اپنی شاعری کے ذریعے یہ بات بتائی تھی — اُس وقت وہ مبالغہ نظر آتی تھی اور آج وہ حقیقت بن کر ہمیں گلی کو چوں سے لے کر نہ صرف کالجوں، یونیورسٹیوں اور سارے نظام زندگی میں بلکہ ہماری روح کے نہاں خاؤں میں بھی رواں دواں نظر آتی ہے۔ اس بات کو اکبر کی نظر دور رس نے دیکھ لیا تھا اور ایک پیغمبر کی طرح اپنی شاعری کے ذریعے ہم تک پہنچا بھی دیا تھا۔ ادب کا کام صرف دکھانا ہوتا ہے اور اکبر نے یہی ہمیں دکھا دیا۔ آج کے دور میں ادب نے اپنی اہمیت اس لیے گنوا دی ہے کہ ہم ہر بات میں افلاوین اور فائدے کو دیکھتے ہیں۔ اسی لیے کپڑوں پر استری کرنے والی مشین ہمارے لیے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ وہ ہماری قمیض کی سلوٹس دور کر کے ہیں فوری فائدہ پہنچاتی ہے۔ بے چارہ ادب ظاہر ہے کہ یہ کام نہیں کر سکتا لیکن دراصل ادب ہماری روح کی سلوٹس ضرور دور کرتا ہے اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ روح ہمیں نظر نہیں آتی۔ جب روح نظر نہیں آتی تو اس کی سلوٹس کہاں نظر آئیں گی؟ اکبر نے شاعری کے ذریعے اپنے دور میں ہماری روح کی سلوٹس دور کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ہم نے انھیں مزاح نگار کہہ کر ڈرا دیر کو ان کی شاعری سے غفلت کر لیا لیکن بحیثیت مجموعی انھیں رد کر دیا اور اسی رد کرنے کی وجہ سے سو سال کے عرصے میں ہماری پوری تہذیب تخلیقی سطح پر بانجھ ہو کر رہ گئی۔ اب ہماری تہذیب نہ سدا بہ اور مفکر پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، نہ علمی و ادبی سطح پر تخلیقی کارنامے انجام دینے کی اہلیت رکھتی ہے اور نہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں کچھ کر دکھانے کی قوت رکھتی ہے۔ اکبر الہ آبادی نے ہمیں یہی بتایا تھا لیکن ہم نے ان کی ہر بات ہنسی میں اڑا دی تھی۔ اب بغضِ تعالیٰ انھیں ہماری رہائشی گھر رہا ہے اور ہم مغرب کی پٹری سے اتاری ہوئی ریل پر بیٹھے خوشی

کے پھولے چار ہے یہ :

حضرت غفر گنٹ مجھ کو دلا دیں اکبر
رہنمائی کے لیے ہے مجھے انجن کانی

مال گاڑی پہ بھروسہ ہے جنہیں اے اکبر

ان کو کیا غم ہے گناہوں کی گڑوں ہاری کا

اکبر کی شاعری اور ان کا تہذیبی زاویہ نظر ہمیں آج بھی دعوتِ فکر دیتا ہے لیکن اب ”یہ وہ منزل ہے جس میں شیعہ کاٹھن نہیں چلتا“ اس زاویے سے دیکھتے تو اکبر کی آواز وہ آواز ہے جو نہ صرف پاکستان اور ہندوستان کو بلکہ سارے ایشیا کو زندہ رہنے اور خود کو از سر نو دریافت کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ اکبر جیسا شاعر ایشیا کی کسی بھی دوسری زبان میں مجھے نظر نہیں آتا جس نے مغربی تہذیب کے غلبے سے بچنے کے لیے اس دل چسپ اور دلکش انداز میں اپنی جڑوں سے پیوستہ رہنے کی تلقین کی ہو اور قوموں کی تخلیقی صلاحیتوں کو زندہ و باقی رکھنے کا گڑ سکھا یا ہو۔ اسی لیے میں اکبر کو صرف مزاحیہ شاعر نہیں بلکہ عہدِ فیلسفی شاعر سمجھتا ہوں۔ ایک ایسا فلسفی شاعر جس نے اس وقت ہمیں وہ بتایا جب ہم مجبور تو ضرور تھے لیکن پوری طرح بہرے نہیں ہوئے تھے۔ اکبر آبادی کی یاد منا کر الہ آباد والوں نے جہاں اپنی وطن دوستی کا ثبوت دیا ہے میرا خیال ہے کہ آج وہ موقع بھی فراہم کیا ہے کہ جہاں سے ہم اپنی جڑوں کی تلاش میں نکل کر خود کو اور اپنی تہذیب کو از سر نو دریافت کرنے کا عمل شروع کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں قلمی کام کا پیوند ہمیشہ دسی پڑ کی شاعری پر لگتا ہے جس کی جڑیں اپنی زمین میں پوجت ہوئی ہیں۔ اکبر آبادی بار بار اور طرح طرح سے یہی کہتے ہیں اور اسی لیے انھوں نے جناب سید پرٹھوڑی کا ہتھار۔

ابتدا کی جناب سید نے جن کے کالج کا اتنا نام ہوا

انتہا یونیورسٹی پہ ہوئی قوم کا کام اب تمام ہوا

اکبر آبادی کے قلعے سے اور بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن آج کی شام میں آپ سے

یہی کہنا چاہتا ہوں اور صرف یہ سوال پوچھ کر آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ کیا اپنی جڑوں سے
 رشتہ کاٹ کر آپ اپنی تخلیقی قوتوں کو زندہ و قائم رکھ سکتے ہیں؟ کیا ہماری موجودہ تخلیقی
 صورت حل اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ ہم اپنی روایت سے کٹ کر تخلیقی سطح پر بالکل بانجھ
 ہو گئے ہیں اور کیا زندہ و تازہ تخلیقی قوتوں کے بغیر ہم زندگی میں کوئی کام انجام دے سکتے ہیں۔
 اکبر نے ہم سے یہی سوال پوچھا تھا اور یہی سوال ہماری تہذیب کے بچھتے ہوئے شمع خانے کے
 صدر دروازے پر چلی حروف میں کتبچی آویزاں ہے :

ہیں عمل اچھے مگر دروازہ جنت ہے بند

کر چکے ہیں پاس یکسں نوکری ملتی نہیں

پہن لے سایہ مری جان آئنا کر پشتواڑ

زمانہ باتوں سازد تو ہا نہ ماتہ ہساز

نیاز فتحپوری

آج سے سو سال پہلے ۱۸۸۳ء میں نئی گھاٹ کے مقام پر ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا تدریجی نام ان کے والد صاحب نے لیاقت علی خان رکھا اور والدہ نے نیاز محمد خان رکھا۔ باپ کا رکھا ہوا تاریخی نام تو نہ چلا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ لیاقت علی خان کے نام سے ہمیں ایک اور معتبر موسیقی کو پہچانتا تھا جس کے یوم شہادت کو اہل پاکستان ۱۶ اکتوبر کو ہر سال مناتے ہیں، لیکن ماں کا رکھا ہوا نام ایسا چلا کہ آج بھی ہم نیاز صاحب کو اسی نام سے پہچانتے ہیں اور آج سو سال بعد ۱۹۸۳ء میں ان کی ولادت کا جشن صد سالہ منانے کے لیے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ نیاز فتحپوری ہماری تاریخ کا ایک بڑا نام ہے۔ اعتباراً کہ آج خود بڑائی کا قد، ہم نیاز فتحپوری کے قد سے نپتے ہیں۔

فروری ۱۹۲۲ء میں نیاز فتحپوری صاحب نے یارانِ نجد کے ساتھ مل کر بھوپال سے 'نگار' جاری کیا اور اپنی وفات ۱۹۶۶ء تک وہ ۴۴ سال نگار کو مسلسل شائع کرتے رہے۔ رسالے شائع ہوتے ہیں اور بند ہو جاتے ہیں لیکن کم رسالے ایسے ہوتے ہیں جو مدیر کی ذات و شخصیت کا اس طور پر حصہ بن جاتے ہیں کہ رسالے اور شخص کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں رہتا۔ نگار نیاز تھے اور نیاز کا نام نگار تھا جیسے نیاز فتحپوری تھے ویسا نگار تھا۔ نگار کے پہلے شمارے کے ادارے میں نیاز فتحپوری نے لکھا کہ

”جس وقت ترتیب نگار کے فرائض پر میں نے غور کیا تو

ضروریاتِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ تو میں نے پہلے ہی سانس

میں کر لیا کہ نگار کو خالص ادبی رسالہ تو نہ بننے دوں گھاڑ

اس جملے سے نیاز فتنچوری کے انداز فکر کے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ "ضروریاتِ زمانہ" کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ دوسرے وہ نگار کو "خالص ادبی رسالہ" نہیں بنانا چاہتے تھے اور یہ دونوں وہ بنیادی باتیں ہیں جن سے مل کر نگار کا مزاج ترکیب پاتا ہے۔ ہر وہ شخص جو ذہنی طور پر بیدار ہے، زندگی کے معاشرہ رجحانات سے اپنا رشتہ منقطع کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے نیاز صاحب نے نگار کو عہدِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق جدید رجحانات کا رسالہ بنایا اور اسی لیے نگار ہمیشہ پسندیدہ رسالہ رہا۔

وہ لوگ جو زمانے کا شعور رکھتے ہیں اس بات کو جانتے ہیں کہ تہذیبی کا عمل ایک فطری عمل ہے لیکن اس کے باوجود اس فطری عمل کا اظہار غیر روایتی عمل بنے اور معاشرے کے لیے عام طور پر قابل قبول نہیں ہوتا۔ اسی لیے لکھنے اور سوچنے والے ذہن کو تہذیبی کے عمل کا شعور پیدا کرنے کے لیے معاشرے سے جنگ لڑنی پڑتی ہے۔ معاشرے کو اس کے غول سے باہر نکالنے کے لیے اپنے قلم سے بیداری کی جوت جگانی پڑتی ہے اور یہ کام جرأت و بیباکی کے ساتھ آوازوں کا اظہار سے کرنا پڑتا ہے یہی کام ساری عمر نیاز فتنچوری نے کیا اور اسی وجہ سے نگار نے اپنے زمانے کی بھرپور ترجمانی کی۔ آج جب ہم ۱۹۶۲ء اور اس کے بعد کے معاشرے کے خد و خال کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ایک ایسا معاشرہ نظر آتا ہے جو روایت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ جو کسی نئی بات کو سننے یا اس پر سوچنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ جو ہے ٹھیک ہے یہی اس کا عام رویہ ہے۔ نیاز فتنچوری نے اپنے قلم سے نہ صرف اس جمود کو توڑا بلکہ اس روایتی انداز پر بھرپور ضرب لگائی اور ایسے ایسے مسائل پر قلم اٹھایا جن پر نگار اس دور میں انتہائی مشکل کام تھا۔ ان بحثوں نے نگار کے صفحات پر انھیں شہرے ہوئے معاشرتی تالاب میں ایک تلاطم پیدا کر کے نئی نسل کے ذہنوں کو تہذیبی کی برکتوں کو قبول کرنے پر آمادہ کیا اور اس طرح زندگی میں تہذیبی کے عمل کو تیز کر کے اسے آگے بڑھانے کا کارنامہ انجام دیا۔ اسی لیے

آزادی اظہار اور جرأتِ فکر ہمیشہ نیازِ فتنہ پوری اور نگار کی نمایاں خصوصیت رہی اور یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے نیاز اور نگار ہماری جدید تہذیبی و ادبی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔

نیازِ فتنہ پوری نے "ملاحظات" میں ہمیشہ اس مسئلے پر اظہارِ خیال کیا جو اس زمانے میں اہمیت رکھتا تھا اور اگر صرف ملاحظات کا ترتیب سے مطالعہ کیا جائے تو ہم اس دور کے ذہنی دھاروں کی سن واد تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے پڑھنے والوں کو مسئلے کے بنیے پہلو سے روشناس کرایا اور انھیں جذبات کے تلاطم میں راوا اعتدالِ عقیدہ کرنے اور اعتدال کے اس مخصوص رخ سے سوچنے کی طرف مائل کیا۔ انھوں نے ہمیشہ حق کی آواز بلند کی اور قلم کی آزادی اور اظہار کی جرأت کو کسی مصلحت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اظہار کی آزادی، فکر کی جرأت، فتنہ سے دل سے جذباتی مسائل پر سوچنے اور لکھنے کی قوت کو ایسی اہمیت دی کہ آج بھی ہمیں ان خصوصیات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور آج بھی مولانا نیازِ فتنہ پوری کی روحِ قلم ہمیں یہی راستہ دکھا رہی ہے۔ یہی وہ عظیم اور زندہ روایت ہے جس کے مولانا نیازِ فتنہ پوری علم بردار تھے اور یہی وہ روایت ہے جس کی آج کے دانشوروں اہل قلم اور ادیبوں کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی وہ روایت ہے جس سے قلم معاشرے میں جادو جگانا ہے اور زندگی کو پیچھے ڈھکیلنے کے بجائے آگے بلکہ بہت آگے بڑھانا ہے۔ کیئے آج نیازِ فتنہ پوری کا صد سالہ جشن مناتے ہوئے ہم اس بات کا عہد کریں کہ آزادی اظہار اور جرأتِ فکر کو ہم کسی مصلحت کا شکار نہیں ہونے دیں گے کہ یہی حقیقی ادیب اور حقیقی دانشور کا سرمایہ نیاز ہے۔

اشتیاق حسین قریشی بحیثیت مؤرخ

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی گونا گوں شخصیت کا اہدی پہلو یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک مؤرخ تھے۔ ایسے مؤرخ کہ ان کا ثانی دور دور تک نظر نہیں آتا۔ یہ بات میں نے اس لیے کہی ہے کہ مؤرخ تو اور بھی ہیں لیکن وہ تاریخی شعور جو مجھے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے ہاں نظر آتا ہے وہ اس طور پر ماضی قریب کے کسی مؤرخ میں نظر نہیں آتا۔

تاریخ نویسی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ تاریخ جس میں کسی دور کے نمایاں واقعات کو تسلسل کے ساتھ درج کر دیا جاتا ہے اور ان واقعات کا مجموعی بیان 'تاریخ' کہلاتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر اسی قسم کی تاریخیں لکھی جاتی ہیں۔ دوسری قسم تاریخ کی یہ ہے کہ مؤرخ تاریخی واقعات سے اس شعور اور درجہ زعمانہ کو تلاش کرے جنہوں نے مل کر کسی دور کے مزاج کی تشکیل کی ہے اور اس کی فکر، انداز نظر اور رویوں کو جو دیکھتا ہے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اسی دوسری قسم کے مؤرخ ہیں۔ انہوں نے بحیثیت مؤرخ تاریخ کو کھنگالا اور مختلف واقعات کے اجزائے کسی دور کی روح، اس کے مزاج اور اس کے انداز نظر کی تاریخ اس طور پر مرتب کی کہ تاریخی شعور اس دور کی زندگی کے آئینے میں نظر آنے لگا۔ اسی تاریخی شعور کی وجہ سے میں ڈاکٹر قریشی کو اس عہد کے عظیم مؤرخوں میں شمار کرتا ہوں۔ انہوں نے بڑے عظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ مخصوص تاریخی شعور کے ساتھ اسی انداز سے لکھی ہے جس انداز سے اسپینگلر نے ڈکلائن آف دی ویسٹ Decline of the West یا ٹرن بی نے اے اسٹڈی آف ہسٹری A Study of History لکھی ہے۔

ڈاکٹر قریشی تاریخ سے قومی شعور کو بیدار کرنے اور تاریخ ماضی سے اس شعور کے
 دھارے کو تسلسل کے ساتھ دیکھنے اور دکھانے کا کام لیتے ہیں۔ ایک دور دوسرے
 دور سے مختلف ہوتا ہے اور اسی لیے ایک دور کا انداز فکر اس کے ردیے اور زبان بھی
 مختلف ہوتے ہیں۔ ۱۸۸۵ء میں جس طرح لوگ سوچتے، چیزوں کو دیکھتے اور انسانی فرتول
 کے معنی سمجھتے تھے آج ۱۹۸۵ء میں لوگ اس سے مختلف انداز میں سوچتے اور دیکھتے ہیں۔
 ایسا کیوں ہے؟ ایک حقیقی مورخ اسی کا جواب تاریخ سے تلاش کر کے سامنے لاتا ہے
 اور یہی وہ چیز ہے جسے میں تاریخی شعور کا نام دیتا ہوں اور اسی لیے یہی ڈاکٹر قریشی نے
 ایک جگہ لکھا ہے ”ہر عہد کی روح ایک مختلف زبان میں کلام کرتی ہے۔ زمانے کی
 روح کے مختلف ہونے کی وجہ ہی سے ایک دور دوسرے دور سے مختلف ہوتا
 ہے اور حقیقی مورخ کا یہ بنیادی کام ہے کہ وہ اس روح کو سامنے لائے۔ آج ہونے والا
 واقعہ یا رجحان ماضی میں پیدا ہونے والے واقعے یا رجحان کا تسلسل ہوتا ہے جو مستقبل
 سے جا ملتا ہے۔ مورخ اسی تسلسل کو دریافت کرتا ہے اور فلسفی و مفکر بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر
 اشتیاق حسین قریشی اس لیے مورخ بھی ہیں اور مفکر فلسفی بھی۔

مورخ کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ ماضی کو زمانہ حال میں زندہ کر دے۔ نہ صرف
 زندہ کر دے بلکہ اسے ہمارے شعور کے ارتقا کا ایک حصہ بھی بنادے۔ کوئی خیال یا کوئی
 فکر اچانک آسمان سے نہیں آتے بلکہ وہ ایک پیر کی طرح دھیرے دھیرے پروان
 چڑھتے اور اپنی صورت بناتے ہیں اور پھر کہیں جا کر معاشرے کے ذہن کا حصہ بنتے
 ہیں۔ تاریخ ماضی کے اسی ارتقا کو زمانہ حال میں سامنے لانے کا نام ہے۔ ڈاکٹر
 اشتیاق حسین قریشی اپنی تصانیف میں یہی انداز نظر اختیار کرتے ہیں اور یہی ان کا مخصوص
 نظریہ تاریخ ہے۔

اس بات کو میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ مسلمانوں نے برصغیر میں تقریباً
 ایک ہزار سال حکومت کی۔ جب وہ یہاں گئے تو وہ اقلیت میں تھے۔ ایک طرف
 انھیں اپنی ممانعت کا مسئلہ درپیش تھا اور دوسری طرف انھیں اکثریت کے مذہب میں

جذب ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اسی لیے انھوں نے ان روشوں پر پوری احتیاط سے کام لے کر اپنی فکر اور اپنے نظام کو اس طور پر ڈھالا کہ وہ اکثریت کے غلبے سے محفوظ رہے۔ سولہویں صدی میں مسلمان تمام منظرِ بنگاہ ڈالنے کے بعد مطمئن نظر کرتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ اسلام کی قدروں کو عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ تینسیں واس کبیر واس، اگر وہ بالکل حقیقتاً اور نام و لہر وغیرہ کی تحریکیں اس کا ثبوت ہیں۔ ڈاکٹر قریشی نے لکھا ہے کہ تاریخ میں ایسا بہت کم ہوا ہے کہ ایک مذہب نے اس قدر مستعدی اور خلوص کے ساتھ دوسرے مذہب کی قدروں کو تسلیم کر لیا ہو جب کہ وہ مذہب زیادہ قدیم بھی ہو اور قیاسی فلسفے اور ترقی یافتہ مابعد الطبیعیاتی نظام بھی رکھتا ہو۔ اس سے پہلے ہندومت نے بودھ مت اور جین مت کے خلاف بڑی کامیاب جنگ کی تھی اور بہت سی اجنبی قوموں کو اپنے سماجی نظام میں جذب کر لیا تھا۔ اس نے کسی کسی اجنبی فلسفے کو اس طرح نہیں اپنا یا تھا۔ اسی لیے سولہویں صدی میں مسلمانوں کے لیے یہ ایک نہایت خوش آئند بات تھی۔ لیکن یہاں ڈاکٹر قریشی یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کبیر واس کی آواز میں کیا اسلام کی آواز بول رہی تھی یا یہ ہندومت کی آواز تھی؟ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلام کی آواز تھی لیکن بنیادی طور پر یہ آواز ہندومت کی آواز تھی جو اپنے سوشلسٹ اور پنہاں انداز میں اپنا کام کر رہا تھا۔ یہ ہندومت کا بنیادی تعقل ہے اسلام کا نہیں کہ ایک فلسفہ یا مذہب جو کچھ پیش کرنا چاہتا ہے وہ اس فلسفے یا مذہب کے عقیدے کی رسمی تکرار کے بغیر صرف اعمال کو اس فلسفے یا مذہب کے سانچے میں ڈھال دینے سے ہو سکتا ہے۔ ہندومت نے ہمیشہ ہی کیا ہے اور مختلف تصورات کے تحت بنا کر اپنے مندوں میں رکھ دیے ہیں۔ اگر ایک گروہ اپنے آپ کو دوسرے ہندوؤں سے مختلف سمجھتا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وقت گزرنے پر ہندو تصورات اور ہندو معیار آہستہ آہستہ چھن کر اس میں داخل ہونے لگتے ہیں اور آخر میں وہ اپنے ماحول کا ایک حصہ بن جاتا ہے اور دونوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ جائیداد اور چھوٹا باختر کے پوناہیوں اگر جوں وغیرہ کے ساتھ یہی ہوا اور آج وہ ہندومت کا ایک حصہ ہیں۔ اس دور کی

در اصل اسلامی قدروں کو قبول کر لینے میں ہندو مت کا افترا بی رحمان کام کر رہا تھا یہی صورت اس وقت پیش آئی جب مغربی تہذیب اور عیسائیت نے اسی قسم کے مسائل پیش کیے تو ہندو مت نے انھیں طریقوں سے ان کا جواب دیا۔ اس نے برہمنوں جیسے فرقے کی بنا ڈالی، بھگتی کا دھڑا کھنے والے اپنے اس اعلان کی تکرار سے کبھی نہیں تھکتے تھے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ کہ تمام مذاہب ایک ہی ہیں۔ اگر یہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے تو تبدیل مذہب بے معنی ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر ریڈا کہتے ہیں کہ مختلف مذہبوں کے لوگوں کو مریدوں کے حلقے میں داخل کرنے کا رواج بھگتی کے بہت سے متعللوں کی خصوصیت تھی یہ وہی صورت تھی جو صوفیائے کرام کرتے تھے۔ اس عمل سے ایک ایسا ماحول پیدا ہوا جس میں مذہبی مراسم اور برادری کے احساس کی قیمت اصل سے کم ہو گئی اور مذہب کی روحانی قدروں کو زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ بہت سے ذہنوں میں یہ بات گنے لگی کہ مذہب کی ظاہری صورتیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ اسی عمل کے ساتھ مسلمانوں میں مذہبی شعائر کی طرف رجحان کم ہونے لگا۔ یہیں سے وہ عمل شروع ہوتا ہے جس سے ہندوؤں نے باہر سے گئے والوں کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ پہلے باہر سے گئے والے ہندو مت کے چار دروز میں شامل ہوئے اور پھر رفتہ رفتہ ہندو دنیا کا حصہ بن گئے۔ پوری تاریخ کے دوروں میں ہندو مت کی یہ کوشش رہی ہے کہ دوسرے مذاہب سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے سب سے پہلے غلط انگیز تعلیمات کو اپنی اجنبی نوعیت کے باوجود اپنے پیروؤں کے بعض طبقوں کے عقاید میں جگہ دی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ان برادریوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی جائے جو ترک وطن کر کے برصغیر میں آئی ہیں یا اس کے اندر خود بخود پیدا ہوئی ہیں۔ برصغیر کی ملت اسلامیہ نے اس کو محسوس کر کے خود کو ہندو مت میں جذب ہونے سے بچائے رکھا۔

لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب مسلمان حکمران تھے۔ اب جب کہ ہندوستان کے مسلمان حکمران نہیں ہیں اور ہندو مت کے رجم و کرم پر ہیں یہ عمل شروع ہو چکا ہے اور وہاں اکثر طلبہ اپنی فراخ دلی کے اظہار کے لیے یا ملازمتوں کی خاطر مذہب کے خانے میں "انسانیت" کا لفظ نگہ رہے ہیں اور یہ ایک خطرناک رجحان ہے جس سے جذب ہونے کا راستہ ہموار ہوتا ہے۔

یہی صورت پاکستان میں ہمارے سامنے ہے۔ ہم بھی مغرب کے سیلاب فکر کے سامنے بے دست و پا ہو کر مغربی فکر میں جذب ہونے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تاریخ کو اسی انداز سے دیکھتے ہیں اور یہی ان کا مخصوص زاویہ تاریخ ہے جس میں وہ منفرد و ممتاز ہیں۔

میں نے اس مضمون میں ڈاکٹر قریشی کی تاریخ نویسی کے بہت سے رُخوں میں سے صرف ایک رُخ کو پیش کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ جدید مورخوں کو اسی انداز نظر سے کام کرنا چاہیے تاکہ جدید تاریخ نویسی کی حقیقی معنویت سامنے آ سکے۔

(۲۶ جنوری ۱۹۸۵ء)

پاکستانی فکر کی اساس

ایسے لوگ جسے کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تھے روز بروز کہاں پیدا ہوتے ہیں ؟
شاید میر تقی میر نے انہی کے لیے کہا تھا :

پیدا کہاں ہیں ایسے پر آگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو تیرے صحت نہیں رہی

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اسلام کے شیدائی اور سچے مسلمان تھے۔ جلت مسطہ کا درد ان کے نگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ ایسی دل سوڑی اور ایسی درد مندی کم کم دیکھنے میں آتی ہے۔ جہت علم، سرتاپا عمل، تحریر پر قدرت، تقریر پر قادر، مشفق بھی اور مخلص بھی۔ ۱۹۵۶ء میں جب ان کے ملا تھا تو ہی احساس ہوا تھا۔ اس وقت وہ مرکزی کابینہ میں وزیر تھے اور جب بلال احمد زہری صاحب کے ہمراہ ان سے آخری ملاقات ہوئی تو وہ اسلام آباد جانے کی تیاری کر رہے تھے اور جب اسلام آباد سے واپس آئے تو اپنے پیروں پر نہیں دوسروں کے کاغذوں پر آئے۔ انسان جب آتا ہے تو دوسروں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور جب جاتا ہے تو دوسروں کے کاغذوں پر ہوتا ہے۔ یہی دنیا کا دستور ہے اور یہی ہدیت ہے۔

اسی ہستی کی یاد میں جناب بلال احمد زہری صاحب نے محنت، محنت اور سلیقہ سے ایک یادگاری مجلد مرتب کیا ہے جس کے مطالعے سے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی شخصیت، فکر کے وہ تمام گوشے سامنے آجاتے ہیں جس سے وہ عبارت تھے۔ اسی لیے یہ کتاب سب کو پڑھنی چاہیے۔ تاکہ لوگ ایک سچے مسلمان، ایک اچھے انسان، ایک معتمد و دوست، ایک شفیق استاد، ایک اچھے مشقّم، ایک بلند پایہ مفکر اور ایک مستند مورخ کے کارناموں سے واقف و متعارف

ہو سکیں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا اندازہ فکر ایک ایسے محب وطن پاکستانی کا تھا جو ایک طرف تحریک پاکستان کا سپاہی اور دہائی تھا اور دوسری طرف فکر و نظر اور جہد و سبب و ثقافت کی سطح پر ان عوامل کو فکر پاکستان میں شامل کرنا چاہتا تھا، جو پاکستان کی پہچان ہیں اور جن سے پاکستان صحیح معنی میں ایک ملک اور پاکستانی صحیح معنی میں ایک جمہوریت کے رشتے ہیں پوست ایک متحد قوم بن سکتی ہے۔ اسی لیے وہ ہمیشہ تین بنیادی باتوں پر زور دیتے تھے۔ پہلی بات یہ کہ وہ اسلام کو پاکستان کی بنیادی شناخت سمجھتے تھے جس سے یہ ملک وجود میں آیا تھا اور جس سے یہ ملک قائم و دائم رہے گا ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ :

”میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کے بغیر پاکستان ہرگز قائم نہیں رہ سکتا۔

اگرچہ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ پاکستان کی وحدت کا سبب صرف

اسلام ہے۔ اس وحدت میں اور عناصر بھی شامل ہیں لیکن ان میں سب

سے زیادہ اہمیت اسلام کو حاصل ہے۔ اگر اسلام نہ ہو تو پاکستان

کے شیرازہ کو جمع رکھنا بہت دشوار ہے۔“ (ص ۱۲۰)

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے نزدیک اسلام زبانی جمع خرق کا نام نہیں ہے بلکہ وہ

تو سر اسر عمل کا نام ہے۔ ایسا عمل جس سے انسان کا کردار بنتا ہے۔ ایسا کردار جس سے

اسلام انسان کی روح میں سرایت کر کے معاشرے اور فرد کی شناخت بنتا ہے۔ اسی

لیے جب وہ موجود صورت حال کا تجزیہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ :

”ہماری ناکامیاں دراصل ہمارے کردار کی خامی کی وجہ سے

ہیں۔ پاکستان میں آئین ناکام نہیں رہا ہے بلکہ آئین کو چلانے والے ناکام

رہے ہیں۔ ہماری ناکام حکومتیں کردار کی خامی کی سبب سے صحیح نہ بن سکیں۔

اگر ہمارا کردار درست ہو جائے اور آئین ناقص بھی ہو تا تو بھی ہم کردار کے زور

پر اسے کامیاب بنا سکتے تھے۔ اگر آئین اچھا بھی ہو اور کردار ناقص ہو

تو آئین کبھی نہیں چل سکتا۔“ (ص ۱۲۲)

ڈاکٹر قریشی خود غرضی کو پاکستان کی بد حالی کا سبب جانتے ہیں :

"ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں خود غرضی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ہم اپنی چھوٹی سے چھوٹی غرض کو پورا کرنے کے لیے بڑے سے بڑے اصول کو قربان کرنے کے لیے تیار ہیں" (ص ۱۲۳)

"اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ رشوت لو! اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ رشوت نہ لو۔ جس قوم کے دل سے خدا کا خوف چلا جاتا ہے تو اس کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ صرف اسی دنیا کو مینا مانا ہے اور دنیا بھی ایسی نہیں بنتی جس سے ساری قوم یا ملک کو فائدہ پہنچے بلکہ مقصود محض ذاتی منفعت ہوتا ہے اور فرد بھول جاتا ہے کہ اگر قوم تباہ ہو جائے گی تو خود فرد بھی کہاں رہے گا۔" (ص ۱۲۳)

ڈاکٹر قریشی کے نزدیک دوسری بات جس سے پاکستان ایک ملک اور پاکستانی ایک متحد قوم بن سکتی ہے یہ ہے کہ قوم کو تعلیم اپنی قومی زبان میں دینی چاہیے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر اپنی زبان کو ترک کر دیا جائے یا پس پشت ڈال دیا جائے تو تھوڑے عرصے کے بعد جذبات بدلتے نہیں بلکہ مسخ ہونے شروع ہو جاتے ہیں اس لیے کہ جذبات یا جتنے خیالات ہاں تک ہوتے ہیں وہ ایک خاص طریقے سے نشوونما پاتے ہیں۔ ان کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ ان کے پیچھے تاریخی تجربات و حیات کی پوری کش مکش ہوتی ہے۔ اگر کسی اور جگہ سے زبان مستعار لی جائے تو نتیجہ اس کا یہی ہو گا کہ جذبات و خیالات بھی مستعد لینے پڑیں گے۔ جو چیز اس طرح سے مستعار لی جاتی ہے اس پر بھی انسان کو مزبور قاقا ہو حاصل ہو سکتا ہے اور نہ مستعار لی ہوئی قوتوں میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ انسان کو صحیح راستے پر چلا سکے۔ یہی سبب ہے جو قومیں اپنی زبان سے نا آشنا ہوتی ہیں وہ کبھی ایسا کارنامہ علمی یا فطری یا ذہنی پیش نہیں کر سکتیں جن پر انھیں فخر ہو۔ تمام ایسے ممالک میں جہاں اپنی زبان کو صحیح طور پر استعمال نہیں کیا جاتا خیالات کی ایسی پستی پائی جاتی ہے کہ دماغ بھی ترقی نہیں کرتے بلکہ ترقی بند ہو جاتی ہے۔ وہ ایسے درختوں کی طرح ہوتے ہیں جنھیں نہ دھوا

ملے نہ ہوا ملے، جو ششکر کر رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا معیار تعلیم مسلسل تکرر رہا ہے کسی دوسری زبان میں رٹ کر امتحان پاس کرنے سے دماغ کی ترقی یا علم کا فروغ نہیں ہوتا بلکہ دماغ شکوک و شبہ کر رہ جاتے ہیں۔ طالب علم میں حصول علم کی لگن ہی پیدا نہیں ہوتی، صاحبان اقتدار اس بات کی کتنی ہی مخالفت کر رہا لیکن یہی اور یہی بات اپنی جگہ درست ہے۔ انگریزی ضرور پڑھے اور خوب پڑھے۔ اس چھوڑی قدرت حاصل کیجیے میرا خیال ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص کو جہت بھی انگریزی آنی چاہیے لیکن اصل مسئلہ اسی انگریزی کرنے کا نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ تو ذریعہ تعلیم کا ہے۔ ذریعہ تعلیم اگر اپنی زبان میں ہو تو ذہن کی تخلیقی صلاحیتیں بیلہ ہو کر ہستی سے رفعت کی طرف جانے لگتی ہیں۔ یہ بات جتنی جلد صاحبان اقتدار کی سمجھ میں آجائے اتنا ہی قوم کے لیے مفید ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں کہ:

”یورپ کے فردن وسطیٰ میں تھوڑی بہت علمی ترقی جو ہوئی ہے، اس کی بنیاد تمام تر لاطینی پر قائم تھی لیکن کیا وہ علمی ترقی موجودہ علمی ترقی کا پاسنگ بھی تھی؟ یہ ظاہر ہے کہ موجودہ ترقی کسی غیر زبان کے ذریعہ سے نہیں ہوئی بلکہ قومی زبانوں کے استعمال سے بے سر آئی، چنانچہ انگریز جن کی تقلید کا بار ہم اپنے محلے میں اب تک ڈالے ہوئے ہیں، اس دن سے اپنی ترقی کی ابتدا شمار کرتے ہیں جب انجیل کا انگریزی میں ترجمہ ہوا اور لاطینی سے انھیں نجات ملی۔“ (ص ۵۰)

”علم اسی حالت میں ترقی کر سکتا ہے اور عوام میں پھیل سکتا ہے جب انھیں ان کی زبان میں اسے سکھایا جائے۔ ایک طرف ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں سائنس کی تعظیم عام ہونی چاہیے اور عوام کو سائنس سے تعلق ہونا چاہیے اور دوسری طرف ہم عوام کے اور سائنس کے درمیان وہ دیواریں کھڑی کرتے جاتے ہیں جس کی وجہ سے عوام کبھی سائنس سے روشناس نہ ہو سکیں گے۔“ (ص ۵۲)

تیسری بات جس پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم زور دیتے ہیں وہ اپنی میرٹ کا

احساس دشوَر ہے۔ موجودہ صورت حال کو دیکھ کر وہ کہتے ہیں کہ:

”اب ہمیں کسی چیز پر اعتماد نہیں رہا۔ ہمارے دل میں اپنی کسی رویت سے وابستگی اور اپنی میراث کے کسی حصے سے لگاؤ کا شائبہ بھی باقی نہیں۔ ہمارے احساس کمتری کا اس سے زیادہ اور کیا مظاہرہ ہو گا کہ ہمارے مسکانوں، محلوں، راستوں، اداروں، کلاخانوں حتیٰ کہ روزمرہ کے استعمال کی اشیاء تک کے نام غیر ملکی ہیں۔ ہماری قوم کے والدین کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کے بچے ایک خارجی زبان کو بے تکلف بول سکیں اور اگر وہ اپنی مادری یا قومی زبان بولنے سے یکسر قاصر ہو جاتے ہیں تو یہ بات مزید اطمینان کا باعث ہوتی ہے۔“

ڈاکٹر قریشی لکھتے ہیں کہ:

”جب میری نسل کا غضوانی شباب تھا تو ہمیں مسدس حالی کے بندہ ہانگ دراک کی پوری پوری نظمیں، شکوہ اور جواب شکوہ کے جتنے جتنے تھے ازبر تھے۔ شعر کے مجھے اور اس سے کُلف اندوز ہونے کی صلاحیت تھی۔ اپنے مسلمان ہونے پر فخر تھا۔ اپنے آبا و اجداد کے کارناموں پر فخر تھا۔ اگر کوئی ہمارے ماضی کو بُرا کہتا تھا تو ہمارا دل دکھتا تھا اور اگر کوئی ہمارے معتقدات پر حملہ کرتا تھا تو ہم ہا فروختہ ہوتے تھے۔ یہی تو وہ جذبات تھے جو ہماری قوت عمل کو بیدار کرتے تھے۔ یہی وہ رجحانات تھے جو پختگی پاکر ایک سیل رواں بن گئے اور جنھوں نے ہندی اور برطانوی سامراجیت کو اپنے راستے سے یوں ہٹا دیا جیسے دریا کا دھارا خس و خاشاک کو بہا کر لے جاتا ہے۔“

یہ کہہ کر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی پوچھتے ہیں کہ:

”میں اپنی کم کردہ قوم سے نہایت ادب کے ساتھ سوال کرتا ہوں کہ پاکستان حاصل کرنے کا جذبہ ہمارے دل میں شیکسپیر ٹپھ کر پیدا ہوا یا

خسارہ میں رہے گی۔ نہیں تو محض ایک بے کار انجود کے ہونے نہ ہونے سے کسی نیریاں کا کیا اندیشہ ہو سکتا ہے ؟

اسی بات کو وہ زندگی کے عام رویوں اور نظام اقدار میں دیکھتے ہیں تو انہیں بے حساب معاشرتی و اخلاقی کم زوریاں نظر آتی ہیں جنہوں نے قوم کو منتشر اور عدم اعتماد و بے یقینی کا شکار بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر قریشی کہتے ہیں کہ :

”کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا کہ ثقافت کی کم زوری سے آپ کی قوم میں خود غرضی، سہل انگاری، فرض ناشناسی، اخلاقی کم زوری اور اخلاق کی پستی کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ وہ اپنی عزت کیا کرے گا جو اپنے اندر کوئی چیز قابلِ توقیر نہ پائے۔ جو اپنی عزت نہ کرے اور خود داری سے ہینکا نہ ہو، وہ اپنے کردار کو کیا بلند کرے گا :

اور ہماری بد قسمتی دیکھیے کہ

”کوئی یہ نہیں جانتا کہ یہ سب نتیجہ ہے ایک بے پناہ احساس کمتری کے سیلاب کا جس کے مظاہر ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ یہ وہ بل ہے جس سے ملحد ساقم کے پھیلنے شروع ہو چکے ہیں“

یہی وجہ ہے کہ ہم اس وقت وحدت سے محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ بات واضح ہے وحدت و قومی یک جہتی از خود پیدا نہیں ہوتی اس کے لیے منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ خصوصی حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر اس حکمت عملی اور منصوبہ بندی کو محلہ سے لے کر ضلع تک اور ضلع سے لے کر صوبے تک اور صوبے سے لے کر سارے ملک کے چتے چتے تک پھیلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ گزشتہ چالیس سال سے ہم قومی وحدت و یک جہتی کے مسئلے کو اتوار میں ٹوال کر ایک ایسی ”طفلاذ خوش نہیں“ کا شکار ہیں کہ جس کے نتائج مکمل کرباب ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ انتشار بڑھ رہا ہے۔ دشمنوں کے ہاتھ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر ہماری بیج گئی میں مصروف ہیں۔ اگر مزید غفلت برتی گئی اور نئی حکمت عملی وضع نہ کی گئی اور صرف ایک ایک دن گزارنے پر کتفا کیا گیا تو ڈاکٹر قریشی کہتے ہیں کہ ”مزید غفلت

سے یہ خوف ہے کہ پانی سر سے نکل جائے : (ص ۴۷)

تشریش ناک بات یہ ہے کہ اس عمل کی طرف جو قومی تہذیبات میں سب سے اول ہونا چاہیے ہم کوئی توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ صرف وقتی اور لمبائی بنیادوں پر ہم مسائل کو منسلک میں معروف ہیں۔ قوم کی بے کرداری بے ضمیری اور مقصد و منزل کے نہ ہونے نے ہر چیز کو سبک کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ریل پٹری سے اتر گئی ہے۔ پٹری سے اترنے اور موجودہ صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ چالیس سال میں نا انصافیوں کی حکمت عملی نے، وحدت و یک جہتی کے عمل کو کم زور سے کم زور کر کیا ہے۔ مغربی پاکستان کو ن یونٹ بنا کر جس وحدت کا خواب ہم نے دیکھا تھا وہ نا انصافیوں کی حکمت عملی کو اپنانے سے پورا نہ ہوا۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان بھی اسی وجہ سے ہم سے الگ ہوا۔ نا انصافی کی حکمت عملی سے تہذیبی، سیاسی، تعلیمی، معاشی و معاشرتی ادارے بھی اس لیے ضعیف و خستہ ہو گئے۔ نا انصافی کی مثال اس گیند کی طرح ہے جسے جتنی قوت سے دلو اور پے مدا چائے گا وہ اسی قوت سے واپس آئے گی۔ اسی وجہ سے سارا معاشرہ رقصِ بسل کا تماشا بنی ہے اور خود کو بے یقینی کی کیفیت کے ساتھ غیر محفوظ محسوس کر رہا ہے۔ انصاف اور صرف انصاف، زندگی کی ہر سطح پر انصاف، قومی یک جہتی اور تہذیبی و سیاسی اداروں کی نشوونما کے لیے ویسا ہی ضروری ہے جیسے سانس کی آمد و رفت انسانی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ جو انصاف کو حکمت عملی بنائے گا۔ جو پورے اخلاص اور پوری دیانت کے ساتھ انصاف کو زندگی کی ہر سطح پر نافذ کرے گا وہی ایک زندہ، متوازن اور متحد معاشرے کو جنم دے سکے گا۔ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور یہی ہمارے اربابِ عمل و عقد کو بھی کرنا چاہیے۔ یہی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا نقطہ نظر ہے۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے۔

تاریخی شعور اور ڈاکٹر قریشی

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کے بارے میں آپ پہلے سے بہت کچھ جانتے ہیں اور بہت کچھ اُن کے بارے میں آپ فاضل مقرروں کی زبانی سُن چکے ہیں۔ مجھے بھی اُن سے اُس وقت سے شرفِ نیاز مندی حاصل تھا جب ۱۹۵۵ء میں انھوں نے میری پہلی کتاب کا مقدمہ لکھ کر مجھے ممنونِ کرم فرمایا تھا۔ میری یہ نیاز مندی نہ صرف ڈاکٹر قریشی صاحب کی وفات تک قائم رہی بلکہ کبھی میرے دل میں ان کی بڑی قدر و منزلت اس لیے موجود رہے کہ میں انھیں عہدِ حاضر کا ایک ایسا مسلم مورخ مانا ہوں کہ دوسرا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ مورخ کے ساتھ مسلم کا لفظ میں نے عمداً اس لیے استعمال کیا ہے تاکہ میں ڈاکٹر قریشی کے ذہن اور تاریخی شعور کو نمایاں کر سکوں۔ یہی وہ ذہن اور تاریخی شعور تھا جس نے بر عظیمِ پاک و ہند میں مسلم عوام کا اجتماعی شعور بن کر پاکستان کو وجود بخشا تھا۔ وہ پاکستان جس میں بر عظیم کے مسلمان "اسلام کی اقدار و روایات اور عہدِ حاضر کے تقاضوں کے ساتھ" ایک نئی زندگی کا آئینہ ڈگر کے "اسلام کی عظمت و رفتگی کی تجدید کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن جب آزادی کا سورج طلوع ہوا تو ہم نئے نئے تضادات کا شکار ہو کر اُس راستے پر چل پڑے کہ کبھی چالیس بعد ہم اسلام کی عظمت و رفتگی کی تجدید کے بجائے عہدِ جاہلیت میں داخل ہو کر نہ صرف خون کی ہولی کھیلنے کا شغل کر رہے ہیں بلکہ اس شائع کو بھی نہیں ہنس کر کاٹ رہے ہیں جس پر ہم خود کھڑے ہیں۔ اب ہمیں بڑی باتیں پریشان نہیں کرتیں بلکہ ہم چھوٹی اور اسفل باتوں سے اپنی زندگی کا سفر طے کرنے میں دن رات شغ و مدم سے مصروف ہیں۔ ڈاکٹر قریشی نے مسلمانانِ پاک و ہند کے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب یہ ہے کہ وہ "پست اخلاق کا شکار ہو کر ناقابلِیت اکوناہ یعنی

خود غرضی، غداری اور کوناہ نظر حکمت عملی کی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہی وہ صورت حال ہے جس سے ہر سطح کے اہل پاکستان کچھ بھی دوچار ہیں۔ ایک طرف ہندوستان ہے جو اپنی ڈھال ہزار سالہ تاریخی روایت کے عین مطابق مسلمانوں کو مٹانے کے درپے ہے جس کے رقبے بسل کا تماشہ گزشتہ ۴۴ سال سے مسلسل دیکھ رہے ہیں اور دوسری طرف ہم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی والے مسلم مورخ کے ذہن اور شعور سے دودھ پکڑا ۱۹۷۱ء میں ملک کا ایک حصہ گنوا چکے ہیں اور اب بھی تاریخ سے سبق سیکھنے بغیر اسی راستے پر گامزن ہیں۔ ڈاکٹر قریشی کا ناویہ نظریہ ہے کہ "ہندومت کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ دوسرے مذاہب سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے سب سے پہلے خلل انگیز تعلیمات کو ان کی اجنبی نوعیت کے باوجود اپنے بنیادی فلسفے میں نہیں بلکہ لہجہ بیرونیوں کے بعض طبقوں کے عقائد میں جگہ دی جائے اور اور اس کے ساتھ ان برادر یوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی سعی بھی کی جائے جو ترک وطن کے ذریعے برعظیم میں آئی ہیں۔" ہندوستان میں کچھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہندو قوم کے اسی مزاج کا لازمی نتیجہ ہے پاکستان اسی ہندو ذہن سے پکڑنے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے وجود میں آیا تھا مگر برعظیم کی مکتبہ اسلامیہ ہندومت میں جذب ہونے کا مقابلہ کر کے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھ سکے۔ ہندو ذہن اور ہندومت کی اگر تاریخی قوت کا اندازہ کرنا ہے تو دیکھیے کہ باہر سے جتنی قومیں آئیں خواہ وہ باختر کے یونانی ہوں یا راجپوت، جاٹ اور گہنڑ ہوں یا وسطی ایشیائے آریہ والی دوسری قومیں ہوں وہ سب رفتہ رفتہ اسی عمل سے، جس سے کچھ ہندوستان کے مسلمان دوچار ہیں، ہندومت میں جذب ہو گئیں۔ ہندومت نے جب فاتح بن کر حکمرانی کا علم بلند کیا تو اسی کے ساتھ محکوم قوم کو جذب کرنے کا عمل بھی شروع ہو گیا۔ ہندوستان کچھ پاکستان کو اپنا سب سے بڑا دشمن بنی لیے گردانتا ہے کہ پاکستان کا وجود اس کے تاریخی منصوبوں کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ بن گیا ہے۔ اگر کچھ پاکستان کے صاحبان اختیار اور باپ سیاست اس بات کو سمجھ لیں اور تاریخ سے سبق سیکھ کر اپنی حکمت عملی وضع کریں تو ہم نہ صرف اپنی قوم کو نئی زندگی بخشیں گے بلکہ اسلامی اقدار کے تحفظ کے سلسلے میں اپنا وہ کردار بھی ادا کر سکیں گے

جس کے لیے ہم نے اس ملک عزیز کو جو بخشا تھا اور اسے تقدس کے ساتھ پاکستان کا نام دیا تھا۔

اس ہندو ذہن کو جسے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اپنی تحریروں میں بے حد نمایاں کیا ہے اور جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے، آپ دیکھنا چاہیں تو اس تاریخ میں دیکھیے جو

The History and Culture of The Indian

People کے نام سے گیارہ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور ان گیارہ جلدوں میں سے صرف دو جلدیں مسلمانوں کی حکومت سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک جلد کا عنوان ”دہلی سلطنت“ ہے اور دوسری جلد کا عنوان ”مغلیہ سلطنت“ ہے۔ ان دونوں جلدوں میں بھی تاریخی مواد کو اس طور پر ترتیب دیا گیا ہے کہ ان سے دہلی سلطنت اور مغلیہ دور کی عظمت اور کارناموں کے بھائے اُن مختلف بارگزار ہندو ریاستوں کی داستان و تہذیب زیادہ نمایاں ہو کر ابھرتی ہے جو اُس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ تاریخ مسلمانوں کی تاریخ کو ہندو ریاستوں کی تاریخ میں جذب کرنے کے اسی عمل کو آگے بڑھاتی ہے جس سے ہندو مت کی تاریخ بھری ہوئی ہے اور جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اسی تاریخی شعور کو بزرگوار کی ملت اسلامیہ میں ابھارنے کی کوشش کرتے رہے اور یہی وہ تاریخی شعور ہے جس کی ہمیں نہ صرف آج بلکہ آنے والے زمانوں میں بھی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ یہی وہ تاریخی شعور ہے جو ہمارا دفاع کر سکتا ہے اور ہمیں ہندو مت میں جذب ہونے سے بچا سکتا ہے لیکن خواتین و حضرات! میں بھی کس تاریخی شعور کی بات کر کے آپ کا وقت خراب کرنے میں لگ گیا۔ ہمارا تاریخی شعور تو ماشاء اللہ اس وقت نسل، علاقائی اور لسانی بنیادوں پر اپنا الگ الگ وجود منوانے کے لیے ایک دوسرے کو قتل کر کے دن رات اسلام کی خدمت میں مصروف ہے۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے ہمیں دو بنیادی کام کرنے چاہئیں۔ ایک یہ کہ ”الہیت“ اور صرف الہیت کو حکمت عملی کے طور پر اختیار کرنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ ”عدل و انصاف“

کو۔ اور اس میں معاشی اور معاشرتی انصاف و وقوف شامل ہیں۔ زندگی کی ہر سطح پر اختیار و نافذ کرنا چاہیئے۔ تیسرے یہ کہ حکمت عملی وضع کرنے سے پہلے درمیش مسائل کا تحقیقی سطح پر تجزیہ کرایا جائے اور اس کے نتائج پر حکمت عملی کی بنیاد رکھی جائے۔ ہمارے ہاں اب تک ایسا نہیں ہوا ہے حالانکہ عہدِ حاضر کے سارے تمدن اور زندہ قومیں یہی کرتی اور ہی کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق حسین قریشی اس زاویہ نظر کے حامل اور اسی تاریخی شعور کے علمبردار تھے۔

(۲۶، اگست ۱۹۸۷ء)

اقبال اور تشکیلِ جدید

پاکستانیات کے مطالعہ کے لیے جامعہ کراچی میں ایک تعلیمی و تحقیقی ادارہ "مرکز مطالعہ پاکستان" کے نام سے کام کر رہا ہے۔ اس مرکز کو انگریزی میں "پاکستان اسٹڈی سینٹر" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس مرکز کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ مختلف علوم کے اشتراک و امتزاج سے ان "مشترک ذہنی، فکری، تاریخی، تہذیبی اور لسانی عوامل کی تلاش و تحقیق کرے جن سے "قومی یک جہتی کو فکری سطح پر فروغ حاصل ہو، تاکہ اس عمل سے ہم اپنی قومی شناخت کو دریافت اور اسے محسوس بنیادیں فراہم کر سکیں۔ یہ یقیناً بڑا کام ہے۔ اس کام کے لیے اہل تحقیق کو تعصب و تنگ نظری سے بلند ہو کر معروضی انداز میں داخلہ تحقیق دینے کی ضرورت ہے۔ تحقیق دراصل جھوٹ کو سچ سے، غلط کو صحیح سے، نادرست کو درست سے الگ کرنے کا نام ہے۔ وہ صاحبانِ تحقیق جو پہلے سے کٹیے یا نظریات متعین کر کے تحقیق کرتے ہیں، دراصل تحقیق کے راستے سے دُور ہو جاتے ہیں۔ تحقیق تو، جیسا کہ میں نے عرض کیا، سچائی کی تلاش کا راستہ اور اس کی منزل ہے۔ جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کا نام تحقیق نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تحقیق سے اکثر یہی کام لیا جا رہا ہے۔ ساری دنیا کی جدید و قدیم جامعات اسی لیے فکر و علم کا مرکز رہی ہیں کہ وہاں آزادیِ اظہار اور آزادیِ فکر کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے۔ اسی آزاد فضا میں علم کا سورج طلوع ہوتا ہے اور بصیرت کی روشنی انسانیت کے افق کو لالہ گوں کر دیتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ آزادیِ فکر و اظہار مادہ پر آزاد نہیں ہوتی بلکہ مخصوص دشائستہ نظم و ضبط کی حامل ہوتی ہے۔ اس کی ایک دانشورانہ سطح ہوتی ہے اور اس سطح پر اختلاف رائے ذاتی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ فکری اختلاف ہوتا ہے۔ اختلاف کے

فکر و دانش کی سطح پر اختلاف سے معاشرہ متحرک رہتا ہے اور متحد ہو کر اپنے خدو حال نمایاں کرتی ہے۔
 رہتا ہے۔ ہمارے ہاں اختلاف کی نوعیت ذہنی و فکری سطح کے بجائے ذاتی نوعیت کی بن کر رہ گئی ہے اور ایسی نئی دشمنیوں کا پیش خیمہ بن گئی ہے جس کا تماشا ہم جامعات میں اکثر دیکھتے ہیں۔ نہ لوگوں میں تحمل ہے اور نہ اہل علم میں قوت برداشت ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اختلاف کیجیے۔ دلائل دیجیے۔ اپنی بات دوسروں تک پہنچائیے لیکن یہ سب کام خوش دلی اور تحمل سے کیجیے۔ تشدد و آزادی اظہار اور آزادی فکر کا بدترین دشمن ہے۔
 انفرادی یا اجتماعی سطح پر جہاں تشدد و رونا ہوا وہاں کوئی اچھی چیز پروان نہیں چڑھ سکتی اور فکر و دانش اسی طرح منہ بسورتی رہے گی جس طرح ہمارے تعلیمی و تحقیقی اداروں میں دکھائی دیتی ہے۔ علم کا درخت وسیع مطالعے کی کھاد سے بڑھتا، پھیلتا اور سایہ دار ہوتا ہے جس کے نیچے علم کے پیلے طلبہ دم لینے اور اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ ایک بڑا اُستاد ایک ایسے ہی چھتار درخت کی حیثیت رکھتا ہے اور عجز و انکسار اس کی نشأت ہوتے ہیں۔ یہ قانون قدرت ہے کہ درخت پر جتنے زیادہ پھل ہوتے ہیں اس کی شاخیں اتنی ہی نیچے کی طرف جھکتی ہیں۔ یہی ایک اچھے اور بڑے اُستاد کی پہچان ہے۔ جیسے عجز و انکسار اور دلیل و تحمل صاحب علم کی پہچان ہیں اسی طرح علمی مباحثے، مذاکرے، سیٹلر سمپوزیم اور ورکشاپ تعلیمی اداروں کی پہچان ہیں۔ ان سے اداروں کی زندگی میں تازہ خون دوڑنے لگتا ہے اور جذبہ مسابقت پیدا ہو کر کام کرنے کا حوصلہ بیدار ہوتا ہے۔ اسی لیے میری ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ جامعہ کراچی کے اساتذہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں ملک و بیرون ملک مذاکروں اور سمیناروں میں شریک ہوں اور کپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ پاکستان کی ہر جامعہ سے زیادہ ہماری جامعہ کے اساتذہ مذاکروں اور سمیناروں میں شرکت کے لیے جاتے ہیں۔ اسی طرح میری یہ کوشش بھی رہتی ہے کہ ہمارے مختلف شعبے، ادارے اور مرکز کم از کم سال میں ایک مرتبہ قومی سطح کا سمینار منعقد کریں اور میرے لیے یہ اطمینان کا باعث ہے کہ گزشتہ تین چار

سال کے عرصے میں ہماری جامعہ میں ہیں سے زیادہ تعداد میں قومی و بین الاقوامی سطح کے سیمینار اور ورکشاپ منعقد ہوئے ہیں۔ "مرکز مطالعہ پاکستان" بھی گزشتہ دو سال سے قومی سطح کا سیمینار منعقد کر رہا ہے۔ پچھلے سال پاکستانی معاشرہ اور ادب کے موضوع پر دو روزہ ایسی نار منعقد ہوا تھا جس میں پاکستان کے صاحبانِ علم و ادب نے اپنے فکر و نگیز مقالات پیش کیے تھے اور خوشی کی بات ہے کہ یہ سب مقالات سلیقے سے کتابی صورت میں مرتب ہو کر آج شائع بھی ہو گئے ہیں۔ آپ دیکھیں گے تو اس لیے خوش ہوں گے کہ اس میں جتنے مقالات شامل ہیں وہ سب نہ صرف معیاری ہیں بلکہ غور و فکر اور وسیع مطالعے کے بعد لکھے گئے ہیں۔ ان مقالات میں جو تنوع ہے وہ کسی ایک کتاب میں مشکل سے ملے گا۔ اس سال جس سہ روزہ ایسی نار کا اہتمام کیا گیا ہے اس کا موضوع "اقبال : فکر اسلامی کی تشکیل جدید ہے۔ اس ایسی نار میں پڑھے جانے والے سب مقالے بھی انشاء اللہ اسی سال کتابی صورت میں شائع کر دیے جائیں گے۔

پاکستان کے حوالے سے یہ موضوع غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے اور ہمارے ملک کی غالب اکثریت اسلام کو اپنی معاشرتی و باطنی زندگی میں نافذ کرنے کی خواہش مند ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نفاذ کے لیے فکر اسلامی کی تشکیل جدید اساسی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال اس کے داعی بھی ہیں اور تبلیغ بھی۔ وہ آئندہ اسلامی ممالک میں اسی لیے اسلامی نشاۃ الثانیہ کی علامت بن گئے ہیں۔ ایران میں انقلاب کے بعد جتنا کام اقبال پر ہوا ہے اتنا کام پاکستان کو چھوڑ کر کسی اور مسلم ملک میں نہیں ہوا۔ ایران کے علی شریعتی اور حسین نصر نے بھی فکر اقبال سے اپنی فکر و بصیرت کا چراغ روشن کیا ہے۔ جن موضوعات اور سوالات کو اقبال نے آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے اٹھایا تھا وہ آج مسلم آئمہ کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فکر اقبال آج ساری مسلم دنیا میں روشنی کا ایک منبع بن چکی ہے۔ اقبال نے "دی ری کنسٹرکشن آف بریلیج بین تھوٹ ان اسلام" میں اپنے خیالات کو اس طور پر پیش کیا تھا کہ مسلمانوں کی فکر دور جدید کے مسائل اور عہدِ حاضر کے افکار کے دائرے

میں داخل ہو جاتی ہے۔

پاکستان میں اقبال پر بہت کام ہوا ہے اور سینکڑوں چھوٹی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اگر ادبیاتِ اقبال کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان میں سے بیشتر کتابوں کی حیثیت دراصل تو شخصی نوعیت کی ہے اور انہیں ہم زیادہ سے زیادہ تفہیمِ اقبال کے سلسلے میں "حواشی" کا نام دے سکتے ہیں۔ ان حواشی سے خیالاتِ اقبال کی تشہیر تو ہو جاتی ہے لیکن اس سے فکرِ اقبال کی روایت آگے نہیں بڑھتی "فکر" تو جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں تنقید سے قدم قدم آگے بڑھتی ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ اقبال پر تنقید کا ذخیرہ بہت کم ہے۔ اقبال نے، نیک ارادوں اور خلوصِ دل کے ساتھ عہدِ حاضر اور اسلام کے حوالے سے، ان بنیادی امور پر غور کیا تھا جن سے کسی قوم کی زندگی، اس کے ارتقا اور عروج و زوال کی داستان مرتب ہوتی ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم فکرِ اقبال کا تنقیدی جائزہ لیتے، اس سے آنکھیں چار کر کے اس طور پر چھان بین کرتے کہ فکرِ اقبال کی روایت دیاں سے آگے بڑھ سکتی جہاں خود اقبال نے آگے چھوڑا تھا۔ لیکن ہمارے مزار پرست ذہن نے جھوٹے احترام کا ایک ایسا مصنوعی ہال اس عظیم ہستی کے ارد گرد بنا دیا کہ اب اقبال سے بات کرتے ہوئے بھی اس لیے ڈر لگتا ہے کہ کہیں مزارِ اقبال سے محاورے اقبال دشمنی کا نام نہ دے دیں محالاً کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو کسی اندازِ نظر سے ہم اقبال اور فکرِ اقبال کو صحیح معنی میں آگے بڑھا سکتے تھے۔ روایتِ فکر تو کھلی، آزاد و فضا میں، تنقیدی سطح پر آگے بڑھ سکتی ہے ورنہ بصورتِ دیگر تو صرف حکم دیا جاسکتا ہے جس کی تعمیل ضروری ہے۔ اقبال نے جیسا کہ میں نے عرض کیا، بڑے درود و کرب کے ساتھ ان بنیادی مسائل پر غور کیا تھا جن کا تعلق دنیا نے اسلام کی زندگی و موت اور مستقبل سے تھا۔ اقبال کو ہم اسی طریقے سے حیاتِ نو دے سکتے ہیں جس طرح انھوں نے اپنے اسلاف کے افکار و خیالات کا تنقیدی محاکمہ کیا تھا۔ صرف پھولوں کی چادر چڑھانے یا مزارِ اقبال پر قولی کرانے سے ہم اقبال کو زندہ نہیں رکھ سکتے۔ اقبال نے زندگی کے مسائل کے بطن کی گہرائیوں میں اُسکر سوچا سمجھا تھا اور کربِ تخلیق سے گزر کر نئی فکر اور نئی مسلم تہذیب

کی جہت مقرر کر کے ہمیں ایک راستہ دکھایا تھا جس پر چلنا اور اسے صاف دکشادہ کرنا ہمارا فرض تھا، لیکن حسن اتفاق دیکھیے کہ ان کے اسی پہلو پر بہت کم کام اور بہت کم غور و فکر ہوا ہے۔

اقبال کے ۶ خطبات ۱۹۳۰ء میں شائع ہو چکے تھے اور ۱۹۳۴ء میں ایک خطبے کے اضافے کے ساتھ دوبارہ شائع ہوئے۔ پہلے چار خطبے علم اور مذہبی مشاہدات، مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار، ذات الہیہ کا تصور اور حقیقت دعا، اور خودی، جبر و قدر، حیات بعد الموت پر دیے گئے ہیں۔ ان خطبوں میں اقبال نے قدیم تصورات کو عہد حاضر کے تعلق سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ ان چاروں خطبات میں آپ کو عہد حاضر کی روح اور اس کے تقاضوں کا سراغ ملے گا۔ پانچویں خطبے میں اسلامی کلچر کی روح کو تلاش کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ چھٹے خطبے میں اجتہاد کو موضوعِ سخن بنایا ہے اور آخری خطبے میں اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ کیا مذہب کا امکان ہے یا نہیں وہ مسائل ہیں جو آج نہ صرف ہماری بلکہ ساری مسلم اُمّت کی تہذیب و سماج کی ضرورت ہیں۔

آج کا کلیدی خطبہ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے اقبال اور "عصر جدید میں اسلامی ریاست کا تصور" کے موضوع پر دیا ہے اور یہی وہ موضوع ہے جس پر ہمیں ۱۳ اگست ۱۹۳۴ء کے فوراً بعد ہی غور کرنا چاہیے تھا تا کہ ہم جدید اسلامی ریاست کو قائم کر کے اس کے سیاسی و تہذیبی ارتقاء کے لیے راہ ہموار کر سکتے۔ اقبال نے تحریک پاکستان کو فکری و جذباتی بنیاد پر فراہم کی تھیں لیکن پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ہمیں تعمیرِ مملکت کے لیے فکرِ اقبال کو نئے سرے سے تلاش کرنے کی ضرورت تھی مگر چوں کہ ایسا نہیں ہوا اس لیے ہم آج تک منزل سے دور کھڑے ہیں اور حیرتی بن کر کبھی مغرب کی طرف آنکھیں نہ کھول کر بے شعوری کے ساتھ اچھٹے لگتے ہیں اور کبھی نئے سرے سے اپنی منزل کے تعین کی غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں جن نظریات کا چرچا ہے وہ سب بیسویں صدی میں استعمال کی بجلی سے گندہ کفرِ سودہ ہو گئے ہیں اور تیزی سے ہو رہے ہیں۔ دنیا اب ان کے آگے بڑھ چکی ہے۔ یہ صورتِ حال وقت کے ساتھ ساتھ اور نمایاں ہو گی۔ اس لیے ضرورت

اس بات کی ہے کہ کرنے والے زمانے کے لیے ہم مسائل پر از سر نو غور کریں، نئے سوالات اٹھائیں اور ان کے جوابات تلاش کریں۔ راجتھاؤ کا مسئلہ بھی اسی لیے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس سہی نارے جو باتیں سامنے آئیں گی وہ نہ صرف فکر و نظر کے نئے راستے ہمارے سامنے کھولیں گی بلکہ پاکستان میں فکری روایت کو بھی مستحکم کریں گی۔

یہاں تک پہنچا تو یاد آیا کہ مجھے مقالہ نہیں بلکہ صرف خطبہ صدارت پیش کرنا تھا اس لیے خطبہ صدارت کے آداب کے پیش نظر میں اپنی بات، نیک تمناؤں کے ساتھ، اس پیش گوئی پر ختم کرتا ہوں کہ اس موضوع کے بحرِ مخجد کا ساحل بہت دور ہے اور ہماری کشتی بادبانی بھی ہے اور چھوٹی بھی۔

(۲۲ اپریل ۱۹۸۷ء)

مسجدِ قرطبہ

اقبال ایک عظیم شاعر ہیں اور ”مسجدِ قرطبہ“ اس عظیم شاعر کی ایک عظیم تخلیق ہے۔ جیسے عمارتوں میں تاج محل حسن و جمال کا شاہکار اور فنِ تعمیر کا کامل نمونہ ہے اسی طرح ”مسجدِ قرطبہ“ شاعری کا تاج محل ہے۔ اس نظم میں اقبال کے مفروض اس طور پر محفلِ مل کر ایک اکائی بن گئے ہیں کہ یہ نظم شاعری کا معجزہ بن گئی ہے۔ اس میں اقبال کی تخلیقی قوتیں اور ان کی فکر کے سارے بنیادی پہلو موجود ہیں۔ اس نظم میں اقبال کا فن ایسی بلندیوں سے ہم کنار ہے کہ خود کسی عظیم شاعر کی تخلیقی زندگی میں ایسا کبھی کبھار ہوتا ہے۔

مسجدِ قرطبہ آٹھ ہندوں پر مشتمل ہے۔ اس کے ہر بند میں آٹھ شعر ہیں۔ ہیئت کے اعتبار سے ہر بند غزل کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔ ہر بند کا پہلا شعر مطلع ہے اور باقی چھ شعر غزل کی طرح ہم قافیہ ہیں لیکن آٹھواں شعر اسی بحر میں ہونے کے باوجود ردیف و قافیہ کے اعتبار سے الگ ہو جاتا ہے۔ یہ شعر ایک طرف فکری و تخلیقی سطح پر پہلے بند سے پوری طرح وابستہ ہے اور دوسری طرف اپنے اگلے بند کے موضوعِ فکر کی طرف اشارہ کر کے اس سے وابستہ ہو جاتا ہے اور اس طرح نظم کے ارتقاء میں مدد دیتا ہے۔ جیسے ہر بند کا ہر شعر ایک دوسرے سے پیوستہ ہے، اسی طرح اس نظم کا ہر بند اپنی جگہ حسین و موثر بھی ہے اور ساتھ ساتھ پوری نظم سے ہم آہنگ بھی تاج محل کے مینار الگ الگ ہیں لیکن مینار الگ الگ ہیں اور مل کر ہی پوری عمارت کے توازن و آہنگ میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہی کاسیت اقبال کی نظم ”مسجدِ قرطبہ“ میں نظر آتی ہے۔ اس نظم میں اقبال نے ایسی نمونہ بنیاد

استعمال کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ بحر اسی نظم کے لیے وجود میں آئی تھی۔ اس بحر کو قدیم و جدید شعرا نے اکثر استعمال کیا ہے لیکن جب ہم اسے کسی دوسرے شاعر کے کلام میں دیکھتے ہیں تو ذہن فوراً ”مسجد قرطبہ“ کی طرف جاتا ہے۔ اس نظم کے زبان و بیان اس کی بندش و تراکیب، اس کی نغمگی اور کیفیت اس کی فکر کا مثبت رویہ ہیں ایک طلسم میں لے جاتا ہے۔ یہ نظم ان ساری خصوصیات کا مرکب ہے۔

مسجد قرطبہ مسلمانوں کے غرور و زوال کی علامت ہے۔ اس مسجد کی تعمیر آج سے بارہ سو سال پہلے عبدالرحمن الداخل نے شروع کی اور اس کی تکمیل اس کے جانشین ہشام نے ۶۰۶ھ میں کی تھی۔ مسجد جو ہر صفیادہ عظیم الشان ستونوں پر قائم ہے جن پر بے شمار حسن و جمیل نقوش کندہ ہیں۔ رقبے کے اعتبار سے یہ دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ برصغیر کی طرح اسپین میں بھی مسلمانوں نے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی اور سات سو سال تک یورپ کو درہم پاتہذب دے کر جدید علوم و فنون کا راستہ دکھایا اور پھر جب وہاں کے حکمران عیش پرستی میں مبتلا ہوئے، ان انصافیوں نے معاشرے کو اندر سے کھانا شروع کیا۔ خود غلامی اور نفسانفسی نے فرد کو معاشرے سے کاٹ ڈالا، عظیم مقاصد نابود ہو گئے اور مسلمان انہیں بھلا کر متحد نہ رہے اور الگ الگ فرقوں اور قبیلوں میں بٹ گئے تو اسپین کی یہ عظیم مسلم سلطنت نیست و نابود ہو گئی اور پھر یہ ہوا کہ ان کی مسجدیں بے اذان رہ گئیں اور سرزمین اندلس پر نام کو بھی مسلمان غرور بار۔ یہ ایک ایسی عبرتناک کہانی ہے جس سے ہمیں سبق لینا چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ جو قوم علاقہ پرستی کا شکار ہو جاتی ہے، عظیم مقاصد کو چھوڑ کر خود غلامی اور دولت بٹورنے پر لگ جاتی ہے، اس کے حکمران اور راہنما بے مقصد اور ہوس و جاہ پرست ہو جاتے ہیں، اس کا اقتدار بھی اسپین کی طرح ختم ہو جاتا ہے اور اس کی نسلیں دوسروں کی غلام بن کر رہ جاتی ہیں۔ اقبال جب قرطبہ جاتے ہیں تو اسپین کے مسلمانوں کا ماضی و حال ایک لمحے کے لیے ان کے سامنے آ جاتا ہے اور اقبال کے لیے ایک روحانی واردات بن جاتا ہے اور مسجد قرطبہ ماضی کی عظمتوں اور حال کی ویرانیوں کو بیک وقت جمع کر کے مسلمانوں کی عظمت اور ان کے زوال کی علامت بن جاتی ہے۔ اقبال اس نظم

میں مسلمانوں کے زوال کی تاریخ بیان نہیں کرتے بلکہ وہ مسلمانوں کے ماضی ان کے حال اور مستقبل کو بیک نظر نظم میں نمایاں کرتے ہیں۔ اقبال دوسری اقوام عالم کی طرح مسلمانوں کے عروج و زوال کو سلسلہ روز و شب سے پیدا ہونے والے تغیرات و انقلابات کا سبب بتاتے ہیں۔ نظم کا پہلا بند تغیر و انقلاب کے اسی نغمے سے شروع ہوتا ہے :

سلسلہ روز و شب نقشہ گر حادثات
سلسلہ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلہ روز و شب تاج و تاجیر و درنگ
جس سے بتاتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلہ روز و شب سازِ ازل کی نغمات
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و کم ممکنات

لیکن وہ قومیں اور وہ افراد جو "کم حیار" ہیں موت ان کا مقدر ہے۔ یہاں اقبال اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ تمام معجزہ بائے ہنرفانی اور کار جہاں بے ثبات ہے۔ اس بند میں فنا اور بے ثباتی کا احساس شدت کے ساتھ ہمارے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور جب یہ شعر آتا ہے :

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

تو یہ تاثر اور گہرا ہوجاتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ دوسرے بند کا پہلا شعر اس عالم عالیہ کسی میں ایک روشنی کی کرن لے کر سامنے آتا ہے :

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مرہ خدا نے تمام

اس کے بعد یہ کہہ کر اقبال ہمیں راستہ دکھاتے ہیں :

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فریغ

عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرا

اس بند میں اقبال عشق کی عظمت کا نغمہ چھیڑتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ عشق ایسا سیل ہے جو دوسرے سیل کو روک لیتا ہے عشق دم جبریل ہے عشق دل مصطفیٰ ہے عشق خدا کا رسول ہے اور عشق ہی خدا کا کلام ہے۔ اسی عشق سے زندگی کا نغمہ بھونکتا ہے۔ اسی عشق سے زندگی کا نور اور زندگی کی گرمی پیدا ہوتی ہے عشق کا مثبت اور گہرا تاثر دے کر تیسرے بند میں وہ براہ راست مسجد قرطبہ سے مخاطب ہوتے ہیں :

اے حرم قرطبہ عشق سے تیرا وجود

عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ خود مسجد قرطبہ اس عشق کی علامت ہے جس کا ذکر بند میں آیا ہے۔ اسی عشق سے انسان میں وہ تخلیقی قوتیں بیدار ہوتی ہیں جن سے معجزہ فن نمود پاتا ہے اور اسی عشق سے مسجد قرطبہ سراپا دوام ہے۔ مسجد قرطبہ اس عشق کا اظہار ہے جو سینہ آدم میں موجزن ہے۔ اصل چیز تو انسان ہے، ایسا انسان جس کے اندر عشق کی آگ روشن ہو، جس کے مقاصد اس کی زندگی میں آتش عشق کو فروزاں کر رہے ہوں، جس کا سوز و گداز زندگی کو ہل کر نیا رنگ روپ دے رہا ہو۔ یہ وہی مرد مسلمان ہے جس کی اذانوں سے سر کلیم فاش ہوتا ہے اور جس نے عہد قدیم میں ساری دنیا کو ایک ایسا پیٹھا دیا کہ جس سے دنیا کے اند جبرے دُور ہو گئے۔ مسجد قرطبہ سنگ و خشت سے بنی ہے۔ لیکن آج وہ اس کے جذبہ عشق کی علامت بن کر خود بندہ مومن کا راز آشکار کر رہی ہے۔ مرد مسلمان کے عشق کی تپش اور سوز و گداز سے اس کی روح و جود میں آتی ہے۔ یہی وہ عشق ہے جس سے بندہ مومن کا ہاتھ اشد کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ وہ ہاتھ جو غالب و کار آفرین بنی ہے اور کار کشا و کار ساز بنی ہے۔ یہاں اقبال مرد مومن کے عمل و کردار کی وضاحت کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ مرد مومن بندہ مولا صفات ہوتا ہے۔ اس کا دل ہر دو جہاں سے غنی ہوتا ہے۔ اس کا دل بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کی امیدیں اور خواہشات قلیل ہوتی

ہیں لیکن اس کے مقاصد جلیل ہوتے ہیں۔ اس کی ادا اور غریب اور اس کی نگاہ دلفناز ہوتی ہے۔ گفتگو کے وقت وہ نرم ہوتا ہے لیکن جستجو کے وقت وہ سرگرم ہوتا ہے۔ وہ بزم اور رزم دونوں جگہ پاک دل و پاک باز ہوتا ہے۔ اس کا یقین حق کی سچائی کی آواز ہوتا ہے۔ چوں کہ مسجد قرطبہ کو ایسے ہی مردانِ مومن نے وجود بخشا ہے اسی لیے مسجد قرطبہ ایک طرف کعبہ اور بابوئن بنی گئی ہے اور دوسری طرف دین اسلام کی سطوت کا نشان بن گئی ہے۔ اسی کے ساتھ اقبال کا تخیل ماضی میں جا رہا ہے۔ اُس ماضی میں جب عربی شہ سوز سرزمینِ اندلس میں داخل ہوئے تھے اور اپنے عشق اور جلیل مقاصد کے ساتھ اس سرزمین کو فتح کیا تھا، اپنی نگاہ سے مشرق و مغرب کی تربیت کی تھی، یورپ کے اندھیروں کو دور کیا تھا، اسے عقل کا راستہ دکھایا تھا اور اس سرزمین پر ایسے ابدی نقوش ثبت کیے تھے کہ آج بھی اندلیسوں کی روشنی میں اور آنکھیں ان عرب شہ سواروں کی یاد تازہ کر رہی ہیں۔ اس خیال سے اقبال کا لہجہ گداز ہو جاتا ہے۔ اب وہ دیکھتے ہیں کہ صدیوں سے قرطبہ کی فضا بے اذان ہے۔ یہاں اقبال کے قلب میں یہ خواہش موجزن ہوتی ہے کہ آخر عشقِ بلاخیز کا وہ قافلہ اب کہاں ہے جس نے اندلس کی سرزمین پر چراغاںِ حرم روشن کیا تھا۔ یہاں تغیر و انقلاب کا تصور دوبارہ سامنے آتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جرمنی کے مارشل توہتر نے اصلاحِ دین کی شورش برپا کر کے نقشبِ کہن سب مٹا دیے تھے۔ انقلابِ فرانس نے مغرب کی دنیا کو دگرگوں کر دیا تھا۔ روسیوں نے تجدید کے ذریعے اپنی مژدہ قوم کو پھر سے جوان بنا دیا تھا۔ اگر یہی عملِ سلامتی میں جاری ہو تو وہ بھی دوبارہ اپنے زوال کو عروج سے بدل سکتے ہیں۔ یہ دیکھ کر جب وہ دنیا سے اسلام پر نظر ڈالتے ہیں تو یہاں بھی انھیں وہی اضطراب نظر آتا ہے جو ترقی سے پہلے مغربی اقوام میں نظر آیا تھا۔ اس اضطراب کو دیکھ کر شاعر میں امید درجا کی لہر دوڑ جاتی ہے اودہ کہہ اٹھتے ہیں:

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اُبھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفرِی رنجِ بدلتا ہے کیا

اب عالمِ نوان کی نظروں کے سامنے پھر جانا ہے اور وہ اس کی سحر کو بے حجاب دیکھنے لگتے ہیں اور پھر وہ ترقی کا حقیقی راز ان دو شعروں میں بیان کر دیتے ہیں :

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی

روحِ اُم کی حیات کش مکش انقلاب

صورِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم

کرتی ہے جو ہر زمان اپنے عمل کا حساب

اقبال کے نزدیک ترقی کا راز یہ ہے کہ قومیں اپنی زندگی کو سنوارنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتی رہیں۔ بہر وقت اپنے اعمال کا حساب کرتی رہیں اور بدلتے ہوئے زمانے کے مطابق اپنے عمل کو ڈھالتی رہیں۔ مسلمان بھی اسی عمل سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ وہ آج جو کچھ ہیں، اپنی حالت کا جائزہ لیں، اپنے اندر تبدیلی پیدا کریں۔ تجدید سے اپنے افکار کو بدلیں اور ان افکار کے مطابق اپنے اعمال کو ڈھالیں۔ یہی ترقی کا راستہ ہے اور اسی سے نیا خون قوم کی رگوں میں گردش کرتا ہے۔ مُفکر کا، دانشور کا یہی کام ہے کہ وہ قوم کے لیے غور و فکر کا مسالا فراہم کرے اور اسے راستہ دکھائے۔

اقبال نے اس نظم میں بھی یہی پیغام دیا ہے اور ایک ایسے ملک کو دجو و بخشا ہے جو اسلام کا قلعہ بن جانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن جب اقبال نے اپنا کام ختم کیا، مُلک بن گیا اور آتشِ عشق کے فردزاں ہونے کا وقت آیا تو اس قوم نے خود غرضیوں، جو سر پرستیوں، حرص و جاہ کی خواہشوں، دولت بٹورنے کی اندگی آرزوؤں کی مٹی سے اس آتشِ عشق کو بجھانے کا کام شروع کر دیا۔ اس طرح ہر نئی صبح نئے مسائل لے کر آئی اور یہ مُلک عزیزِ ہماری ہداغالیوں کی تاریکیوں سے ذلیل و رسوا ہو گیا۔ روحِ اقبال جس نے نئی سحر کو دیکھا تھا اور اس بات کی منتظر تھی کہ

دیکھیے اس سحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا

مصنوب دے قرار ہو گئی۔ آئیے ہم سب غور کریں کہ صبح سے شام تک ہم جو کچھ کرتے ہیں اس سے مُلک و قوم کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ کیا ہم صرف اپنی ذات کی جھولی

بھر کر اپنی قوم کی حفاظت کر سکتے ہیں؟ کیا ہمارا یہ عمل عشق کی اس آگ کو، جسے فروزا کرنے کے لیے اسے وجود میں لایا گیا تھا، بجھا نہیں دے گا؟ اقبال کی نظم مسجد قرطبہ ہمیں یہی راستہ دکھاتی ہے :

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں دو قوم
کرتی ہے جو ہر زمانہ اپنے عمل کا حساب
نقش ہیں سب ناقص خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر

(۱۹۴۴ء)

اقبال کا پیغامِ عمل

اقبال ہمارے بڑے شاعر ہیں، ایسے بڑے شاعر کوئی دوسرا شاعر ان کے رنگ، ان کی فکر اور ان کے مزاج کا منظر نہیں آتا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانانِ برصغیر جس ابتلا میں مبتلا ہوئے، یوں معلوم ہوتا تھا کہ ملت کی کشتی اب کبھی ابھرنے کے گی۔ سرسید احمد خاں نے تہذیب کی اس گرتی دیوار کو سہارا دیا اور اسے دوبارہ کھڑا کر دیا۔ حالی نے عظمتِ رفتہ کے نغمے الاپے اور مسدسِ حالی سے ملتِ اسلامیہ کے خون کو نہ صرف گرمادیا بلکہ اس میں اپنے ماضی کا شعور بھی پیدا کر دیا۔ اکبر الہ آبادی نے اپنی منفرد شاعری سے اپنی اقدار اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کی اہمیت کا شعور پیدا کر کیا اور حالی کی طرح ان کے اشعار بھی ملتِ اسلامیہ کی زبان پر رواں ہو کر اس کے احساس اور اس کے جذبات کا حصہ بن گئے۔ یہ کام اس طور پر اس سے پہلے شاعری نے انجام نہیں دیا تھا۔ اس پس منظر میں اقبال کی صدا بلند ہوئی۔ اقبال نے نہ صرف اپنے دور کے جذبات و احساسات، افکار و خیالات، رجحانات و میلانات کو اپنی شاعری میں سمیٹا بلکہ روحِ عصر کو سمیٹ کر اسے ایک جہت، ایک سمت بھی دے دی۔ انہوں نے شاعری سے بیک وقت دو کام لیے۔ ایک یہ کہ اپنے معاشرے کے انسان کو اپنی تہذیب، اپنے مذہب، اپنے عقائد، اپنے اقدار کا شعور دیا اور اس پر واضح کیا کہ یہ وہ عقائد و اقدار ہیں جن سے وہ دوبارہ عظمتِ رفتہ کو حاصل کر سکتا ہے۔ جب فکر جذبہ بن کر انسان کی رگوں میں تیرنے لگتی ہے تو اس سے پیدا ہونے والی حرارت، حرکت و عمل کی طرف لے جاتی ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری سے ایک طرف شعور کو ابھارا،

اسے راستہ دکھایا، اس کی منزل کا تعین کیا اور پھر اسے نغمہ بن کر ایک زندہ جذبے میں
تبدیل کر دیا اور اسی جذبہ نے معاشرے کو عمل کا راستہ دکھا دیا :

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ

پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار

اور خاکِ سرے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

صداقت کا شعور اور اس پر ایمان وہ انسانی صفات ہیں جو زندگی کا رُخ بدل دیتی
ہیں۔ جو انسان کا خواب بن کر تعبیر مے لیے اسے بے چین کر دیتی ہیں۔ شاعر خواب دیکھتا
پھر اس خواب کو سارے معاشرے کو دکھاتا ہے۔ یہ خواب زندگی میں عمل کا پیغام
بن جاتا ہے جس کا حصول مقصدِ حیات بن جاتا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری سے یہی کام
کیا اور اس خوب صورتی اور ایسے سلیقے سے کیا کہ ملتِ اسلامیہ کے تئمر وہ میں جان
پڑ گئی اور وہ قوتِ عمل کا پیکر بن کر با شعور بن گئی۔ اقبال نے کہا :

نکل کے صحرائے جس نے روماکِ سلطنت کو الٹ دیا تھا

نسا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

اقبال کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اسلامی فکر کو نغمہ بن کر قلبِ انسانی میں ایک
ایسی حرارت پیدا کر دی کہ انسان قوتِ عمل کا پیکر بن گیا۔ یہی وہ شاعری ہے جسے قرآن
پسند کرتا ہے۔ یہ وہ شاعری نہیں جو انسان کے دل کو مژدہ اور اس کو افسردہ کر دے۔

وہ فکر، وہ فلسفہ، وہ ادب اور وہ شاعری جو صرف یہ کام کرتے ہیں انسانی فکر کو
پست کر دیتے ہیں۔ اقبال نے اپنی شاعری سے انسان کے حوصلے بڑھائے اور اسے
پیغامِ عمل دیا تاکہ وہ اس منزل تک پہنچ سکے جس کا تعین انھوں نے فکری سطح پر کیا تھا۔

اسی لیے اقبال کی شاعری نغمہ بھی ہے اور فکر و عمل کا فلسفہ بھی۔ اقبال کی شاعری کے
سلسلے میں ایک بات یہ اور کہتا چلوں کہ ان کا محبوب انسانِ کامل ہے۔ انسانِ کامل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی قدر ہے اور یہ وہ ذات ہے جو پیکر فکر بھی ہے اور پیکر عمل بھی۔ اقبال کی شاعری جو پیغامِ عمل اور پیغامِ فکر دیتی ہے وہ اسی عظیم ہستی کا آدرش ہے اور اسی طرح انسان کے دل و مہذب پر اثر کرتی ہے جس طرح اس بندہٴ مولا صفات کا پیغامِ حرکت و عمل کا پیغام ہے۔ اقبال کی شاعری اسی لیے توانائی قوت اور حرکت و عمل کی شاعری ہے اور اسی لیے اقبال بحیثیت شاعر عظیم ہے۔

(۸ نومبر ۱۹۸۸ء)

جوش ملیح آبادی

آج حضرت جوش ملیح آبادی کی وفات کو چھ سال ہو چکے ہیں اور وہ دارالحکومت پاکستان میں اپنی آخری آرام گاہ میں خوابیدہ ہیں اور تا ابد خوابیدہ رہیں گے لیکن ان کی شاعری کی گونج سارے برصغیر کے گوشے گوشے میں آئی ہے اسی طرح سنائے دے رہی ہے۔ انسان نفی ہے لیکن اس کے کارنامے لافانی ہیں۔ حضرت جوش نے جنگ آزادی کے دوران جس طرح برصغیر کے معاشرے کو شعور کی روشنی سے بیدار کیا اور جس طرح ہمدے والوں کی ترجمانی کی وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی تاریخ کا حصہ ہے اور جب بھی شعور آزادی بیدار کرنے کا ذکر آئے گا جوش کا نام سرفہرست ہوگا۔ وہ ایک بے باک انسان تھے۔ جو ان کے دل میں ہوتا وہی ان کی زبان پر ہوتا، اسی لیے معاشرہ اور اس کے زور در پنج افراد ان سے ناراض ہو جاتے۔ وہ آزادی اور انقلاب کے شاعر تھے اور آزاد اور انقلاب کا شاعر منافق نہیں ہوتا۔ حضرت جوش بھی منافق نہیں تھے اور اسی لیے وہ عظیم تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے ناراض ہونے والوں کی نسل صاف ہوتی جائے گی حضرت جوش کی شاعری کی دھوپ تاریخ کے دروہام پر پھیلتی چلی جائے گی مان کے مزاج میں دو دھارے ساتھ ساتھ بہتے تھے۔ ایک جاگیر دار اور انتظام کی روایت اور دوسرے انسان اور آدمیت کی حکمرانی کی روایت۔ معمولات زندگی میں وہ جاگیر دار اور انتظام کے حامل تھے لیکن ذہنی طور پر وہ فرو کی آزادی کے علمبردار تھے اور ایک ایسے معاشرے کے خواباں تھے جو جبر و استحصال اور نا انصافیوں سے پاک ہو۔ جہاں فرد کو اظہار کی پوری آزادی ہو اور جہاں انسانیت کا احترام کیا جاتا ہو۔ جب وہ اپنے خاندان پر فخر کرتے تھے تو جاگیر دار اور انتظام کی روایت ان کے شائقوں پر کھڑی ہو کر پکارنے لگتی تھی۔ جوش نے لکھا ہے کہ ”میری دادی کہتی تھیں بیٹا تیرے پردادا کی

سواری جب نکلنے لگی تو اس کے گنگے آگے نقیب بولا کرتے تھے: "ہٹو بھو، سواری آ رہی ہے نواب فقیر محمد خان بہادر کی"۔ ان کے دادا محمد احمد خان احمد بھی نواب تھے اور ان کے والد شہیر احمد خان بشیر بھی نواب تھے اور ان کے پردادا حسام الدولہ جہور جنگ فقیر محمد خان گویا بھی نواب تھے۔ خاندان کی یہ روایت معمول کے مطابق جوش صاحب کے خون میں شامل تھی اور اس لیے شامل تھی کہ انھوں نے اسی ماحول میں پرورش پائی تھی اور اسی ماحول سے بغاوت کر کے اپنی شاعری کا سوچا طلوع کیا تھا اور مظلوم انسان کی آواز کو سارے برصغیر کے دور دراز گوشوں تک پہنچایا تھا۔ مخصوص ماحول میں پرورش پا کر اس سے بغاوت کرنا اور عوام کی حمایت میں اپنی تخلیقی قوتوں کو استعمال کرنا ایک ایسا مشکل عمل ہے جس کو وہی صاحبان دل سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے فرد کی طرح پہاڑ کھود کر چوٹے شیر بردار کی ہے۔ ۱۹۰۷ء میں جب جوش صاحب کی عمر صرف ۹ سال تھی انھوں نے جو پہلا شعر لکھا تھا اس سے بھی میری اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ شعر آپ بھی سنیں:

شاعری کیوں نہ اس آئے مجھے

یہ میرا فنِ خاندانی ہے

اور پھر جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو ۱۹۳۹ء میں ان کی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے" نے سارے برصغیر میں جذبہ آزادی کی وہ آگ لگائی کہ یہ نظم کن بھی جنگ آزادی کی تاریخ کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ خاندانی روایت پر فخر اور جذبہ آزادی کا اظہار یہی وہ دو متضاد دھارے ہیں جن سے جوش کی شخصیت عبارت ہے۔ جوش کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کے لیے اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔ خاندانی روایت نے ان کی شخصیت میں جرأت دے ہاکی پیدا کی اور پیدا انشی و ذہنی قوتوں نے ان میں دہی بزرگیاں پر ضرب لگانے کا حوصلہ پیدا کیا۔ جوش صاحب نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"میں اپنی قوم کا ایک معنوب، مبغوض اور مظلوم انسان ہوں اور

اس بنا پر مظلوم ہوں کہ میری قوم کے نزدیک مجھ میں یہ بدترین عیب پایا جاتا

ہے کہ میں اقوال و اساطیر، روایات و ملفوظات، اکھبات و مسلمات اور ایقان و

اعتماد کو محکم دلائل کی کسوٹی پر کسے بغیر قبول نہیں کرتا۔ تشنگ کو عرفان و
حقائق کی کئی بھٹتا، تقلید پر اجتناب کو فوقیت دیتا ہے کچے بوجھے ایمان پر کچے
بوجھے کفر کو ترجیح دیتا ہوں اور کلمۂ حق کے اظہار و اعلان میں اس بلا نگہ جری
ہوا ہوں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے دیکھے کا تصور بھی نہیں کر سکتا
(انکار جوش نمبر ۱۶)

شاعرانہ زندگی میں فکری و تخلیقی سطح پر یہی انداز نظر ان کی کامیابی کا راز تھا اور ذاتی
زندگی میں یہی انداز نظر ان کی ناکامیوں کا سبب تھا۔ ۱۹۳۷ء میں اسی وجہ سے وہ حیدر آباد
دکن سے نکالے گئے۔ اسی وجہ سے وہ ترقی اردو بورڈ کراچی سے الگ ہوئے اور اسی وجہ سے وہ
اسلام آباد میں دنگ بھونگے رہے اور آج حضرت جوش اپنی آخری آرام گاہ میں بیٹھے ہوئے اس
طبقاتی شہر کی تہذیبی و تخلیقی زندگی کو احوالاً بخش رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب ہم اپنی معاشرتی
تہذیبوں کے عبوری دور سے گذر کر انسانی، انسانی اور صوبائی تعصبات سے بلند اٹھ کر فی الحقیقت
روح پاکستان کو جنم دیں گے تو سرزمین اسلام آباد اس عظیم شاعر کی روح کو دوبارہ دریافت
کرے گی اور اس کے کلام کو اپنے سینے سے لگا کر اُسے وہ اہمیت دے گی جس کا ہمہ وجہ وہ
مستحق ہے۔ حضرت جوش شاعر انقلاب بھی ہیں اور شاعر آزادی بھی اور شاعر انسانیت
بھی ہیں اور شاعر رومان بھی اور انھوں نے جس طہر پر لفظوں کو رنگ و لذت بخشا ہے اور
جس سلیقے سے انھیں تخلیقی سطح پر برتا ہے اس دور کا کوئی دوسرا شاعر اس مرتبے کو نہیں پہنچتا۔
فراق گورکھپوری نے کہا تھا کہ میں جہاں احساس و جذبے کے اظہار کے لیے لفظ ڈھونڈتا
رہ جاتا ہوں جوش انھیں آسانی سے شعر کا جام پہنارتے ہیں۔

حضرت جوش کو پہلی بار میں نے اُس وقت دیکھا جب وہ کل ہند مشاعرے میں شرکت
کے لیے میرٹھ گئے تھے۔ یہ ۱۹۳۷ء کی بات ہے اور میں اس وقت انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا۔
ہمارے کالج میں بھی ایک بڑا مشاعرہ ہوا جس میں متعدد مشہور شاعروں کے علاوہ مجاز اور
جوش بھی موجود تھے لیکن ان سے ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ پاکستان گئے اور کراچی میں
مقیم ہوئے۔ ہر تھپتھپ مشاعرہ ہوئی۔ کبھی میرے گھر پر اور کبھی مبین الحق صدیقی کے گھر پر جس میں

کراچی کے نامور شعراء شریک ہوتے اور دم بہر کو کھانے کے بعد یہ محفل برخواست ہوتی۔
 اُن کے ہاں اکثر چائیاں ہوتا۔ ایک دن میں اور مولانا اعجاز الحق قدوسی مرحوم اُن کے ہاں بیٹھے تھے۔
 دم بہر کا وقت تھا۔ قدوسی صاحب کو پیاس لگی۔ ملازم ریفریگرٹر سے ایک بوتل اور
 گلاس نکال لایا۔ جوش صاحب میری طرف مخاطب ہو کر بولے ”عالی صاحب! نرم کی بوتل میں
 پانی؟ غالباً نرم کی بوتل کا خیال انھیں مولانا قدوسی کی سفید ڈالٹھی دیکھ کر آیا تھا۔ اتنے میں مولانا
 پانی پی چکے تو جوش صاحب بولے :

مولوسی نے اپنا دامن سی لیا

اُگ کی بوتل سے پانی پی لیا

ایک اور واقعہ یاد آیا۔ ۱۹۵۹ء میں ایرانی سفارت خانے سے دعوت نامہ آیا۔ جوش
 صاحب، پیر حسام الدین راشدی ایک ساتھ گئے اور میں مولانا قدوسی اور مصین الحق صدیقی
 جو بعد میں مغربی پاکستان اسمبلی کے اسپیکر بنے، دوسری گاڑی میں گئے۔ جوش صاحب
 سفارت خانے میں ہم سے پہلے پہنچے اور ہمارے پہنچنے سے پہلے واپس آ گئے۔ ہم دیر سے پہنچے
 تھے۔ محفل برخواست ہو چکی تھی۔ ایک صاحب نے بتایا کہ وہ ہمیں اپنے گھر بلانے میں رات
 کے دس بجے تھے۔ ہم ان کے گھر پہنچے۔ دیکھ کر بولے ”اچھا ہوا آپ لوگ آ گئے۔ مجھے سخت
 وحشت ہو رہی تھی۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب جوش صاحب نے ریڈیو کے مشاعرے
 سے ”بول اک تارے جمن جمن جمن“ نظم پڑھی تھی اور اس بات پر کہ انھیں مشاعرے میں
 سب کے بعد پڑھوایا گیا تھا چند مفاد پرست حاسدان کے خلاف اخبار ڈان ”سین خط شائع
 کر رہے تھے اور ہر قسم کی اہمل باتیں لکھوا رہے تھے۔ میں نے کہا جوش صاحب نظم تو بیت
 اچھی تھی۔ اس نظم میں تصویر انسان الوہیت کے اس درجے پر پہنچ گیا ہے جہاں رنگ و نسل اور
 قوم و ملت کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ کہنے لگے ”میں نے اسی موضوع پر لکھی ہے لیکن انداز
 بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ مابعد الطبیعیاتی موضوع سہل ہو کر ہر خاص و عام کے ذہن میں اتر جائے۔
 اس کے علاوہ اس کے الفاظ اور ساتھ ساتھ کھر جوش نے استعمال کی ہے وہ ساری نظم کو موسیقی
 کر رہی ہے۔“ میں نے کہا ”جوش صاحب! یہ نظم پھر شہنشاہی جلنے۔“ یہ سن کر

انہوں نے آواز دی "ذرا ہیگ بھیج دو" جواب میں اندر سے آواز آئی "ابھی تو ججج کر آئے ہو۔ اب پھر شروع کر دیا۔" یہ ان کی میم تھیں۔ راز دارانہ انداز میں جوتش صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر کہتے سے پہلے "ما دیر مہربان ہیں۔" انہیں ہر دم ہماری صحت کا خیال رہتا ہے۔"

جوتش صاحب باغ و بہار انسان تھے۔ محفل میں بیٹھتے تو ایسے کہ سب کی توجہ کامرکز بن جاتے اور محفل کو ایسے سچائے کہ سب عالم محویت میں آ جاتے۔

ساری عمر یونہی بسر کی۔ از سر تا پا شاعر تھے۔ یہی ان کی زندگی تھی اور یہی ان کا اوڑھنا بچھونا۔ روشن دماغ بھی تھے اور وسیع القلب بھی۔ کینہ پروری سے دور اور سچائی کے لہجہ میں بے باک۔ ادیب و شاعر کی ضروریات زندگی تو عام آدمی کی سی ہوتی ہیں لیکن وہ عام آدمی سے اپنے رویے اور طرز عمل میں مختلف ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ہاسی معاشرہ اس سے متصادم ہو جاتا ہے۔ جوتش صاحب کے ساتھ بھی یہی ہوا اور شاید جب تک یہ نظام موجود ہے ہم ادیب و شاعر کو مفلس و مفلوک الحال دیکھ کر اسی طرح مسرور و شادماں رہیں گے۔ نئی نسل کے نام ان کا پیغام یہ تھا۔ آپ بگائیں لیجیے :

نخواستہ شاعر و شاعر جھاؤ گے تقلید یونہی رہی تو بھٹاؤ گے
جب تک مجھے گرم نہیں کرو گے بچو کہتا ہوں کہ اپنے کو نہیں پاؤ گے

۱۹۳۰ء میں جب جوتش ملیح آبادی کا پہلا مجموعہ "روح ادیب کے نام سے شائع ہوا تو انکار الہیائی نے لکھا کہ "آپ نے چشم بد و دور عمدہ طرز بیان پایا ہے۔ ہاسی سوسائٹی میں رہ کر ایسے خیالات علیٰ غررت اظہار ہیں۔"

آج جوتش کو ہم نے صرف لفظوں کی گھن گرج کا شاعر سمجھ لیا ہے حالانکہ ان کی شاعری میں وہ تنوع اور وہ رنگارنگی ہے کہ اس صدی کے چند شاعری ان کے مرتبے کو پہنچتے ہیں۔

نگار خانہ گیتی مرے کلام کا تحفہ طلسم خانہ گرد دل مرے سخن کا شکر

جوش کی وفات پر

آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ کسی عزیز ہستی کی موت پر ہونے والے تعزیتی جلسے میں کچھ کہنا اور وہ بھی اتنی جلدی کہ اس عزیز کی وفات کو مشکل سے دو دن ہوئے ہوں اور اب اسے جو شک نہ ہوئے ہوں، یقیناً ایک انتہائی دشوار کام ہے۔ میں کیا کہوں یا مجھے کیا کہنا چاہیئے یہ مجھے خود بھی معلوم نہیں ہے البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ جب گیارہ بجے کی خبروں میں جوش صاحب کی وفات (۲۶ فروری ۱۹۸۲ء) کی خبر سنی تو یوں محسوس ہوا جیسے مجھ پر اچانک بجلی گر پڑی ہے۔ مرنا برحق ہے لیکن دلہندوں اور پیاروں کا مرنا ایک ایسا سانحہ ہے جسے یاد کرنے والے ساری عمر آنسوؤں کے ساتھ یاد کرتے رہتے ہیں اور یہ وہ زخم ہے جو ہمیشہ رستا رہتا ہے۔ جوش صاحب ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دوست تھے۔ میرے بھی بزرگ دوست تھے۔ یادوں کی ایک پوری برکت ہے جو ذہن کے درجوں سے جھانک رہی ہے لیکن ان یادوں کو دہرانے کا نہ یہ موقع ہے اور نہ اس وقت ان کو بیان کرنے کی مجھ میں تاب ہے۔ میں تو اس وقت صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جوش صاحب آج ہم سب سے ہیں۔ ان کے نہ ہونے سے دنیائے ادب کی ساری محفل ٹوٹی اور ان اور اُس ہے۔ یہ تو وہ موقع ہے کہ ہم صرف آنسوؤں سے اس عظیم انسان کو خراج عقیدت پیش کر سکتے ہیں۔ جوش صاحب کی موت ایک قومی سانحہ ہے۔

اس کے بعد بھی اگر مجھے کچھ کہنا پڑے تو میں یہ کہوں گا کہ حضرت جوش ہمارے دور کے عظیم شاعر تھے جنہوں نے اپنی شاعری سے اردو زبان کو نئی بلندیاں عطا کیں اور جنہوں نے اپنے دو مکمل ادبی کاغذ ہمارے شاعری میں اس طرح پر کیا کہ ان کی شاعری سارے بڑے عظیم پاک و ہند ادب کی ترجمان بن گئی۔ بے شک مصلحت سے بے گمانہ ادا آزاد خیالی۔ جوش ساری عمر زمانے

سے لڑتے رہے۔ زمانہ ہاتھ ساز نہ تو بازماند ستیزان کا فلسفہ حیات تھا۔ اسی لیے مصلحت پسند منافقین انہیں طرح طرح سے تکلیف داکر مائنس میں مبتلا کرتے رہے۔ جوش صاحب کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو ہتھیار ڈال کر صلح کر لیتا اور ان جیسا بن کر چین کی پانسری بچاتا لیکن جوش ان ساری طاقتوں قوتوں سے تنہا ٹھکراتے رہے اور ان کے دئے ہوئے زخموں کو خندہ پیشانی سے پہنتے رہے۔ جوش صاحب ٹھٹھے دل و دماغ کے آدمی تھے۔ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا اور ان کی اخلاقیات منافقت سے اور ان کی زندگی قول و فعل کے تضاد سے پاک تھی۔ جوش صاحب ایک عہد آفریں شخصیت تھے۔ ایک ایسی شخصیت جو زندگی ہی میں انسان بن گئی تھی اور جن کی شہرت بزرگیم کے حدود سے نکل کر دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچ گئی تھی۔ وہ جدید دور کے وہ شاعر تھے جو اپنی زندگی میں کلاسیک کا درجہ اختیار کر گئے تھے۔ ایسے عظیم انسان اور عظیم شاعر روز بروز پیدا نہیں ہوتے۔

جوش صاحب انسان اور انسانیت کے شاعر تھے اور اسی لیے وہ تعصبات سے پاک تھے۔ ان کی شاعری اسی لیے کسی ایک طبقے، ایک علاقے یا ایک فرقے کو متاثر نہیں کرتی بلکہ ساری انسانیت کے دلوں پر حکمرانی کرتی ہے۔ جوش کی شاعری نے بزرگیم کی جنگ آزادی میں وہ عظیم کردار ادا کیا کہ شاید ہی بزرگیم پاک و ہند کی کسی بھی زبان کے کسی اور شاعر کے بارے میں یہ بات کہی جاسکے۔ جوش آزادی کے رجحان تھے۔ انقلاب کی وہ دودھاری تلوار تھے جس نے استعمار و آمریت کے خلاف مقدس جہاد کے اُسے پہولہان کر دیا۔ ان سے بڑا انقلابی شاعر اردو زبان نے پیدا نہیں کیا۔ فرقہ گو رکھپوری نے کہا تھا کہ حضرت جوش نازک و لطیف ترین احساسات اور نامعلوم و مبہم جذلوں کو اس طرح آسانی اور خوب صورتی سے بیان کے رشتے میں پرو دیتے ہیں کہ جہاں عجز کلام سے دوسروں کی سانس بھولنے لگتی ہے۔ جوش وہ شاعر ہیں جن کی شاعری نے کئی نسلوں کی آسپاری کی ہے اور اقبال کے علاوہ اس صدی کے کتنے شاعر ایسے ہیں جو اس دائرے میں آتے ہیں۔ انگریز آبادی نے جوش کے پہلے مجموعہ کلام کے بارے میں جس میں بقول جوش "نوبیس کی عمر سے لے کر ۱۹۳۰ء تک کا کلام" شامل تھا، کہا تھا کہ "اس وقت آپ کی طبیعت کا جو رنگ ہے اس پر ایک اذیل پر تو پڑ رہا ہے۔

کاش کسی وقت میں آپ اور اقبال یکجا ہوتے۔
جوش ساری زندگی ایسے آدمی کی تلاش کرتے رہے جن کے سر میں مغز ہو اور مغز میں ہیکل ہو

اور

جن کی فکر تازہ میں ہو اجتہادی بائین جن کی عقلوں پر نہ ہو بار و آیات کہن
جن کے سینے میں ہوں روشن حیدر ملت کے چراغ دل تو دل، دل کی طرح جن کے دھڑکتے ہوں لہجہ

الغرض میرے وطن کو زندگی دے اے خدا

آدمی دے آدمی دے آدمی دے اے خدا

اسی آدمی کی تلاش کرتے جوش صاحب اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ آپ نے ہم سب
بھی روایت جوش کی پیروی میں اس آدمی کی تخلیق و پیدائش کے لیے سعی و کوشش کریں جس کی
آرزو ہے کہ جوش صاحب اب ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے ہیں۔ جوش صاحب
نے کہا تھا:

مذاق بندگی عصرِ نو کی مجھ کو قسم

نئے مزاج کا ہر درگاہ پیدا کر

جوش کو یاد کرنے اور غریب عقیدت پیش کرنے کا ایک مثبت طریقہ یہ ہے کہ ہم عقل کی سطح پر اجنبانہ
کو اور جذبات کی سطح پر حب الوطنی کو اختیار کریں اور ادوایام پرستی اور بے جان فرسودہ اقدار سے دامن بچ کر
اگلے بڑھتی ہوئی زندگی سے آنکھیں ملانے کا شعور پیدا کریں۔ اسی میں ہمارے مستقبل کا راز
پوشیدہ ہے اور یہی بات ساری عمر جوش صاحب ہم سے کہتے رہے ہیں۔ خدا انہیں خوش رکھے
اور فردوس بریں میں مقامات بلند عطا فرمائے۔

جوش کے لطیفے

کسی قوم کی تخلیقی بیماری کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس کے ہاں لطیفوں کی پیدائش کا سلسلہ بند ہو جائے۔ لطیفے کسی قوم کی تخلیقی صلاحیتوں کی تاریخ کے قدموں کے نشان ہیں جن سے ہم اس قوم کی پسند و ناپسند، اس کے رویوں، مزاج اور اندازِ نظر کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ ایک طرف وہ لطیفے ہیں جو مجموعی طور پر سادے معاشرے کے مزاج پر روشنی ڈالتے ہیں اور جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کدھر جا رہا ہے۔ دوسری طرف وہ لطیفے ہیں جو کسی فرد کی ذات سے مختص ہیں اور خود اس شخصیت کی تاریخ ہی جلتے ہیں۔ مولانا حالی نے پہلی بار یادگار غالب میں غالب کے لطیفوں کو کچا کر کے انھیں غالب کی شخصیت کا جزو بنادیا آج ہم ان لطیفوں کے ذریعے غالب کی شخصیت کا اندازہ کرتے ہیں۔ اگر یہ لطیفے نہ ہوتے تو اندازہ کیجیے کہ غالب کی شخصیت آج کس قدر مختلف ہوتی! لطیفے جذبات، احساسات اور خیالات کا برجستہ اور پر محل اظہار ہوتے ہیں جس میں شخصیت بجز کسی تصنع یا بناوٹ کے کھل کر سامنے آتی ہے۔

جوش صاحب بارغ وہیار آدمی ہیں۔ اُن کے پاس میٹھے تو اٹھنے کو جی نہیں چاہتا سائن کی ظرافت، اُن کی ذہانت و طنزائی کی نشان دہی کرتی ہے۔ یہاں جو چند لطیفے — اور اس لفظ کو میں وسیع معنی میں استعمال کر رہا ہوں، میں نے پیش کئے ہیں اُن سے جوش صاحب کی شخصیت اور مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

(۱)

۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ میں اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا

تھا کہ میرٹھ میں کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس مشاعرے میں ہندوستان کے سارے معروف و مشہور شعرا جمع ہوئے تھے۔ بڑا سا ہنڈال بنایا گیا تھا۔ دور دور سے لوگ مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ برسوں بعد جوش و جگر ایک ساتھ مشاعرے میں شرکت ہو رہے تھے اس بات کی بھی بڑی دھوم تھی۔

مشاعرہ شروع ہوا، اور تقریباً رات کے ڈیڑھ بجے جوش صاحب کی باری آئی۔ جوش صاحب اس رات مشاعرہ کی فضا اور ماحول سے اس درجہ مطمئن تھے کہ ان کا جی چاہتا تھا کہ بس سناتے رہیں۔ انھوں نے رہائیاں سنائی شروع کیں اور سناتے رہے۔ جب وہ اُٹھے گا ارادہ کرتے، لوگ فرمائشیں شروع کر دیتے۔ اور جوش صاحب پھر سنانا شروع کر دیتے۔ جوش صاحب ایک رہائی سناتے، ایک ہان کھاتے پھر پک کرتے اور پھر ایک رہائی سناتے۔ یہ سلسلہ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے چلے جا رہا تھا۔

جب بہت دیر ہو گئی، اور جوش صاحب تھک گئے تو انھوں نے اعلان کیا۔
 "بس بس! بس اب تھک گئے ہیں۔"

یہ سن کر پیچھے سے ایک شخص کھڑا ہوا۔ "بیان کنندہ مجھے پر جسم نکلا۔ اور اس نے دور سے چلا کر کہا
 "ایک اور ہوگی پہلوان! تھوک کے۔"

(۲)

میں اور مولانا اعجاز الحق قدوسی جوش صاحب کے ہاں بیٹھے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ قدوسی صاحب کو پیاس محسوس ہوئی۔ تو کر دیٹر بکھر پٹر سے ایک بوتل اور گلاس نکال لایا۔ یہ شراب کی بوتل تھی جو عام طور پر خالی ہونے کے بعد جگ کے بھالے کلام میں لائی جاتی ہے۔ جوش صاحب میری طرف مخاطب ہو کر بولے۔

"عاجی صاحب! تم کی بوتل میں پانی؟"

مولانا قدوسی دوسرا گلاس ہلی رہے تھے۔ غالباً تم کی بوتل میں پانی کا خیال انھیں مولانا

قدوسی کی سفید داسی دیکھ کر آیا۔

اتنے میں مولانا پانی پنی چمکے تو جوش صاحب بولے :۔

مولوی نے اپنا داسی سی لیا

آگ کی بوتل سے پانی پنی لیا

اور پھر اپنے مخصوص انداز میں پیئے ہوئے مولانا پر فقرے چست کرنا شروع کر دیئے۔

مولانا ان کے تیس سال پرانے دوست ہیں۔ مولانا کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں :۔

رندوں کو نہ دیکھ چشم کم سے

قدوسی ہے یہ قوم نامسلمان

(۳)

آزاد انصاری مرحوم سے آخر آخر میں جوش صاحب کی ہجیم ناراض ہو گئی تھیں۔ وہ آتے تو وہ نہ پان بھیجتیں اور نہ خاطر تواضع کرتیں۔ اس واقعے کے پیچھے ایک اور کہانی ہے جو پھر کبھی سناؤں گا۔

جب شام ہونے لگی اور دو ٹول دقت ملنے لگے تو جوش صاحب کا وقت مے نوشی پہنچا۔ جنھوں نے جوش صاحب کو شراب پینے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ سورج غروب ہونے کے فوراً بعد پینا شروع کرتے ہیں۔ ہجیم اندر سے ہر آدمہ گھٹنے کے بعد ایک پیگ بن کر بھیجتی رہتی ہیں۔ گھڑی سامنے میز پر رکھ دی جاتی ہے، وہ ہر ایک منٹ کے بعد ایک گھونٹ پیتے ہیں اور اسی طرح چھ گھونٹوں میں ایک پیگ پیتے ہیں۔ جب دو گھنٹے ہو جاتے ہیں اور چار پیگ ختم ہو جاتے ہیں تو وہ کھانا کھاتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔ صبح نور ظہر کے ٹوکے اٹھتے ہیں۔ ٹہلنے جاتے ہیں۔ اگر بچوں کے ساتھ ددزش کرتے ہیں اور پھر لونا کام شروع کر دیتے ہیں۔ ادھر آٹھ بجے اُدھر شعر و شاعری اور دوسرے تخلیقی کام ختم ہوئے۔ ان کی زندگی بہت باقاعدہ

-۴-

یہ ایک ایسی ہی شام کا ذکر ہے۔ آزاد انصاری بھی موجود تھے، آزاد انصاری کی موجودگی

سے بیگم کا پارہ چڑھ گیا اور بہت تقاضوں کے بعد بغیر تیار کئے شراب کی بوتل بھیج دی۔ صاحبِ جوش صاحب اس انتظار میں بیٹھے ہیں کہ سوڈا کئے تو کام شروع ہو۔ مگر سوڈا نہ ہے کہ ذاب آتا ہے نہ جب۔ اگر کچھ بولتے ہیں تو بیگم خفا ہو جاتی ہیں۔ بیگم سے ہر شریف آدمی کی طرح جوش بھی بہت دبتے ہیں۔ کئی دفعہ تقاضا کیا۔ مگر وہ سنی آن سنی کر دیتیں۔ آخر جب بہت دیر ہو گئی تو جوش صاحب نے بیگم کو آواز دی۔

”اللہ کی بندی! ذرا یہاں تو آؤ۔“

یہ سن کر جب وہ اُٹیں تو جوش صاحب گفتگو کے سے انداز میں بولے :۔

کشتی نے کو حکیم روائی بھی بھیج دو

جب آگ بھیج دی ہے تو پانی بھی بھیج دو

مشاعر کی ہوی۔ عمر بھر کا ساتھ۔ خاندانی عورت۔ شعر سننے ہی منہں پڑیں اور رام

ہو گئیں۔

(۳)

ابھی پچھلے دنوں ایرانی سفارت خانے سے دعوت نامہ آیا۔ جوش صاحب، پیر حسام الدین راشدی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ گئے اور میں مولانا اعجاز الحق قدوسی بمبئی الٰہی صدیقی کے ساتھ۔ وہ سفارت خانے میں ام سے پہلے پہنچے اور ہمارے پہنچنے سے پہلے واپس آگئے۔ ہم جب پہنچے تو محفل برخواست ہو چکی تھی۔ اطلاع ملی کہ وہ مجھے اور بمبئی الٰہی صدیقی کو گھر بلا گئے ہیں۔

رات کے دس بجے تھے۔ میں اور بمبئی الٰہی صدیقی اُن کے گھر پہنچے۔ ہم دونوں کو دیکھ کر بولے : ”اچھا ہوا آپ لوگ آگئے۔ مجھے سخت وحشت ہو رہی تھی۔“

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب جوش صاحب نے ریڈیو کے مشاعرے سے ”بول اک تارے سخن جبین جبین“ نظم پڑھی تھی اور اس بات پر کہ انہیں مشاعرے میں سب کے بعد چڑھوایا گیا تھا چند حاسدوں نے ان کے خلاف اخبار ڈان میں خط شائع کرنے شروع کر دیے تھے۔

میں نے کہا "جوش صاحب وہ نظم تو بہت اچھی تھی۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا کہ اس نظم میں تصور انسان الوہیت کے درجے پر پہنچ گیا ہے جہاں رنگ نسل اور قوم و ملت کا امتیاز مٹ چکا ہے۔"

بولے "میں نے اسی موضوع پر لکھی ہے لیکن انداز بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ بعد از مطالعہ موضوع سہل ہو کر ہر خاص و عام کے ذہن میں اتر جائے اور ہر شخص اس سے لطف اندوز ہو۔ اس کے قافیے، اس کے الفاظ اور ساتھ ساتھ بحر جو میں نے استعمال کی ہے وہ ساری نظم کو موسیقی کا اثر عطا کر رہی ہے۔"

میں نے کہا "جوش صاحب! یہ نظم خدا پرشوں کی جائے۔
آواز دی! ذرا بیگ بھیج دو!"

اس کے جواب میں اندر سے آواز آئی "ابھی تو بھیج کر گئے ہو اب پھر شروع کر دیا۔
یہ اُن کی بگیم تھیں۔"

رازا دارانہ انداز میں آہستہ سے بولے "مادہ مہربان ہیں۔ انھیں ہر دم ہماری صحت کا خیال رہتا ہے۔"

(۵)

"ترقی اردو لہر ڈھکی میننگ ہو رہی تھی۔ لہر ڈکا دفترا کی قائم ہی ہوا تھا۔ میننگ میں جوش صاحب سے ان کی دفتری ضروریات دریافت کی گئیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک چپر سی، ایک بابو اور ایک مہتر"

پیر حسام الدین راشدی بولے "جوش صاحب! مہتر کیا کریں گے مہترانی لے لیجیے۔"

جوش صاحب نے فوراً جواب دیا "ہاں مہترانی بھجوانی۔"

(۶)

تین چار سال پہلے کی بات ہے۔ مولانا عبدالحامد بدایونی نے جوش صاحب کو مدعو کیا۔ اُس زمانے میں جوش صاحب کے ایک مرثیے کی پڑی دھوم تھی۔ یہ محفل صرف اسی لیے منعقد کی گئی تھی کہ جوش صاحب مرثیہ سنائیں گے۔
میں بھی مدعو تھا۔

مرثیہ شروع ہوا اور ختم ہو گیا۔ چلے کر علی اور ختم ہو گئی۔ لیکن ہاں کا دور دورہ ہوتا نہیں۔ حاضرین بے چین تھے اور میزبان بالکل غافل۔ طرزِ تراشہ کہ میزبان خود مسلسل ہاں کھٹکے جا رہے تھے۔ میں نے مولانا اعجاز الحق قدوسی سے کہا کہ جوش صاحب کے اس مرثیے کے ایک مصرعے کو اگر یوں کر دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔

ہاں کھانا اور نہ اس کا کھانا اور ہے!
جوش صاحب برابر میں بیٹھے تھے۔ مصرع سن لیا۔ فوراً بولے۔
مالی ملا کس مذید

(۷)

جوش صاحب بہت بھلکڑے ہیں۔ ذرا سی دیر میں بات بھول جاتے ہیں اور تو اور اپنے اشعار تک بھول جاتے ہیں۔ اکثر میں نے اُن کا شعر بڑھانے لگے:

”بھول صاحب! یاد نہیں ہے کہ میرا ہے۔ ویسے معلوم میرا ہی ہوتا ہے۔“

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کوئی سفارش میں پکڑ لایا۔ جب میرے پاس گئے تو کہنے لگے کہ ”بھئی اتنا تو یاد ہے کہ سفارش کرنی ہے اور ان صاحب کی کرنی ہے لیکن یہ بھول گیا ہوں کہ کیا سفارش کرنی ہے۔“ ویسے یہ جملہ کہتے وقت وہ جسم سفارش بنے ہوئے تھے۔

مرزا عالم گیر قدر بھی اُن کے ساتھ تھے۔ کہنے لگے۔ ”میاں! ایسا پہلی بار ہی نہیں ہوا۔ ایسی دو تین جہینے پہلے کی بات ہے کہ ایک صاحب پکڑ کر لے گئے۔ وہاں جو کچھ کہا وہ سب

کچھ ان صاحب کے خلاف تھا جن کی سفارش مقصود تھی، شاعر آدمی ہیں، ہر روپے، ہر انداز اور ہر ادلے شاعری چمکتی ہے۔

جو جوش صاحب سے ملتا ہے ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ میرے گھر آئے۔ لوگوں نے فرمائشیں شروع کیں کسی نے یہ بھی کہا کہ ”چنا جو گرم مسئلہ ہے۔“
کہنے لگے: ”کاپی نہیں لیا۔“

اصرار کیا گیا کہ ”کچھ اشعار تو زبان یاد ہوں گے؟“
کہا: ”کہاں یاد ہیں۔ یادداشت اتنی خراب ہو گئی ہے کہ:۔۔۔“
ہم نے اپنی سی کیں بھول:۔۔۔ دیکھی نہ تھی
”اتھا اٹھایا تھا دعا کو کہ دعا بھول گئے۔“

(۸)

حکومت کی طرف سے ”ابھی دو سال ہوئے“ یہ اعلان ہوا کہ حکومت معذور ادیبوں کی امداد کرے گی۔ یہ خبر سن کر جوش صاحب بولے:
”جیل صاحب! ادب تو خود سب سے بڑی معذوری ہے۔“

(۹)

پیر حسام الدین راشدی جوش صاحب کے بہت دوست اور بڑے قدر دان ہیں۔
ایک دفعہ جوش صاحب نے پیر صاحب سے کسی کام کے لیے کہا۔
پیر صاحب معروف آدمی۔ بھول گئے۔

بات دھانی کے طور پر جوش صاحب نے کافد کے ایک پرنسپل پر حرف یہ لکھ کر بھیجا ہے

حسام الدین بھی غمخیز لکے

مرے حق میں بہت سارے لکے

جواب میں پیر صاحب خود پہنچ گئے۔

(۱۰)

جس زمانے میں "پاکستان رائٹرز گلڈ" وجود میں آیا ہی تھا کہ میرے سپرد یہ کام کیا گیا کہ میں جوش صاحب کو گلڈ کا ممبر بنانے کے لیے اُن کے پاس جاؤں۔ "گلڈ" کے کارکنان کا یہ خیال تھا کہ جوش صاحب میرے کہنے سے ممبر ضرور بن جائیں گے۔

میں گیا۔ وہ گھر پر موجود نہیں تھے۔ میں ایک پرچہ لکھ کر فارم اور خط چھوڑ آیا۔ یہ دو گویا چیزیں انگریزی میں تھیں جب وہ گھر واپس آئے تو یہ چیزیں نظر سے گزریں۔ اردو کے ادیبوں کی انگریزی زبان میں کارگزاری دیکھ کر چراغ پا ہو گئے۔ فارم پر یہ لکھ کر واپس کر دیا۔ "انگریزوں کی زبان میں انجمن کا نام چھاپ کر بڑا ہی فخر محسوس فرمایا گیا ہو گا۔"

زندہ باد انجمن مصنفین پاکستان!

پاکندہ باد اردو زبان!!

دخشنده باد جماعت دارالانسان!!!

اور اس کے نیچے یہ لکھا تھا:

"حضرت جمیل"

ہم کہاں کے دانا ہیں کس ہنرمیں کی کتابیں

کیوں ہمیں بناتے ہیں آپ ہم عیاں اپنا

جوش مرحوم

یہ سارا غصہ اس بات پر تھا کہ یہ سب کچھ انگریزی میں کیوں ہے اس بات کا یہ نتیجہ ہوا کہ جوش صاحب آج تک "پاکستان رائٹرز گلڈ" کے رکن نہ بننے لگے نہ بنے۔ لوگ ہزار طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر بات مرقوم یہ ہے۔

(۱۱)

جوش صاحب کو پابندی وقت کا بہت خیال رہتا ہے۔ ایک دفعہ میرا سہیل الحق

صدری، مولانا قدوسی، جوش صاحب اور بعض دوسرے احباب کا حیدر آباد جانے کا پروگرام تھا۔ یہ طے ہوا تھا کہ صبح آٹھ بجے چلیں گے تاکہ ٹھنڈے وقت حیدر آباد پہنچ جائیں۔ لیکن سب کو جمع ہوتے ہوتے فوج گئے۔ اور جب جوش صاحب کے ہاں پہنچے تو وہاں بکے تھے۔ دو گھنٹے کا انتظار جوش صاحب کے بس کا کہاں تھا۔ جیسے ہی ہم پہنچے تو بکے نے ایک پرچہ لاکر دیا جس پر لکھا تھا:

”میں نے آج ٹھکے پڑھنے کا کام نہیں کیا، اور اس قدر عجلت کے ساتھ طیارہ کی کو ٹھیک سو آٹھ بجے ملبوس ہو کر بیٹھ گیا تاکہ آپ کو ایک دقیقہ بھی انتظار کی رحمت نہ گوارا کرنا پڑے۔“

لیکن آپ نہ آتے تھے نہ آئے اور جب شدید انتظار کرتے کرتے میں خود اپنی نگاہوں میں الحق معلوم ہونے لگا تو میں نے ”اِذَا لَقِیْتُ الْكَافِرَ لَا تُكَلِّمْہُ“ کا نعرہ لگایا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ تاکہ آپ کو نصیحت حاصل ہو، اور آپ آئندہ کسی اللہ کے بندے کو کرب انتظار میں مبتلا نہ فرما کر اسے اپنے کو الحق سمجھنے پر مجبور نہ کریں۔

مرحوم جوش علیہ

یہ خط پڑھ کر اس تاخیر سے مجھے بہت شرمندگی ہوئی۔ اور میں سوچنے لگا کہ واقعی بہت بُرا ہوا۔ سارا پروگرام کرکرا ہو گیا۔ میں نے قدوسی صاحب سے کہا کہ ”اب کیا ہو۔ جوش صاحب کو کہاں تلاش کیا جائے؟ ان کے بغیر میں تو نہیں جاؤں گا۔“

اسی ادھیڑ میں آدھ گھنٹہ گزر گیا۔

ابھی ہم لوگ صلاح و مشورہ کر رہے تھے کہ موصوف گھر کے اندر

سے پر آمد ہوئے اور کہنے لگے :

”کہئے کیسی زحمت ہوئی؟“

اور یہ کہہ کر منہ سے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے۔

میں نے کہا :۔

بہت جی خوش ہوا اے ہم نشیں ”اب خوش سے مل کر

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

فیض احمد فیض

میں جذباتِ ظلم سے اتنا بوجھل ہوں کہ میرے لیے اس دلچت شاید یہ ممکن نہیں ہے کہ میں فیض صاحب کے بارے میں کچھ زیادہ عرض کر سکوں۔ لاہور میں ۲۰ نومبر کو منگل کے دن دھپہر کے وقت فیض صاحب وفات پا گئے۔ یہ ایک ایسا سانحہ ہے جس کا ظلم ہماری نسل کو ہمیشہ اسی طرح یاد بن کر ستا رہا ہے گا جس طرح خود فیض صاحب کے اہل خاندان کو۔ تیرے شاید یہ شعر اسی موقع کے لیے کہا تھا :۔

کن فیضانِ آب تو سوتی ہے اے چشمِ گرے ناک
مچھان ڈمکھول مشہر کو سیلاب لے گیا

جانے والے چلے جاتے ہیں اور پھر لوٹ کو نہیں آتے لیکن ان کی یادیں اور ان کے کام ہمیشہ زندہ و باقی رہتے ہیں۔ فیض صاحب ایک بڑے شاعر اور ایک بڑے انسان تھے جو پر سوں میں کبھی کبھار پیدا ہوتے ہیں۔ جب میں انٹر کا طالب علم تھا تو اس وقت بھی فیض صاحب میرے محبوب شاعر تھے اور آج، جب طالبِ علمی کے زمانے کو کئی تنگ بیت گئے، فیض صاحب میرے محبوب شاعر ہیں۔ اتنے عرصے کسی شاعر کا محبوب رہنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ شاعر تو عمر کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ آج جو محبوب ہے غرضدی نہیں ہے کہ وہ کل بھی محبوب رہے لیکن بڑے شاعر جب ایک دفعہ محبوب ہو جاتے ہیں تو وہ ہمیشہ محبوب رہتے ہیں۔ فیض صاحب ایک ایسے بڑے شاعر تھے۔

فیض صاحب کا اور میر اکرم دبیش چالیس سال کا تعلق تھا۔ میں نے لکھنا شروع کیا تو اپنا پہلا مضمون فیض احمد فیض کی شاعری پر لکھا جو ۲۸ ۲۹ میں صدر شاہین و ممتاز شیرین کے نیا دور

میں شائع ہوا۔ اس وقت تک فیض صاحب کا ایک ہی مجوزہ منقش فرما دی شائع ہوا تھا۔ ان کا باقی کلام سب میرے زمانہ شعور میں شائع ہوا اور جب بھی شائع ہوا میں نے مشوق سے پڑھا اور لطف اندوز ہوا۔ پچھلے دنوں ان کا نازہ کلام ایک صاحب نے لاہور سے بھیجا۔ پڑھا تو محسوس ہوا کہ فیض صاحب بحیثیت شاعر آج بھی ہمزہ دم ہیں۔ ان کی تخلیقی قوت اب بھی شامی کا صور بھونگ رہی ہے۔ ابھی چند ماہ قبل فیض صاحب میرے گھر تشریف لائے تھے۔ محفل سماعت تھی۔ رات گئے گئے ننگ بیٹھے رہے اور لطف اندوز ہوتے رہے۔ اسی دھیے انداز میں باتیں کرتے رہے۔ ڈاکٹروں کے مشورے پر سگریٹ چھوڑ چکے تھے۔ لیکن بظاہر صحت ابھی تھی۔ میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی وہ اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔

فیض صاحب جیسے شریف النفس انسان میں نے کم دیکھے ہیں۔ نہ شکوہ نہ شکایت نہ دشمنی نہ انتقام سب کو گلے لگانے کے جذبے سے سرشار اور اپنی ذات میں گم۔ اگر انسان دنیا کو لانتہا کائنات کے تعلق سے دیکھے تو وہ وسیع المشرب ہو جائے۔ تنگ نظری سے دُور اور تنگ دلی سے پاک۔ فیض صاحب ایک ایسے ہی وسیع القلب عظیم انسان تھے۔ ایسے انسان جن سے انسانیت کا بھرم قائم ہوتا ہے۔

میں مشہور کہ کم لوگوں کو زندگی میں اتنی شہرت میسر آتی ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ پچھلے دنوں چینی ارمیوں کا وفد کراچی آیا تو بطور تعارف انھیں بتایا گیا کہ اس جلسے میں ملک کے نامور ادیب و شاعر موجود ہیں۔ یہ سن کر وفد کے سربراہ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اس میں فیض بھی موجود ہیں۔ وہ صرف فیض صاحب ہی کو جانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہ اردو زبان کے عظیم شاعر ہیں۔ عظیم ہیں وہ لوگ جو عظمتوں کے اس رتبے کو پہنچتے ہیں۔ فیض صاحب اردو کے وہ واحد شاعر تھے جو صحیح معنی میں بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ جن سے پاکستان کی قومی زبان کا رتبہ بڑھا اور جن سے عظمتوں کے نئے پہلے بنے۔ کج فیض احمد فیض ہم میں نہیں ہیں اور آج ان کے بغیر ہم اس لیے تنہا رہ گئے ہیں کہ اب ان کی جگہ لینے والا بھی کوئی دوسرا نہیں ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کو ایک ایسا ہجو ایک ایسا آہنگ دیا جس میں اردو شاعری کی روایت بھی بول رہی تھی اور عہد حاضر کی روح

بھی۔ یہی لہجہ ان کی پہچان تھا جس میں عوام کا جذبہ کرب بھی شامل تھا اور ان کی قوت بھی۔ جس میں دکھی انسانیت کا فوج بھی موجود تھا اور آنے والے دور کا فقر بھی۔ فیض احمد فیض اسی نئے شعور کے نمائندہ شاعر تھے۔ وہ شعور جس سے زندہ قومیں اپنی فکر کے تار و پود بنتی ہیں۔ فیض صاحب اسی لیے آج بھی عظیم ہیں اور کل بھی عظیم رہیں گے۔ انھوں نے اردو شاعری پر لازوال نقوش ثبت کیے ہیں۔ ان کا دل عشق کی آگ سے روشن تھا۔ اور یہی روشنی ان کی شاعری کی روشنی تھی۔ ان کی وفات سے شاعری کی کوکھ گہنی ہے لیکن شعور کی وہ روشنی جو انھوں نے عوام اور معاشرے کے دلوں میں پیدا کی ہے وہ ہمیشہ ساری دکھی اور غریب انسانیت کو منزل کار راستہ دکھاتی رہے گی۔ فیض صاحب کا پیغام آفاقی تھا۔ میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔ آج آفاقی شاعری کا یہ ویلو تا ہم سے ٹنڈھ موز کر چلا گیا ہے لیکن اس ویلو تا کا پیغام آنے والی نسلوں کو اپنی شاعری کی تخلیقی عظمتوں سے ہمیشہ گرویدہ بنائے رکھے گا۔ فیض کی وفات سے اردو شاعری کا وہ عظیم دور اوج اقبال سے شروع ہوا تھا اب جو شعلہ آہاری کے بعد فیض احمد فیض پر ختم ہو گیا۔ اب ہم سدا اس باب کو پڑھتے رہیں گے اور فیض کی ذہنی نگری، تخلیقی اور سماجی صلاحیتوں کی تقریظ لکھتے رہیں گے اور انھیں برسوں۔ برسوں یاد کرتے رہیں گے۔ آج بھی اؤ آنے والے زمانے میں بھی :

یوں تیر تو غم اپنا برسوں کہا کریں گے

اب رات کم ہے سوؤ اس پر چکی کہانی

فیض صاحب کی زندگی کی کہانی بس غرور پر چکی ہے لیکن آنے والے دور کا داستان گو اس کہانی کو ہمیشہ بیان کرتا رہے گا۔

فیض احمد فیض

۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو منگل کے دن، دوپہر کے وقت، لاہور میں فیض احمد فیض وفات پا گئے۔ یہ خبر شعلے کی طرح اٹھی اور سارے پاکستان میں اور پاکستان سے باہر ساری دنیا میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ انتقال کے وقت فیض صاحب اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر تھے اور اب ان کے بعد ان کے قدا اور ان کی شہرت کا کوئی دوسرا ادیب و شاعر دور و دور نظر نہیں آتا۔ فیض کی وفات اسی لیے ایک سانحہ بھی ہے اور المیہ بھی۔

فیض احمد فیض نہ صرف ایک بڑے شاعر اور دانشور تھے بلکہ ایک بڑے انسان بھی تھے۔ دھیمے مزاج کے فراخ دل انسان۔ بہت کم عمر کے آخری حصے میں شہرت کی معراج کو پہنچے ہیں۔ فیض ابتدائی دور سے مشہور ہوئے اور ان کی شہرت، طلوع آفتاب کی طرح مسلسل بڑھتی رہی اور جب وفات پائی تو ان کی شہرت نصف النہار پر تھی اور وہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کے محبوب شاعر تھے۔ وہ شاعر جوان کے دلوں کی ترغاتی کرتا ہے۔ ان کے بے نام جذبات اور گونگے احساسات کو زبان دے کر نیا شعور اور نئی آگہی دیتا ہے۔ فیض کی شاعری میں عوام کا جذبہ کرب بھی شامل تھا اور ان کی قوت بھی۔ اس میں دکھی انسانیت کا نوہ بھی موجود تھا اور آنے والے دور کا غم بھی۔

بڑے شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے دور میں بڑے ہوتے ہیں لیکن جب وہ دور ختم ہوتا ہے اور رجحانات بدلتے ہیں تو ان کی شہرت کا سورج بھی دونوں وقت ملتے ہی غروب ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے دور کے ساتھ جیتے ہیں اور اپنے دور کے ساتھ

ہی مہلتے ہیں۔ دوسری قسم کے بڑے شاعر وہ ہیں جو اپنے دور کی ترجمانی بھی کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ اپنے دور کو کٹنے والے دور سے ملا بھی دیتے ہیں۔ فیض احمد فیض دوسری قسم کے بڑے شاعر تھے۔ وہ آج کے بھی شاعر تھے اور کل کے بھی۔ یہی ان کی عظمت ہے۔ فیض کی شاعری کا اپنا مخصوص آہنگ اور اپنا مخصوص لب و لہجہ تھا۔ اس لیے میں اردو شاعری کی روایت کا حسین ماضی بھی شامل تھا اور زمانہ حال کا شعور بھی۔ فیض نے روایت ماضی کو حال میں جذب کر کے اسے مستقبل سے ملا دیا۔ اسی لیے فیض کی شاعری اپنے زمانے کی دھڑکنوں کو کٹنے والے زمانوں کی دھڑکنوں سے ملا کر اس نئی شاعری کی تخلیق کرتی ہے جو ان کی پہچان ہے۔ زمانوں کا یہ خوب صورت امتزاج کبھی کبھار جو میں آتا ہے فیض اسی نئے امتزاج کے نمائندہ تھے۔

فیض جبر و استحصال کے دشمن تھے۔ عدل و انصاف کے داعی تھے۔ عوام کو انسانی قوتوں کا سر شہید سمجھتے تھے۔ وہ عوام جن سے قوموں کی کھیتیاں سرسبز و شاداب ہو جاتی ہیں۔ صنعت و حرفت پہلنے پھولنے لگتی ہیں اور زندگی کے چشے اُبلنے لگتے ہیں۔ ان کی شاعری عوام کی اسی قوت کی ترجمان ہے۔ وہ قوت جو مستقبل کی حقیقی قوت ہے۔ جو قوموں کو بلند و بالا اور انھیں سرخرو کرتی ہے۔ فیض کی وفات سے شاعری کی لڑکھائی گئی ہے لیکن شہجی کی وہ روشنی جو انھوں نے عوام اور معاشرے کے دلوں میں پیدا کی ہے، ساری دھکی انسانیت کو ہمیشہ منزل کا راستہ دکھاتی رہے گی۔

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے

فروغ گلشن و صوبت ہزار کا موسم

فیض صاحب اسی لیے ساری عمر مجھے عزیز و محبوب رہے۔ چند ماہ پہلے میرے گھر گئے اور رات گئے تک بیٹھے رہے۔ اپنا نیا کلام سنایا اور پھر فرمائش پر پرانا کلام بھی سنایا۔ ان کی پرانی شاعری سے آواز کی وہی خوشبو آ رہی تھی جو نئے کلام سے آ رہی تھی۔ ان کی تخلیقی توانائی آج بھی اسی طرح تازہ و زندہ تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ فیض صاحب کے ہر جھنے کا انداز اچھا نہیں تھا لیکن مجھے ان کا کلام خود ان کی زبان سے سن کر ہمیشہ اچھا لگا۔ اس موقع پر شعر کی معنویت

اور پہچنے کے بہت اس طرح کھٹے محسوس ہوتے تھے جیسے نسیم سحری سے ہند کھلیاں غنچے اور غنچے پھول بن جاتے ہیں۔

فیض کی وفات کے ساتھ اردو شاعری کا ایک عظیم دور ختم ہو گیا۔ یہ ایک ایسا عظیم دور تھا جس پر ہر زبان اور اس کی تاریخ فکر کر سکتی ہے۔ یہ افتخار بیسویں صدی کی بہت کم زبانوں کو حاصل ہے۔ اس دور نے اردو زبان کو دنیا کی جدید زبانوں میں بلند درجہ دیا اور اس عظیم دور کی تاریخ میں فیض کا کلام ممتاز دنیا یاں ہے۔

فیض کی شاعری نئی نسل کے شاعروں کو ایک سبق بھی دیتی ہے اور وہ سبق یہ ہے کہ وہ شاعر جو اپنی روایت سے کٹ کر دوسری زبانوں کی شاعری کی پیروی کرتے ہیں اپنی تاریخ کے تخلیقی ستونوں سے کٹ کر بے جان اور بے اثر ہو جاتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ان کا رشتہ اس زبان کی تہذیبی روح اور تخلیقی روایت سے ہمیشہ گہرا اور استوار رہے جس زبان میں وہ شاعری کر رہے ہیں اور اس زبان کی روایت کی تخلیقی قوت ان کی شاعری کا اصل جوہر ہو۔ فیض نے اپنی شاعری میں یہی کام کیا اور روح عصر کو اردو شاعری کی تہذیبی روح اور روایتی اصناف میں سمو دیا۔ اسی لیے وہ آج عظیم شاعروں کی صف میں کھڑے ہیں۔

اب فیض ہم میں نہیں ہیں۔ ان کی زندگی کی کہانی بس ہو چکی ہے لیکن آنے والے دور کا داستان گو اس کہانی کو نئے نئے انداز سے ہمیشہ بیان کرتا رہے گا۔ معصومی کا ایک شعر ہے :

جن کی باتوں سے کبھی ہوتی تھی نکل نکلیں دل
رہ گئے تنہا ہم اور وہ آشنا جاتے رہے

فراق گورکھپوری

شاعروں اور ادیبوں کی وہ نسل جس نے میری ذہنی پرورش کی تھی تیزی سے رخصت ہو رہی ہے۔ ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء کو حضرت جوش ملیح آبادی ہم سے رخصت ہو گئے۔ ابھی یہ زخم تازہ تھا کہ ۳ مارچ ۱۹۸۲ء کو حضرت فراق کی سناٹنی آگئی۔ ایک تلفظ ہے جو چلا جاتا ہے۔ ایسا قافلہ جس کا ہر فرد میر کارواں ہے:

قافلہ قافلہ چلتے ہیں چلے کیا کیا لوگ
نیر غفلت زدہ حیران سے کیا بیٹھے ہو

جب جوش کا انتقال ہوا تو فراق صاحب اسپتال میں تھے۔ خبر سنی تو آواز بند ہو گئی اور کہا۔ ”آج جوش کے مرنے کے بعد میں ماتم کرنے کو رہ گیا ہوں۔ یہ خیر میری زندگی کا سب سے بڑا صدمہ ہے۔“ چند ہفتے قبل جب فراق صاحب کے کسی نے پوچھا کہ آج کے دور میں سب سے بڑا شاعر کون ہے تو انھوں نے جواب دیا۔۔۔ ”جوش اور مرث جوش اس جیلے سے جہاں جوش کی شاعرانہ عظمت پر روشنی پڑتی ہے وہاں اس شریفانہ فرائض دلی کا بھی پتا چلتا ہے جو اس نسل کے مزاج کا ایک حصہ تھی۔ ایک بار جوش ملیح آبادی اپنے ہم عصروں کی طباطبائی و ذہانت کا ذکر کر رہے تھے۔ جب فراق صاحب کا ذکر آیا تو جوش نے کہا کہ ”فراق دلتوا رہے و ذخیرہ فحری یہ شخص فقط دھار ہی دھار ہے۔“ غور کیجئے کہ کیا ہماری نسل کے شعرا و ادبا بھی ایک دوسرے کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں؟ یہ لوگ رشک کے پرستار تھے اور ہم حسد کے مریض ہیں۔ جیسے جوش اس دور میں نظم کے سب سے بڑے شاعر تھے اسی طرح فراق صاحب اس دور میں غزل کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ جوش کی طرح فراق نے بھی اپنی زندگی میں ایک کلاسیک

کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ گزشتہ چالیس برس میں ایسا کون سا قابل ذکر شاعر ہے جس نے فراق کا اثر قبول نہیں کیا۔ فراق کی ذہانت و طباعت نے ان کے انداز نظر نے ان کی صاف ستھری فکر نے ان کے زبان و بیان نے اردو شاعری کے رنگ و آہنگ کو ایسا نکھار دیا کہ جدید دور کی رواج فراق کی غزل میں دھڑکنے لگی۔ فراق نے اردو غزل کی روایت کو ایک نیا رُخ دیا اور اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اگر اس صدی کی اردو شاعری کا احاطہ کیا جائے تو اس میں آئینہ آبادی اور اقبال کے علاوہ جن شاعروں کی آوازیں سنایاں ہیں ان میں بھی جوش اور فراق کی آوازیں سب سے الگ سب سے سنایاں اور منفرد ہیں۔ فراق نے نثر اور نظم دونوں سطحوں پر اہم کام انجام دیئے۔ ایک طرف انھوں نے اردو شاعری کی روایت کو نیا رخ دیا اور دوسری طرف تاثراتی تنقید کے بہترین نمونوں سے اردو تنقید کو ایک نیا رخ دیا۔ فراق ایک آزاد خیال مفکر تھے۔ انسان ان کی فکر کا مرکز و محور تھا اور احساس جمال کا حیرت انگیز شاعری کا شعور تھا۔ فراق صاحب نے کہیں کہا تھا کہ "شاعری محض شاعری کے لیے نہیں بلکہ زندگی کے لیے وجدان کی ایک ریاضت ہے۔ بلند شاعری ایک ایسا جمالیاتی شعور پیدا کرتی ہے جو قومی زندگی کو بیک وقت گہرا اور اونچا بنا دیتی ہے۔ اور تو ان کا فتوہ بھی اور اسی شعور سے ہمارو حافی عالم سے عمل کے سرچشمے بھونکنے ہیں۔ بڑی شاعری میں گہری سے گہری بات معصومیت کا روپ دھار سکتی ہے۔" فراق صاحب کی شاعری نے اردو شاعری کو یہی رخ دیا جو نیا بھی تھا اور خوب صورت بھی۔

کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اٹھتا ہے
بلائیں یہ بھی محنت کے سرگئی ہوں گی

یہ عظیم شاعر جس عظیم شاعر نے کہا تھا آج وہ دنیا سے اٹھ گیا ہے اور ہم لوگ اسی عظیم ہستی کو خراج عقیدت و تحسین پیش کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ فراق اردو ادب کا ایک عظیم نام ہے۔ فراق ایک سچے بے باک اور شاعری کی نئی روایت کا ایک عظیم نام ہے۔ فراق اردو تنقید کا بھی ایک عظیم نام ہے۔ اس دور میں جب ہندوستان میں اردو کس پیرسی کے عالم میں سسک رہی تھی فراق وہ عظیم نام ہے جس نے اس زبان کے حسن و جمال کے گیت گائے

کسی زبان کو مٹانا قتل اور خون سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔ اردو کا مٹاؤ قتل عام سے بھی نہیں زیادہ سنگین جرم سمجھتا ہوں۔ یہ تو ماضی حالی اور آئندہ کی نسلوں کے قتل کے برابر جرم ہے۔ جن کٹر ہندی پرستوں نے حکومت اور تعلیمی اور دیگر انصاف کی مدد سے اردو کو قریب قریب مٹا ڈالا ہے ان کی اس کارروائی کے متعلق میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ان کی یہ حرکت اس سے کم مکر وہ حرکت نہیں ہے جو شہلر نے یہودیوں کی پوری قوم کو ذبح کر کے کی تھی۔ آج مجھے ہر ہندی تحریک اردو کے خون سے رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہماری حکومت نے بھی مجرم وار تساہلی اور چشم پوشی سے اس معاملہ میں کام لیا ہے اور حکومت کے کئی اہم اقتدار وزیروں اور عہدہ داروں نے اردو کے قاتلوں کو بڑھاوا دیا ہے۔ میں پھر بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ اردو مٹائی نہیں جاسکے گی۔ اس وقت مٹائی تو اردو جارہی ہے لیکن مٹ رہی ہے ہندی اور اس صدی کے ختم ہوتے ہوئے وہ ہندی سارے ہندوستان سے مٹ جائے گی اور کم سے کم آئرلینڈ سے مٹ جائے گی جس کی بنیاد اب سے سو برس پہلے رکھی گئی تھی۔ کھڑی بولی کو بد صورت بنا کر اردو ہندی میں نہایت پھوپھور اور بد صورت اور قابل نفرت تصنیف بازی متحیل شرن گہت اپنت، انرا لا، پرشاد اور جہاد بولی نے کی۔ یہ چنانچہ ہندی مدعوام کے گلے سے نیچے آکر سکتی ہے اور مدعوام کے یہ صرف کتابوں میں دفن رہے گی۔ اسے تو ہم چلتا پھرتا سروہ بھی نہیں کہہ سکتے بلکہ ایک دفن شدہ سڑی ہوئی لاش کہہ سکتے ہیں۔ اردو کے دشمن ابھی طرح اپنے دل میں جلتے ہیں کہ اردو ہندوستان کی سب سے بڑی زبان ہے اور سب سے زیادہ خوب صورت، اور لطیف بھی۔ اردو دشمنوں کو حقیقتاً ہے گنوارہیں پر غصہ آتا ہے۔ اردو کو مٹانے کے کثافت لطافت کو کبھی معاف نہیں کرتی :

یہ فراق کے الفاظ تھے۔ اس دور میں جب چاروں طرف سے اردو کے ظلم و آزار کیا
 اٹھ رہی تھیں، فراق صاحب نے اردو والوں میں ایک نئی روح بھونکی اور ان کی حق پرست
 آواز، دوسری آوازوں کے ساتھ مل کر اردو زبان کو زندہ و سلامت بچا کر ۱۹۸۲ء تک لے
 آئی اور آج اردو دوبارہ اپنی حیات نو کے لیے پورے اعتماد کے ساتھ مستقبل پر نظر جمائے
 ہوئے ہے۔

فراق اس دور کی روح کی آواز تھے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، وہ مجسم ذات و
 فطانت تھے۔ اور اپنی خوش دلاء بیٹی باتوں سے وہ سنسنے والوں پر ایسے گہرے نقوش چھوڑتے
 تھے کہ خود فراق صاحب ان کی ذات و شخصیت کا حقد بن جاتے تھے۔ جن لوگوں نے فراق
 صاحب کو دیکھا ہے، ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہوئے ہیں، ان کی صحبتوں میں بیٹھے ہیں
 وہ اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ فراق صاحب سے ملنا ایک یادگار واقعہ ہوتا تھا۔
 فراق صاحب نے کہا تھا:

آٹے والی نیلیں تم پر رشک کریں گی ہم عمرو

جب یہ دھیان آئے گا ان کو تم نے فراق کو دیکھا تھا

اور خواتین و حضرات! میں نے بھی فراق کو دیکھا تھا، اس زندہ فراق کو جو آج ہم میں نہیں ہے:

ہیدا کہاں ہیں ایسے پرگانہ طبع لوگ

شاید کہ تم کو تیرے صحت نہیں رہی

غلام عباس

۱۹۸۲ء کا یہ سال ادیبوں اور دانشوروں پر سخت اور بھاری گزرا۔ جوش ملیح آبادی گئے اور اپنے ساتھ اردو شاعری کی ایک روایت لے گئے۔ قرآن گورکھپوری گئے اور اپنے ساتھ لغت و غزل اور دانشورانہ تنقید کی ایک روایت لے گئے۔ میر حسام الدین راشدی گئے اور اپنے ساتھ تار تار سدا کی روایت لے گئے۔ خدیجہ مستور گئیں اور اپنے ساتھ اردو افسانے اور ناول کی ایک روایت لے گئیں اور دوسری نومبر کی درمیانی شب کو اردو کے منفرد افسانہ نگار غلام عباس بھی ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے اور اپنے ساتھ اردو افسانے کی کلاسیکل روایت لے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بظاہر کوئی آثار نہیں تھے۔ وہ اچھے اور صحت مند تھے۔ یکم نومبر کو دن میں گیارہ بجے کے قریب مجھ سے فون پر بات ہوئی تھی۔ کہنے لگے جمیل صاحب مجھے دو دن اور دیدیجیے "نوحان افسانہ نگار کے ہم خط" کے چند صفحے رہ گئے ہیں۔ بس جمعرات کو لے لیجئے۔ رات کو ایک بجے کمانڈر افروز کا فون آیا۔ بتایا کہ عباس صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے مگر یہ تو ہچکا تھا اور جب میں جمعرات کو ان کے سوگ میں شریک ہوا تو مجھے یاد آیا کہ یہی وہ دن اور وقت تھا جب مجھے عباس صاحب سے ملنا تھا۔ مگر وہ تو جا چکے تھے۔ وہاں جا چکے تھے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا:

رہنے کی کوئی جا کہ شاید نہ تھی انھوں کی

جہاں سے اٹھ گئے ہیں بڑے پھر کج ہونے کئے تیر

غلام عباس صاحب ایک شریف النفس کم گو اور مہربان مہذب انسان تھے۔ لکنا پڑھنا ان کا اور چھنا بچھنا تھا اور خاموشی سے آہستہ آہستہ کام میں لگے رہنا ان کی زندگی کا ہر تھا۔ نہ

مگر وہ بندی سے دل چسپی، نہ تعلقات، عامہ سے سروکار۔ بس اپنے کام سے کام۔ یہی ان کی زندگی تھی اور اسی بے نیازی کی وجہ سے عباس صاحب نے اردو زبان کو ایسی عظیم کہانیاں دیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ آئندہ اکتبہ، جواہری، اور کوٹ، سایہ کن رس، حمام میں اس کی بیوی، امروہ، فردوس وغیرہ وہ کہانیاں ہیں جو گزشتہ کل کی طرح آج بھی اور کج کی طرح آنے والے کل میں بھی دل چسپی کے ساتھ پڑھی جاتی رہیں گی۔ سہانی، امر ہے اور سچائی کا اظہار خود تحریر کو بھی امر بنا دیتا ہے۔ غلام عباس صاحب نے زندگی کے سمندر سے سچا پلو کے ایسے ہی موتی چٹن کر انھیں خوب صورت، ہر کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ وہ بھی اسی لیے امر ہیں۔

غلام عباس صاحب سے میری ملاقات کی عمر تقریباً تیس سال ہے۔ ۱۹۵۳ء کی بات ہے اور یہ کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ لندن سے نئے نئے واپس آئے تھے اور پہلی ملاقات ہی میں ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔ ۱۹۵۳ء اور ۱۹۸۲ء کے درمیان تعلقات دوستی میں کوئی تشیب آیا اور نہ کوئی ایسی بات ہوئی کہ دلوں کی کلی مرجھا جائے۔ بہت سے واقعات ہیں جو میرے حلقے میں محفوظ ہیں، ہماروں کی ایک بہت سی بات ہے جو میرے ذہن کے دریچوں پر دستک دے رہی ہے لیکن ان کے بیان کا نہ یہ موقع ہے اور نہ محل اس وقت تو ہم غلام عباس صاحب کو خراج عقیدت پیش کرنے جمع ہوئے ہیں۔ ہمارے دل ان کی جدائی سے بھاری ہیں۔ بھاری آنکھیں ان کی وفات سے پر خم ہیں اور ہمارا وجود ان کی موت پر توجہ کثرت ہے۔ میں تو اپنے بچپن سے عباس صاحب کو جانتا تھا جب وہ بچپن کے رسالے پھول لاہور کے ایڈیٹر تھے۔ میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا اور رسالہ پھول کا خریدار تھا۔ کچھ عرصے بعد نے دیکھا کہ غلام عباس صاحب کا نام اب بحیثیت ایڈیٹر رسالے پر آنا بند ہو گیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے نام کو دو سال پر نہ دیکھ کر مجھے انتہائی ملال ہوا تھا اور میں نے رسالہ پھول کو ایک خط بھی لکھا تھا۔ یہ بات تو بعد میں معلوم ہوئی کہ وہ پھول رسالے سے الگ ہو کر اسی زمانے میں کل ایڈیٹر پلو سے وابستہ ہو گئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں اسکول کی لائبریری سے لے کر میں نے "انحراف

افسانے "پڑھے تھے اور یہ دل میں اُترنے والی ایسی خوب صورت کہانیاں تھیں کہ ان کے مجرّد حسین نقوش تک بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔

ان کا پہلا افسانہ "مجموعہ ۱۹۳۳ء میں "کاروان" لاہور میں شائع ہوا تھا۔ اس سے پہلے بچوں کے لیے ان کی کئی کتابیں جاپانی اور دوسری کہانیاں 'چاند کی بیٹی' 'ثریا کی گھڑیا' برف کی بیٹی' 'الحمر' کے افسانے وغیرہ شائع ہو چکے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۳۹ء میں انھوں نے اپنا زندہ جاوید افسانہ "آئندہ کی" لکھا۔ اسی نام سے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۴۸ء میں ملکتیہ جدید لاہور سے شائع ہوا اور پھر ۱۹۶۰ء میں ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "جاڑے کی چاندنی" کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۴۱ء میں جزیرہ سخنوران دہلی سے شائع ہو چکا تھا۔ کن رس کے نام سے ان کا ایک اور مجموعہ ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا تھا۔ غلام عباس صاحب نے جو کچھ لکھا وہ منتخب ہے۔ غلام عباس صاحب کو صحیح معنی میں خراج عقیدت پیش کرنے کا اب واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کی ساری کتابوں کو مرتب کر کے شائع کریں تاکہ اب جب عباس صاحب ہم میں نہیں ہیں ہم اور گئے والی نسلیں ان کی کتابوں کے مطالعے سے انھیں یاد کر سکیں اور تاریخ ادب میں ان کے صحیح مقام کا تعین کر سکیں۔

غلام عباس صاحب ہمارے وہ افسانہ نگار تھے جو اپنی زندگی میں کلاسیک کا درجہ اختیار کر گئے تھے۔ وہ دھیمے مزاج کے انسان تھے اور یہی وجہ تھی کہ ان کی کہانیوں کا مزاج ہے۔ غلام عباس نے مسابلی افسانے نہیں لکھے بلکہ ان افسانوں کی کہانیاں لکھی ہیں جو آفاقی اور ابدی ہیں اور اسی لیے ان کے افسانے وقت کے ساتھ اپنی دل چسپی نہیں کھوٹتے بلکہ اسی طرح تازہ و زندہ رہتے ہیں جس طرح وہ اس وقت تھے جب لکھے گئے تھے۔ ان کے افسانوں کا "خاتمہ" بھی ہوتا ہے اور نقطہ عروج بھی اور ایسا گہرا اثر چھوڑتا ہے کہ پڑھنے والا حیرت و استعجاب کے ساتھ ان کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ ان کی اپنی زندگی کا افسانہ بھی پہلی اور دوسری نوبت کی درمیانی شب کو ایک ایسے ہی نقطہ عروج پر ختم ہوا۔ وہ خوش و غرم اپنی بیوی سے باتیں کر رہے تھے کہ آٹا فائنا میں وہ ہو گیا جس کی تشہید بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ غلام عباس اس دنیا سے جا چکے تھے اور یہاں پہنچ کر ان کے

ایک افسانے ”دو تماشے“ کے یہ آخری جملے یاد آ رہے ہیں۔

”ابن مرزا صاحب“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”آپ رو رہے تھے؟“
 ”نہیں تو“ مرزا نے بھرائی ہوئی آواز میں جھوٹا ہنستے ہوئے کہا۔ ”آنکھوں کو ذرا
 سگریٹ کا دھواں لگ گیا تھا۔۔۔۔۔ ارے مجھ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ سرکار ایسے
 دردناک فلم دکھانے کی اجازت کیوں دیتی ہے؟“
 اور شاید اس وقت میری آنکھوں کو بھی سگریٹ کا دھواں لگ گیا ہے۔

(۲۸ نومبر ۱۹۸۲ء)

رئیس احمد جعفری کی خدمات

سید رئیس احمد جعفری نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو وفات پائی۔ اس طرح آج ان کی وفات کو سولہ سال سے ایک دن اوپر ہو گیا ہے اور مرنے کے سولہ سال بعد تک کسی نکھنے والے کا اس طرح زندہ و باقی رہنا کہ آنے والی نسلیں اس کا نام احترام سے لے کر اس کی تحریروں سے استفادہ کریں اس بات کا اشارہ ہے کہ رئیس احمد جعفری کی تحریروں کا ایک حصہ یقیناً ایسا ہے جو وقت کی حدود سے گزر گیا ہے یا گزر رہا ہے۔ رئیس احمد جعفری ایک اچھے انسان تھے۔ کم گو اور کم آمیز۔ اچھے علمی و مذہبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ریاض خیر آبادی کے نواسے تھے۔ ایسے زود نویس کہ مطبوعہ صفحات کتب کی تعداد کے اعتبار سے شاید ہی ہم دوسرا نام لے سکیں۔ جو کام کیا جلدی کیا اور حجم کر کیا۔ سید سے ساونے۔ نہ ٹیم ٹام، نہ دکھاوا، نہ مشہرت سے مغرور ہوئے اور نہ دولت سے مغرور ہوئے۔ میں نے ہمیشہ انھیں شیر وانی میں ملیوس پایا۔ یونہیں کہ شیر وانی کے سارے ٹن کبھی بند کیے ہوں۔ حسرت موہانی کے معتقد، مولانا محمد علی جوہر کے عاشق۔ خود دار بھی اور خدا ترس بھی۔ کھلا کر خوش ہونے والے اور دوست احباب کی خدمت کر کے شکر بھیجنے والے خادم اسلام اور خادم قوم۔ ان موضوعات پر جب بھی لکھا دل نکال کر رکھ دیا۔ ساری عمر لکھتے رہے۔ نہ جلسے نہ جلوس۔ نہ کسی پلیٹ فارم سے وابستہ۔ جو کچھ کیا یا لکھا کر لکھایا۔ دولت بھی اور مشہرت بھی یہی لکھنے والے کی منزل ہے۔ جس نے ایسا کر کیا وہ منزل تک پہنچا۔ جو انھیں بازی میں اُبھار رہا کہیں کا نہ رہا۔ کام کرنے والے کر بھی جیتے ہیں اور کام نہ کرنے والے جیتے ہوئے بھی مر جاتے ہیں۔ ہارجیت، اکامیابی، ناکامی کاپتا اُس وقت چلتا ہے جب پیروں تلے سے زمین

مکمل چمکتی ہے۔ اس لیے نئی نسل کے نگھنے والوں کو عبرت پکڑنی چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ کام ہی زندگی ہے اور کام ہی کامیابی ہے۔ اصل زندگی ایثار سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ ایثار جو کسی مقصد کے لیے کیا جائے اور وہ کامیابی جو اس مقصد کو حاصل کرنے سے حاصل کی جائے اور نگھنے والا کہہ سکے عہد۔

شاد م از زندگی خویش کر کارے کردم

سید رئیس احمد جعفری کی زندگی سے یہی پیغام حیات ملتا ہے۔

رئیس احمد جعفری صاحب کے بارے میں ایک بات میں اختصار کے ساتھ اور کہنا چاہتا ہوں۔ رئیس احمد جعفری ایک اچھے ادیب لیکن مثالی صحافی تھے۔ ادیب صرف اپنے موضوعات پر سوچتا اور لکھتا ہے۔ وہ زندگی کی تخلیقی توانائیوں کو زندگی کے تعلق اور حوالے سے لفظوں میں نکارتا اور پرتاتا ہے اور اس طرح خود زندگی کی تشکیل دہیں ہاتھ بٹا کر زندگی کو کسے بڑھانے میں مدد دیتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ نہ صرف زندگی کی بلکہ اس زبان کی بھی جس میں وہ لکھ رہا ہے تخلیقی قوتوں کو دریافت کرتا اور ابھارتا ہے۔ یہ ایک مثالی ادیب کا دائرہ عمل ہے۔ مثالی صحافی بھی زندگی کے دائرے میں کام کرتا ہے لیکن اس میں ایسی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ہر اس موضوع پر کم وقت میں نگھنے کی قوت رکھتا ہے جو اسے دیا جائے اور پڑھنے والا جب اس شجرے کو پڑھے تو مطمئن ہو جائے۔ مثالی صحافی کے ہاں اسی لیے موضوعات کا تنوع ہوتا ہے پھیلاؤ ہوتا ہے۔ میں جب رئیس احمد جعفری صاحب کو مثالی صحافی کہتا ہوں تو اس کے ثبوت میں میں ان کی تحریروں کے تنوع اور پھیلاؤ کو پیش کرتا ہوں اور یہ وہ تحریریں ہیں جو بہت کم وقت میں لکھی گئی ہیں۔ وہ ناول نگار بھی تھے اور مترجم بھی۔ سوانح نگار بھی تھے اور مورخ بھی۔ مذہبی موضوعات پر بھی لکھتے تھے اور سیاسی موضوعات پر بھی۔ غرض کہ شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر انھوں نے نہ لکھا ہو یا نہ لکھ سکتے ہوں۔ انہار کا اداریہ ہو یا کالم۔ کسی اہم خبر کا مسئلہ ہو یا کسی تازہ و گرم موضوع پر قلم اٹھانے کی بات ہو! رئیس احمد جعفری کا قلم ہمیشہ زندہ و تازہ رہا۔ انھوں نے ایک طرف اقبال پر لکھا: اقبال، اقبال اپنے آئینے میں، اقبال اور عشق رسولؐ اور دوسری طرف سفر نامہ ابن بطوطہ، طلسم ہوشیاراؤ

فساد آزاد کی تلخیص کی اور انہیں مرتب کیا۔ ایک طرف اسلام منزل بہ منزل کے عنوان سے کتاب لکھی تو دوسری طرف افاد است محمد علی، سیرت محمد علی، مطائبات محمد علی، بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد اور حیات قائد اعظم لکھی۔ ایک طرف اگر انہوں نے مستند عربی کتابوں کے ترجمے کیے تو دوسری طرف پچاس سے زیادہ ناول لکھے۔ ایک طرف کامریڈ کا انتخاب مرتب کیا تو دوسری طرف RARE DOCUMENTS کے نام سے نایاب سیاسی و تہذیبی اہمیت کی دستاویزوں کو مرتب کیا۔ یہ نفاذہ متوقع اور پھیلنا جس کے باعث میں رئیس احمد جعفری صاحب کو مثالی صحافی کہتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کا وہ اصل مقام ہے جہاں وہ منفرد ہیں اور کوئی دوسرا لکھنے والا ان کو نہیں پہنچتا۔

(۲۸ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

امداد صابری: تاریخ صحافت

جناب امداد صابری اردو زبان کے نامور مصنف ہیں۔ جنہوں نے ایسے مصنفات اردو زبان کو ایسی پیش بہاکتا ہیں دی ہیں کہ ان کا نام و کام صدیوں زندہ و باقی رہے گا۔ ان کے موضوعات کے تین دائرے ہیں۔ صحافت، تصوف اور تذکرہ نویسی۔ صحافت ان تینوں دائروں میں سب سے بڑا اور سب سے وسیع دائرہ ہے اور اس دائرے میں ان کا سارا بنیادی اور اہم کام آچکا ہے۔ ان کی مشہور زمانہ تصنیف ”تاریخ صحافت اردو“ کی اب تک ۵ ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کام مولانا امداد صابری صاحب نے ایک خاص منصوبے کے مطابق کیا ہے۔ پہلی جلد میں ۱۸۳۳ء سے ۱۸۵۷ء تک کی تاریخ صحافت بیان کی ہے، دوسری جلد میں ۱۸۵۸ء سے ۱۸۷۵ء تک تیسری جلد میں ۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۰ء تک چوتھی جلد میں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۰ء تک اور پانچویں جلد میں ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک کی تاریخ صحافت بیان کی ہے۔ تاریخ بیان کرتے ہوئے جہاں مولانا امداد صابری صاحب نے مخصوص رجحانات حالات وغیرہ کو بیان کیا ہے وہاں وہ نادر واقعات، ادبی، علمی، تعلیمی و ثقافتی واقعات بھی نقل کر رہے ہیں جن سے تاریخیں مرتب ہوئی ہیں، انہیں کے ساتھ ساتھ اخبارات اور رسائل کے ایڈیٹروں کے مستند حالات بھی درج کر دیے ہیں۔ میں وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اخبارات اور ان کے مدیروں کے بارے میں جو سوانحی حالات اور دوسری متعلقہ معلومات ہیں

لد ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۸ء مطابق ۳۰ صفر المظفر ۱۴۰۹ھ بروز پچھٹا شنبہ مولانا

امداد صابری دہلی میں وفات پا گئے۔

کتاب میں شامل ہیں وہ اس طور پر کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتیں۔ تاریخ صحافت کی یہ پانچوں جلدوں میں معلومات کا ایک بحر ذخار ہیں جن کے مطالعے سے ادب سیاست اخبار اور عام مورخ کو وہ مواد مل سکتا ہے جو اب تک ہماری نظروں سے پوشیدہ تھا۔ ان پانچ مطبوعہ جلدوں کے مطالعے سے ہم انیسویں صدی کے وسط سے لے کر ۱۹۴۰ تک کی سیاسی و تہذیبی تاریخ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے حالات و عوامل اور جدوجہد کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔ یہ انتاج کام تھا جسے مولانا امداد صابری ہی کر سکتے تھے۔ یہ بات کہ مولانا امداد صابری صاحب ہی یہ کام کر سکتے تھے میں نے اس لیے کہی کہ مولانا کے پاس اتنا بڑا ذاتی کتب خانہ ہے جس میں انیسویں صدی کے وسط سے لے کر آج تک کے اخباروں کے بیشتر فائل موجود ہیں اور ساتھ ساتھ ان کے پاس وہ اخلاص اور وہ لگن بھی موجود ہے جو فراہ کو جوئے شہیہ لانے پر آمادہ کرتی ہے۔

ان پانچوں جلدوں کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ کام کر کے مولانا امداد صابری نے ہمارے آج کے مادہ پرست اور زہر و رمعا شرے میں عشق صادق کی ایک لازوال مثال قائم کی ہے اور اردو زبان کو قیمتی اسناد چمکنے والے اصلی موتیوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ "تاریخ صحافت اردو" ہر قسم کی معلومات کا ایسا خرمینہ ہے کہ ہم اسے ایک طرح سے قانوس صحافت کہہ سکتے ہیں۔ ان جلدوں کے مطالعے سے ان تبدیلیوں کا بھی واضح طور پر احساس ہوتا ہے جو ہندوستان میں بسنے والی قوموں کے باطن میں آئیں اور عظیم پاک و ہند کے نقشے کو تبدیل کر گئیں۔ ان جلدوں میں تاریخ کا دریا ہماری نظروں کے سامنے رواں دواں ہو جاتا ہے اور ہم تاریخ کے ساتھ خود بھی سفر کرنے لگتے ہیں اور جو کچھ گذشتہ ڈیڑھ صدی میں ہوا اس کی جیتی جاگتی متحرک تصویریں فلم کی طرح سامنے آ جاتی ہیں۔ اخبار واقعات کا روزنامہ ہوتے ہیں اور واقعات کا اظہار زندگی کا اظہار ہے۔ اخبار نویس واقعات کو بیان کرتا ہے اور ان پر اپنے رد عمل کا اظہار کرتا ہے۔ دور دراز علاقوں میں ہونے والے واقعات کو ہم تک پہنچاتا ہے اور اس طرح ہماری معلومات اور شعور میں اضافہ کرتا ہے۔ ہمیں اپنے نقطہ نظر سے قریب لانا ہے اور ایک ہی بات کو بار بار کہہ کر ہمیں قبول کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور اس طرح سیاسی ہندو

کو تیز کر کے زندگی کو آگے بڑھانے میں مثبت کردار ادا کرتا ہے۔ ادیب یہ کام اس طور پر نہیں کرتا۔ وہ اپنے دور کی روح کا اظہار کر کے اسے گنے والے زمانوں کی روح سے پیوست کر دیتا ہے اور اس روح کا اظہار اس طور پر اور اس انداز پر بیان کے ساتھ کرتا ہے کہ روح کی آواز ہماری زبان بن جاتی ہے اور ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ اسی لیے صبح کا اخبار سب کچھ کر کے شام کو باسی ہو جاتا ہے لیکن ادب اسی طرح تازہ رہتا ہے۔ مولانا امداد صابری نے "تاریخ صحافت اردو" لکھ کر صحافت کی تاریخ کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے اور یہ اتنا بڑا کام ہے کہ مولانا امداد صابری کو جتنی داد دی جائے وہ کم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تاریخ صحافت اردو کی چھٹی جلد بھی بیک وقت نظر کا پے آجائے گی جس میں ۱۹۳۱ء سے ۱۹۸۰ء تک کی تاریخ بھی اسی طرح بیان کی جائے گی۔

امداد صابری صاحب کی دوسری اہم تصنیف "گلدستہ صحافت" ہے جس میں مولانا نے اُن گلدستوں کو مرکزِ مطالعہ بنایا ہے جو بزرگ عظیم پاک دہند کے طول و عرض میں تقریباً انیسویں صدی کے وسط سے شائع ہونا شروع ہوئے اور شعر و ادب کی ترویج و اشاعت میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اب تو گلدستوں کا رواج باقی نہیں رہا لیکن اس زمانے میں جب شعر و شاعری کا چرچا عام تھا، طبعی و غیر طبعی مشاعرے مقبول تھے، چھاپے خانے عام ہو گئے تھے یہ گلدستے وہ کام کرتے تھے جو آج رسائل و جرائد اور اخبارات کرتے ہیں۔ مولانا کی تحقیق کے مطابق اردو کا سب سے پہلا گلدستہ "گلِ رعنا" کے نام سے مولوی کریم الدین نے دہلی سے جاری کیا۔ یہ وہی مولوی کریم الدین ہیں جن کا تذکرہ طبقاتِ شعرائے ہند ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا اور آج بھی اردو زبان کے قابلِ ذکر تذکروں میں شمار ہوتا ہے۔ مولانا امداد صابری صاحب نے اس "گلدستہ صحافت" میں ۱۰ گلدستوں کا تعارف کرایا ہے اور انتخابِ کلام کے ساتھ مرقب اور نگینے والوں کے بارے میں بھی ضروری معلومات فراہم کر دی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے بھی اردو زبان و ادب کے بہت سے نامعلوم گوشے سامنے آجائے ہیں۔ اس کی نوعیت بھی ایک طرح سے ادبی تذکرے کی ہے۔ یہ "گلدستہ صحافت" کی جلد اول ہے۔ مولانا نے وعدہ کیا ہے کہ بقیہ گلدستوں کے شعر اور ادبی کلام وہ اگلی جلد

میں پیش کریں گے۔ کیسے ہم سب دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مولانا امداوصاہری صاحب کو صحت کے ساتھ اتنی عمر عطا فرمائیں کہ وہ سادے علمی و ادبی کام پورے کر سکیں جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہم سب جانتے ہیں کہ مولانا کے دو تذکرے ”تہذیب مقدس کے اردو شعرا“ اور ”جنوبی افریقہ کے اردو شاعر“ مشہور ہو چکے ہیں اور ان کے علاوہ روح صحافت، افرنگیوں کا جہان، تذکرہ حضرت ضامن شہید فرنگ، تذکرہ قادری عہد احمدی کی وقاری عہد الرحمن آبادی، دارستان شرف، تذکرہ مولانا شاہ حکیم، وطنی کے قدیم مدارس و مدرس، شہیدان وطن، ضلع مراد آباد اور اردو کے اخبار نویس وغیرہ شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ میں مولانا کا ذاتی طور پر اس لیے بھی شکر گزار ہوں کہ ان کی کتابوں سے میری معلومات میں اضافہ ہوا ہے حتیٰ کہ میرے دادا جالب دلہوی صاحب مرحوم و مغفور کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں انھوں نے درج کی ہیں جن کا مجھے بھی علم نہیں تھا۔ خدا مولانا کو صحت و عمر دراز کے ساتھ خوش و خرم رکھے تاکہ وہ اسی طرح کام کرتے رہیں۔

مولانا نے تاریخ صحافت اردو کی ۵ جلدیں اور گلدستہ صحافت کی ایک جلد لکھ کر وہ کام کیا ہے جو فرد نہیں بلکہ ادارے کرتے ہیں۔

۱۰ جولائی ۱۹۸۳ء

پیر حسام الدین راشدی

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ موت نے گھر دیکھ لیا ہے۔ جوش گئے، فرق گئے، احسان دانش گئے اور ابھی ان لوگوں کا غم تازہ تھا کہ ایک دن میں دو ہستیاں حضرت جعفر شاہ پھلواری اور پیر حسام الدین راشدی بھی ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے:

کئی نیندوں اب تو سوتی ہے اسے چشم گر یہ ہاک
مڑگاں تو کھول مشہر کو سیلاب لے گیا

یہ وہ لوگ تھے جو صدیوں میں کبھی کبھار پیدا ہوتے ہیں اور اپنی نظر کیمیا گرسے خاک کو سونا بناتے ہیں۔ پیر حسام الدین راشدی کا بچپن ہم سب پیر صاحب کے نام سے پکارتے تھے کراچی شہر کی علمی زندگی کی آبرو تھے۔ ایک اچھے انسان، ایک متواضع مہمان نواز، اکٹھے دل کے بے ہاک دوست، صاحب علم اور صاحب نظر۔ کام میں ڈوب کر کام کرنے والے، نگہرائی میں جاکر راجہ تحقیق دینے والے۔ ۱۹۵۲ء میں ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میں اور شاہد احمد دہلوی مرحوم صبح کے وقت ان کے گھر گئے تھے۔ وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں اجوزمین سے لے کر چھت تک کتابوں سے بھرا ہوا تھا، اپنی بڑی سی میز کے سامنے بڑی ہوتی گرسی پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ دراز قامت، صحت مند لکھا ہوا جسم، چمک دار گندمی رنگ، شگفتہ چہرہ، بڑے تپاک سے ملے۔ چلنے پھرنے کی اور بہت دیر تک علم و ادب کی باتیں کرتے رہے اور پھر دسمبر ۱۹۸۱ء میں ان سے میری آخری ملاقات ہوئی۔ وہ علاج کے لیے لندن چلنے کی تیاری کر رہے تھے۔ دراز قامتی تو ہائی تھی لیکن چہرے کی چمک غائب ہو چکی تھی۔ آواز بھاری اور ٹھنسی ہوئی تھی لیکن مزاج کا مودانہ بن اسی طرح قائم تھا۔ کئی آپریشن ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی بہت اسی طرح

باقی تھی اور زندہ رہے کا حوصلہ اسی طرح زندہ تھا۔ پھر وہ چلے گئے اور مارچ میں جب دلہی
کئے تو حالت بہت بگڑ چکی تھی۔ سلطان جسم کے مختلف حصوں میں پھسل چکا تھا اور وہ
بہت تکلیف اٹھا رہے تھے۔ ملنے چلنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس
چلا آیا۔ دو دن بعد دل کا دورہ پڑا اور وہ اسپتال میں داخل کر دئے گئے جہاں سکیم اپریل
۱۹۸۲ء کو وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار اسپتال میں داخل ہوئے
تھے لیکن ہر بار صبح و سالم گھر لوٹ گئے تھے۔ ابھی ۵ سال پہلے کی بات ہے آپریشن کے بعد
روس سے واپس گئے ہوئے انھیں خاصا وقت ہو چکا تھا اور اب وہ صحت مند تھے۔ میں
نے انھیں ایک خط لکھا اور درخواست کی کہ وہ کج شام کو دعوت میں خزر و تشریف لائیں وہ
جب بھی دعوت کرتے تو مجھے ضرور بلاتے اور میں جب بھی دعوت کرتا انھیں خزر و زحمت
دیتا۔ جب قاصد خط لے کر گیا تو وہ گھر پر نہیں تھے۔ گھر والوں نے خط لے لیا۔ مغرب کے
وقت میرے ہاں گئے۔ گلے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا پیر صاحب خیر تو
ہے کہہ گئے میں اسپتال میں داخل تھا۔ آپریشن ہوا ہے۔ آپ کا خط آیا تو اسپتال سے چلا آیا۔
وہاں پڑے پڑے ہی گھر گیا تھا۔ سوچا آپ سے اور دوسرے دوست احباب سے ملاقات
ہو جائے گی اور گپ شپ سے دل بہل جائے گا۔ چہرہ پر وہی بشارت تھی جو ہمیشہ ان
کی پہچان رہی ہے۔ رات گئے تک بیٹھے رہے۔ کھانا کھایا اور پھر اسپتال واپس چلے گئے۔
اسپتال جانا، آپریشن کرانا ان کے لیے معمولی بات ہی بن چکی تھی۔ میں نے ایسے موذی بیماری کے
مریض کو اتنا جری، اتنا بہادر کبھی نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ موت سے بھی ہنستے
کھیلتے ہم کنار ہونا چاہتے ہیں۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں پہلی بار ان پر دل کا شدید دورہ پڑا
تھا۔ اس کے بعد وہ آٹھ سال تک نہایت احتیاط سے زندگی بسر کرتے رہے۔ سگریٹ
بھی چھوڑ دی تھی لیکن جب میں دسمبر ۱۹۸۱ء میں ان سے ملا تو وہ پھر کثرت سے سگریٹ پی
رہے تھے۔ شاید انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اب وہ اس منزل میں ہیں جہاں کثرت سے
سگریٹ نوشی بھی ان کو مزید نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ ۱۹۵۸ء ان کی زندگی کا اہم موڑ
تھا۔ اس کے بعد ہی ان کی تصنیف و تالیف کا اصل دور شروع ہوتا ہے۔ ان کی بیشتر

اور قابل ذکر تالیفات ۱۵۵۸ء کے بعد ہی مرتب و شائع ہوئیں۔

پیر حسام الدین راشدی بنیادی طور پر تاریخ کے عالم تھے اور تاریخ کے حوالے ہی سے ان کی نظر مختلف علوم و فنون پر تھی۔ پیر صاحب نے سندھ کی تاریخ و تہذیب کے ان بنیادی مآخذ کو مرتب و شائع کر کے سندھ کی علمی و تہذیبی زندگی کو حیات نو بخشی کاج جو سندھ کی نئی نسل علمی و تحقیقی کام کر رہی ہے وہ پیر صاحب کی تالیفات ہی سے روشنی حاصل کر رہی ہے۔ پیر صاحب نے جدید تحقیق کی روایت کو اہل سندھ سے روشناس کرایا۔ ان کی یہ خدمت تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

پیر حسام الدین راشدی نے فارسی سندھی اور اردو میں کم و بیش ۵۰ کتابیں تصنیف، تالیف اور مرتب کیں جن میں محمد اصلاح مرزا کا تذکرہ شعرائے کشمیر، میر علی شیر قانع شٹھوی کے تذکرے حنفیہ الکرام، مقالات الشعراء، مکی نامہ اور معیار سالکان، طریقت بھی شامل ہیں اور خلیل شٹھوی کا تذکرہ بحکمہ مقالات الشعراء، میرک یوسف کی تاریخ مظہر شاہجہانی، سماں نور محمد کھلوڑہ کی تاریخ منشور الوصیت، سید عبدالقادر شٹھوی کی حدیقۃ الاولیاء اور میر محمد شٹھوی کا ترخان نامہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پیر صاحب کی تحقیق و ترتیب کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ جہاں صحت متن پر پوری توجہ دیتے تھے وہاں متعلقہ معلومات کو بھی ساتھ ہی یکجا کر دیتے تھے۔ یہ دوسری افادیت ان کی ہر مرتبہ کتاب میں ملے گی۔ وہ بہت محنتی، اُن ٹھک انسان تھے۔ اکثر وہ یہ کہتے کہ کتاب کو اس طرح مرتب کرنے کہ اس موضوع کو دورِ جدید تک مکمل کر دیتے مثلاً محمد اصلاح مرزا کے تذکرہ شعرائے کشمیر کو مرتب کیا تو اصل تذکرے میں ۲۰۵ شعرا کا تذکرہ و ترجمہ درج تھا۔ پیر صاحب نے نہایت محنت و کاوش سے ان فارسی شعرائے کشمیر کو مزید شامل کر دیا جو محمد اصلاح کے بعد کے دور سے تعلق رکھتے تھے اور اس طرح تقریباً ۳۱۲ نئے شعرا کا اسی انداز سے اور احضار کر دیا۔ پھر میر شاعر کے بارے میں ضروری و مفید معلومات بھی شامل کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تذکرہ اب چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں اقبال تک کم و بیش سارے فارسی شعرائے کشمیر شامل ہو گئے ہیں۔ یہی

مورت سکی نامہ کی ہے۔ سکی نامہ کا اصل متن ۹ صفحات پر مشتمل ہے اور حواشی اور اضافے ۷۰ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اپنے اس تحقیقی عمل سے انھوں نے نہ صرف قدیم کتابوں کو نئی زندگی دی بلکہ تحقیق کی صبر آزما روایت کو بھی قائم کر دیا۔ اردو زبان میں ان کی دو تصانیف خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک ”مرزا غازی خان اور اس کی ہزم ادب“ جسے انجمن ترقی اردو نے چند سال پہلے شائع کیا تھا اور دوسری ”دودھ چراغ محفل“ جس میں اردو فیہ معلومات کے علاوہ غالب کے شاگرد ناطق مکرانی کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں وہ نادر اور اچھوتی ہیں۔ ان کی مرتب کتابیں متعلقہ دور کی دوسری ساری کتابوں سے کم و بیش بے نیاز کر دیتی ہیں۔ پھر جن نادر مخطوطات کتابوں تحریر ہوں اور دستاویزات تک ان کی رسائی اتنی بہت کم اہل علم ان تک رسائی کر سکتے تھے۔ وہ جو کچھ لکھتے اس دور کو ساتھ ہی سمیٹ لیتے۔ میں نے شاہد احمد دہلوی کی وفات کے بعد ان کی یاد میں سائی کراچی کاشا ہد احمد دہلوی تہم مرتب کیا تو پھر صاحب سے بھی درخواست کی کہ وہ بھی ایک مضمون شاہد صاحب کے بارے میں لکھیں۔ انھوں نے مضمون لکھا اور اس میں ۱۹۴۷ء کے بعد سے شاہد احمد دہلوی (وفات تک کے دور کو سمیٹ کر دیر یا کو کوزہ میں بند کر دیا اس مضمون کے آخر میں ہر جگہ نے لکھا:

”زندہ رہنے والے مرنے والے کو قبر میں اتار کر جب تک پوری قبر نہ اٹ جائے اس وقت تک ممکن ٹوٹیوں میں بیٹ کر اپنی خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے۔ دنیا اسی کا نام ہے۔ کوئی کسی کے پیچھے نہیں گیا۔ دنیا یوں ہی چلتی رہے گی۔ دنیا کا کاروبار اور انسانوں کے مشاغل ویسے ہی جاری رہیں گے۔“

شاہد احمد دہلوی کی وفات کے ۵ سال بعد پیر سیہ صام الدین راشدی بھی ہم سے رخصت ہو کر زہر زمین خاک میں آسودہ ہو گئے۔ لوگ چلے جاتے ہیں اور پھر عمارتیں نہیں اُتے بتا دیے آرام بہت ہے۔

پھر آئے جو ہوئے خاک میں جا آسودہ
غالباً زہر زمین تیر ہے آرام بہت

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ، سال کی عمر میں ۲۳۱ھ یعنی ۱۹۸۵ء کو شام کے سواچھ بکچہ کراچی میں اپنے محبوبہ حقیقی سے حاملہ ہوئے۔ وہ سلطان کے موزی مرض میں مبتلا تھے اور کافی عرصے سے بیمار تھے۔ مرض کی نوعیت ان سے پوشیدہ رکھی گئی تھی۔ وفات سے آٹھ دس دن پہلے جب میں اور شفیق خواجہ صاحب ان کی عیادت کے لیے ان کی بیٹی اور ہم نام داماد لے ایم سعید صاحب کے گھر پہنچے تو صاحب خانہ نے ہمیں بتایا کہ ان کی بیماری کے بارے میں کوئی ذکر نہ کیا جائے۔ ہم خاصی دیر ان کے ساتھ رہے۔ انھوں نے ان کے چہرے سے عین تھکا ہوا اور سیاہ ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر بیٹھے اور پھر کھجے کے سہارے صوفے پر بیٹ گئے۔ بار بار آستین کو دھرتے اپنے ہاتھوں کو کھجاتے رہے۔ اس عرصے میں علم داد چکی باتیں ہوتیں۔ انھوں نے اپنے آئندہ کے منصوبوں کا ذکر کیا۔ شیخ الہند اکادمی کے مسائل اور منصوبوں کی وضاحت کی اور بتایا کہ وہ اب جلد انجلہ ہندوستان واپس جا کر اپنے کاموں میں لگ جانا چاہتے ہیں۔ حضرت علیؑ کی حیات و میراث کو مکمل کرنے کا بھی ذکر آیا۔ ان سے گفتگو کر کے محسوس ہوا کہ مولانا ذہنی طور پر اسی طرح مستعد ہیں جس طرح وہ بیماری سے پہلے تھے۔ اس سے پہلے ہی ان سے گزشتہ تین چار سال میں دو تین بار ملاقات ہو چکی تھی اور ہر بار مولانا کی خوش مزاجی، اندازِ کلام اور وسعتِ علم سے میں متاثر ہوا تھا۔ وہ ایک اچھے روشن و مبالغہ آفرین دل اور وسیع النظر انسان تھے۔ ان کی تصانیف پر محکمہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کو کٹھنوں کے اندر سے نہیں بلکہ کائنات کی وسعتوں میں جھانک کر دیکھا تھا۔ اسی لیے ان کی تحریریں کج کی نسل کو نہ صرف متاثر کرتی ہیں بلکہ ان کے دل کے نہاں

خاؤں میں اتر جاتی ہیں۔ یہ بصیرت لمبے نہایت وسیع و عریض زندگی کے حوالے سے، علم اور فکر کے گہرے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے اور کسی بھڑاکوئی شاہ ولی اللہؒ کوئی سرسیدؒ اور فنا کوئی شبلی نعمانیؒ کوئی الطاف حسین حالیؒ کوئی ڈاکٹر محمد اقبالؒ کوئی سید سیدان ندویؒ اس بصیرت کو الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مگر کبھی ہمارے درمیان ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ انسان فانی ہے لیکن اس کے کنارے، اس کی بصیرتیں یقیناً لافانی ہیں اور اسی لیے مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ بھی اس دور کے حوالے سے یقیناً زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ نے بہت کچھ اور اپنے خیالات کو تحریر و تقریر و دونوں سطح پر معاشرے تک پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں زبان بھی دی تھی اور قلم بھی۔ وہ عربی و فارسی پر بھی عبور رکھتے تھے اور اردو و انگریزی پر بھی۔ ان کے پاس علم بھی تھا اور اس کے اظہار کا وسیلہ بھی۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ نے چون کہ زندگی کو پورے پھیلاؤ کے ساتھ دیکھا تھا اس لیے ان کے مزاج میں شہرِ لاؤ، اعتدال اور حلم اس درجہ تھا کہ مسائل کو سلجھانے اور حل کرنے کی غیر معمولی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ پھر ان میں انتظامی صلاحیت بھی اعلیٰ درجے کی تھی۔ انسانی رشتوں کی نزاکت و لطافت کا وہ پورا خیال رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ محفل آرا بھی تھے اور حجاب محفل بھی۔ اس دور میں ایسے اعتدال پسند روشن دماغ اور ہر دل عزیز مولانا خال خال نظر آتے ہیں اور انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ اپنی تین طلاقوں میں میں نے محسوس کیا کہ مولانا سے ملنا زندگی کو سنوارنے اور ثواب و اجر حاصل کرنے کا درجہ رکھتا ہے۔ ان سے مل کر اور ان سے گفتگو کر کے انسان تازہ دم ہو جاتا تھا۔ فکری دار و اشعار سے اظہار میں تازگی پیدا کرتے تھے اور حاضر علم اور وسیع معلومات سے ملنے والے کے دماغ کو روشن کر دیتے تھے۔

مولانا ۱۹۰۸ء میں اصغر گوٹھی اور جگرہ ادا آبادی کے مژدہ حضرت شاہ عبدالحق صاحب کی دعاؤں سے پیدا ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ، علامہ بریلویؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ، مفتی محمد شفیعؒ اور محمد اویس کاندھلویؒ سے علم کا نور حاصل کیا۔ کچھ عرصہ ڈاکٹر اہل میں تدریس کا کام بھی کیا اور پھر جدید تعلیم کے لیے سینٹ پیٹرن کالج دہلی میں داخل ہو کر ایم اے پاس کیا اور پھر پریس استاد مقرر ہو گئے۔ ۱۹۴۸ء تک

ندوة المصنفین قائم کیا اور ماہنامہ ”بان“ جاری کیا اور وفات تک وہ اس کے مدیر بنی رہے۔
 ماہنامہ ”بان“ نے علمی و مذہبی حلقوں میں جلد وہ مقام حاصل کر لیا جو اس دور میں صرف
 ”معارف“ عظیم ہی کو حاصل تھا۔ ۱۹۳۷ء تک وہ سینٹ اسٹیفین کالج سے وابستہ رہے اور
 پھر آزادی کے بعد جب مسلم ولی اجماعی نوہ پرنسپل کی حیثیت سے مدرسہ عالیہ کلکتہ سے وابستہ
 ہو گئے اور اس ادارے کو دوبارہ قائم کر کے اور اس میں علم و زندگی کی نئی روح پھونک کر گیارہ
 سال بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ زینیات کے صدر کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے علی گڑھ
 سے ریٹائر ہو کر وہ بھدروہی کے تحقیقی ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ مسلم یونیورسٹی کے زمانے
 میں وہ ایک سال تک میکمل یونیورسٹی کنٹاڈا سے بھی وابستہ رہے اور آخر میں دارالعلوم دیوبند
 میں شیخ الہند اکادمی کے ٹرانسکریپشن کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے۔ وفات تک اسی اکادمی سے
 ان کا تعلق رہا۔ وہ چاہتے تھے کہ علمائے ہند کی مستند علمی کتابوں کو از سر نو جدید انداز سے ترمیم
 مدون کیا جائے۔ ان کا ارادہ تھا کہ اکابر دیوبند اور شاہ ولی اللہ کی بلند پایہ تصانیف اور
 خصوصاً حجتہ اللہ البالغہ کو جدید فن تدوین کے مطابق مدون کیا جائے۔ یہ وہ کام ہیں جو
 یقیناً کیے جانے چاہئیں تاکہ مفید کتابیں دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق مرتب و مدون
 ہو کر سامنے آئیں اور مولانا کی روح بھی اس عمل تدوین سے خوش ہو۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تصانیف میں مسلمانوں کا عروج و زوال، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ
 اسلام میں غلامی کی حقیقت، مولانا سعید اللہ سندھی اور ان کے ناقد، وحی الہی، فہم قرآن خطبات
 اقبال پر ایک نظر، چار علمی مقالات، صدیق اکبر، نقشۃ المصداور اور ہندوستان کی شرعی
 حیثیت علمی و مذہبی سطح پر وہ کتابیں ہیں جو طویل عرصے تک دل چسپی سے پڑھی جائیں گی اور
 حوالے کی کتابوں کی حیثیت سے زندہ رہیں گی۔

مولانا نے اپنی کسی تقریر میں کہا تھا کہ آج کے مسلم معاشرے میں تین رجحانات پائے جاتے
 ہیں۔ قدامت پرستی کا رجحان، ترقی پسندی کا رجحان اور آزاد فکری کا رجحان۔ قدامت پرستی
 ہر مسئلے یا معاملے کو کسی خاص فقہی مسلک کی روشنی میں تلاش کرتی ہے۔ ترقی پسندی کی اصل
 قانون قرآن و حدیث ہے اور فقہی مسالک کی حیثیت اس قانون کی تشریح و توضیح کی ہے۔

وہ بھلے خود قانون نہیں ہے۔ اس بنا پر کسی حدیث کے احاطہ پہلے براہ راست قرآن و حدیث میں دیکھنا چاہیے اور اس کے بعد فقہ سے وہی کام لینا چاہیے جو عدالت میں بحث کرتے وقت ایک وکیل نظر آکر سے لیتا ہے۔ آزاد فکری صرف قرآن کو ماحذ تسلیم کرتی ہے اور حدیث کو حجت نہیں مانتی۔ ان رجحانات پر روشنی ڈال کر مولانا نے فرمایا کہ ان کا تعلق اس رجحان سے ہے جو ترقی پسندی کے ذیل میں آتا ہے۔ مولانا کی فکر و تحریر کا بنیادی رجحان یہی ہے۔

اسی رجحان کی وجہ سے ان کی تحریروں میں روشنی نظر آتی ہے۔ وہ دوسرے مولانا حضرت کی طرح مسائل کو الجھا کر اسلام کو دو تفرقہ نہیں بناتے بلکہ اعتدال و توازن کے ذریعے اسے نئے پہلو سامنے لاتے ہیں جن سے مسائل سلجھ کر زندگی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی حنفی العقیدہ ضرور تھے لیکن انھوں نے اسلام کی تفہیم کے سلسلے میں حنفی فقہ سے اختلاف کرنے میں تامل نہیں کیا۔ مثال کے طور پر تین طلاوتوں کے مسئلے میں انھوں نے امام ابو حنیفہ کے مقابلے میں حافظ ابن القیم اور امام ابن تیمیہ کے مسلک کو ترجیح دی۔ اسی طرح تسمیہ عند الذبح کے مسئلے میں بھی امام شافعی کے فقہ کو ادایت دی۔ غورتوں کے مساجد میں نماز پڑھنے کے مسئلے پر بھی انھوں نے فقہ حنفی سے مدد اختلاف کیا۔ وہ فقہی رد اداری کے قائل تھے اور فقہ کو حجت آخر تسلیم نہیں کرتے اور اجتہاد کو دور حاضر میں ضروری سمجھتے تھے۔ یہی وقت کی ضرورت ہے اور یہی مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا نقطہ نظر تھا۔

”خطبات اقبال پر ایک نظر میں انھوں نے لکھا ہے کہ

”ایک ایسے دور وجود و تعطلِ ذہنی میں جب کروگ اجتہاد کا لفظ زبان سے نکلتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں ان پر آزاد خیالی کا لیل نالگ جائے علامہ اقبال نے اپنی چشم بصیرت سے کئے والے زمانہ کو دیکھ لیا۔۔۔۔۔ کہ وہ زمانہ جلد آ رہا ہے جب مسلم ممالک طوقِ غلامی سے آزاد ہو کر اپنی اپنی حکومتیں لے کر جنٹیں گے اور دنیا کی دوسری مملکتوں کے ساتھ استحکام اور عروج و ترقی کے میدان میں مسابقت کرنے لگیں۔“

مجموعہ ہوں گے۔ اس وقت سائنس اور ٹیکنالوجی کی غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقیات کے عہد میں سینکڑوں ہزاروں ایسے جدید مسائل پیدا ہوں گے جن کا حل اجتہاد کے بغیر ناممکن ہو گا۔

(ص ۶۵ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر پریس میرٹھ ۱۹۸۳ء)

یہ صورت حال جسے علامہ اقبال نے دیکھ لیا تھا آج ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ اب اسلام کی اشاعت اور زندگی سے اس کا گہرا تعلق پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھولا جائے۔ مسائل زندگی کو اجتہاد کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور روح اسلام سے نئی نسلوں میں بصیرت کی نئی روشنی اور اسلام کو زندگی میں عملی طور پر اپنانے اور برتنے کی حقیقی صلاحیت پیدا کی جائے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تحریریں اور ان کے افکار ہمیں یہی راستہ دکھاتے ہیں۔ اسی لیے وہ درر حاضر میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اور ہمارے دلوں میں عزت و احترام کی مستند پر منتھن ہیں۔

اب جب کہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی ہمارے درمیان نہیں ہیں عزت میں بات کی ہے کہ مولانا کی تمام کتابوں کو خاص اہتمام سے شائع کیا جائے۔ نہ صرف کتابوں کو بلکہ ان کے مضامین، شذرات، انشروں اور مطبوعہ و محفوظ تقریروں کو بھی یکجا و مرتب کر کے طبع کیا جائے اور پھر سیٹ کے طور پر پبلک میں پیش کیا جائے۔ مولانا کی یاد کو زندہ و باقی رکھنے کا یہی مفید اور کارآمد طریقہ ہے اور اس پر جلد عمل کرنا چاہیے۔ اس طرح ہم مولانا کے افکار کو نئے والی نسلوں تک پہنچا سکیں گے۔ یہ ہم سب کا دینی فریضہ اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی روح کو خوش کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ دیکھئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی حضرت غالب علیہ شعر شہر رہے ہیں :

کون ہوتا ہے حریف سے مرد افکن عشق
ہے مکر رہ ساتی پہ صلا میرے بعد

مجنوں گورکھپوری

۳۱ جون ۱۹۸۸ء کو حضرت مجنوں گورکھپوری ۸۳ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ موت یقیناً برحق ہے لیکن جب ایسے لوگ مرتے ہیں جنہوں نے معاشرے کے جنگل کو نکلتا بنایا ہے یا جنہوں نے آنے والے زمانے کی نوید دے کر معاشرے میں نئے شعور اور نئے احساس کو جنم دیا ہے تو ان کے رخصت ہونے پر ہمیں دلی رنج ہوتا ہے اور ہم افسردہ ہو جاتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کی وفات کی خبر جب میں نے سنی تو میں بھی اُداس ہو گیا اور گزشتہ بیس سال کی ملاقاتوں کی تصویریں مٹھریک ہو کر ذہن کے پردے پر نمایاں ہونے لگیں۔ مجنوں صاحب کی ایک بات تو یہ ہے کہ وہ اسم ہاسکی تھے۔ دھان پان سے اُدھے پتلے الاغر و نچھتا دیکھیے تو مجنوں دکھائی دیں۔ یہی ان کا خلیق تھا۔ اسی سے دُنیا میں مشہور ہوئے اور یہی نام تاریخ ادب کا حصہ ہے۔ جسمانی طور پر مجنوں لیکن ذہنی طور پر رستم کی طرح طاقت ور و بہادر ہوتے اور اکثر ہوتے لیکن ذہن اسی طرح تنومند و تازہ رہتا۔ بات کرتے تو علم کا ڈروا ہو جاتا۔ یادداشت ایسی کہ برسوں کی بات یا اربع صدی پہلے پڑھی ہوئی کتابوں کے حوالے حسب موقع فوراً زبان پر آ جاتے۔ اس یادداشت نے ان کا اس وقت بہت ساتھ دیا جب رعشہ کی وجہ سے لکھنا ان کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد جو کچھ انہوں نے لکھا بول کر لکھوا یا "غالب" شخص اور شاعر" جو ان کی آخری کتاب ہے اُنم دبیش اسی طرح بول کر لکھوائی گئی تھی۔

مجنوں صاحب کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی اعتدال و توازن ہے۔ وہ لکھتے وقت جذبات کی زد میں نہیں بہتے بلکہ مثال اور دلیل سے اپنی بات اس طرح احتیاط سے کہتے ہیں کہ

بات پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے دور کے اثرات کو قبول کیا لیکن اس کے ساتھ بہ نہیں گئے۔ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۰ء میں رومانیت اور رومانی ادب کا دور تھا۔ ایک طرف آخر شیرانی کی آواز ساری فضا پر چھائی ہوئی تھی اور دوسری طرف نیا فنیجریا اور ل احمد غنیو کی رومانوی تحریروں اور افسانے قبولیت عام کے پر دل پر اثر رہے تھے۔ مجنوں صاحب نے بھی اسی زمانے میں افسانہ نگاری شروع کی اور اسی رنگ میں داد و تحریروں سے کر شہرت حاصل کی لیکن جب ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو انھوں نے آنے والے نئے کی ہواؤں اور تقاضوں کا رخ دیکھ کر افسانہ نگاری کو خیر باد کہا اور ترقی پسند نقطہ نظر کی ترہیل کے معاشرے میں نئے شعور کی پیدائش و ترویج میں مدد دی لیکن یہاں بھی انھوں نے آنکھیں کھلی رکھیں اور ادب ہی کو اپنی ہر تحریر کا بنیادی حوالہ بنایا یہی وجہ ہے کہ جب ہواؤں نے فکر و خیال کی سطح پر رخ بدلا ان کی تنقیدی تحریروں اسی طرح تازہ دم رہیں اور آج بھی اپنی عظمت اور جمالیاتی رنگ کے باعث دل چسپی سے پڑھی جاتی ہیں اور ادب کی تاریخ کا حصہ ہیں۔

وفات سے دس پندرہ سال پہلے وہ اپنی خود نوشت لکھوانا چاہتے تھے تا کہ ان کا دور آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ ہو جائے لیکن مناسب لکھنے والے کا کوئی انتظام نہ ہونے کی وجہ سے یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ البتہ ان کی خواہش ایک حد تک اس طرح پوری ہو گئی کہ میرے دوست لطف اللہ خان صاحب نے پندرہ سولہ لکھنے کا انٹرویو سب پر محفوظ کر لیا۔ میں سوال کرتا تھا اور مجنوں صاحب اس کا جواب دیتے تھے۔ میں نے اس انٹرویو میں صرف نقد دینے کا کام کیا تاکہ مجنوں صاحب زیادہ سے زیادہ بول سکیں۔ اس انٹرویو میں گفتنی بھی ہے اور ناگفتنی بھی۔ لطف اللہ خان صاحب کو شاید آپ نہ جانتے ہوں لیکن انھوں نے جو کام کیا ہے وہ ادارے بھی نہیں کر سکتے۔ ان کے پاس آوازوں کا جو ذخیرہ ہے برصغیر میں تو یقیناً کسی فرد یا ادارے کے پاس نہیں ہے۔ شاید دنیا بھر میں کسی فرد کے پاس آوازوں کا اتنا بڑا ذخیرہ نہیں ہو گا۔ مجنوں صاحب کی "آواز" کی بات تو میں نے کی۔ ایک ذرا اسی مثال اور دیتا ہوں۔ فیض احمد فیض کا سارا کلام خود ان کی زبانی محفوظ ہے۔ وہ بھی جو شائع ہو چکا ہے اور وہ بھی جو شائع نہیں ہوا۔ لطف اللہ خان صاحب بھی اب شرے

بہتر ہے جو ہے ہیں اور ہم سب کو حکومت کو اداروں کو اس ذخیرے کو محفوظ کرنے کی فوراً سبیل کرنی چاہیے۔ مجنوں صاحب کا یہ پندرہ سولہ گھنٹے کا یہ انٹرویو عجیب کنانی صورت میں شائع ہونا چاہیے۔

مجنوں صاحب نے افسانے بھی لکھے اور تنقید بھی۔ جمالیات پر سب سے پہلی کتاب انھوں نے لکھی۔ مغربی ادب کے شاہکار ادب پاروں کے اردو میں ترجمے بھی کیے۔ نئی فکر کو ادبی تنقید میں سموکرا سے ایک ایسی صورت عطا کی کہ وہ مجنوں صاحب کی انفرادیت بن گئی۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ مجنوں صاحب اسم بانستی تھے۔ ان کا خاندانی احمد صدیقی تھا۔ ادب میں انھوں نے صدیقیت کی ترویج کی اور پیشہ صداقت اور سچائی کا اظہار کرتے رہے۔ مجنوں گورکھپوری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

”مجھے بے باکی کے ساتھ کھرے کو کھرا اور کھولے کو کھوٹا، سچ کو سچ“

جھوٹ کو جھوٹ، اصلیت کو اصلیت، فریب کو فریب کہہ دینے میں کسی کوئی تاثر نہیں ہوا اور میری زبان اور میرے قلم نے اس معاملے میں کبھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

یہی ان کی تحریروں کی خوبی ہے اور اسی خوبی کی وجہ سے وہ آج کی طرح آنے والے زمانوں میں بھی دل چسپی سے پڑھی جائیں گی۔ انسان قافی ہے لیکن اس کی صدا بہادری تحریر میں اسے لا قافی بنادیتی ہیں۔ پروفیسر احمد صدیق یقیناً وفات پا گئے ہیں لیکن حضرت مجنوں گورکھپوری زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ: ایک تعارف

یہ انتہائی مسترت کا موقع ہے کہ اردو کے محابہ استادوں کے استاد اردو فارسی زبان؟ ادب کے محقق اور نقاد پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب ^{رحمۃ اللہ علیہ} آج ہمارے درمیان موجود ہیں۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں ڈاکٹر عبداللہ نے ساری عمر اردو زبان و ادب کی خدمت میں گزاری ہے اور اپنی بلند پایہ تصانیف سے اردو زبان کو مالا مال کیا ہے۔ ان کی تصانیف ہماری زبان کا وہ قیمتی سرمایہ ہیں جنہیں آنے والی نسلیں محنت و احترام کے ساتھ سنبھال کر رکھیں گی۔ انہیں دیکھ کر، ان سے مل کر، ان سے باتیں کر کے نہ صرف زندہ رہنے کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے بلکہ ساری عمر کام اور صرف کام کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ ان کی ذات مجسم خلوص ہے اور اسی خلوص کی وجہ سے ان کی شخصیت میں ایک ایسی دل کشی پیدا ہو گئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب سے محبت کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ذات جادو اثر، ان کی گفتگو پُر سحر اور ان کی تحریر پُر اثر ہے۔ ڈاکٹر صاحب صرف ادیب ہی نہیں ہیں بلکہ حقیقی ادیبوں کی اس عظیم بلوری سے تعلق رکھنے ہیں جن کی تحریروں کے دائرے میں سارے مروجہ علوم آجاتے تھے اور اسی لیے ان کی تحریروں کا واسطہ وسیع، ان کا نقطہ نظر فراخ اور ذہنی تناظر پھیلا ہوا ہے۔

ڈاکٹر عبداللہ صاحب اردو کے ان ادیبوں میں سے نہیں ہیں جو لکھتے اردو میں

ہیں۔ شہرت کی دولت اردو کے وسیع سے بڑھتے ہیں اور پھر مجبور و کرہی کے دلائل بن کر آئی
 بہت ہی میں جمید کرتے ہیں جس میں کمی رہے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ایک سیمینار میں شرکت کرنے
 والے تھے۔ اس جلسے کی عداوت ڈاکٹر عبداللہ صاحب فرما رہے تھے۔ وہاں کچھ اربوں
 نے جب اپنے مقام پر تھے تو ان مقالوں کی ایک اہم خصوصیت تو یہ تھی کہ وہ موضوع سے ہٹے
 ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ حضرات صرف اپنی بات کہنے کے لیے سیمینار کے پلیٹ فارم
 کو استعمال کر رہے ہیں۔ جن صاحب کا موضوع سائنسی معاشرے میں ادب کا مقام تھا انھوں
 نے اس موضوع پر تو ویسے کہا کہ اپنی بے ربط باتوں میں کہیں کہیں لفظ سائنس شامل کر دیا اور
 پھر جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ کئی لگے شگ ایک جگہ ایک ہی سائنس میں انھوں نے دو باتیں کہیں۔
 ایک یہ کہ اردو درباری زبان ہے۔ دوسرے یہ کہ اردو مشکل زبان ہے۔ انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ
 اردو جو آج تک عوام کی زبان نہیں ہے اور جس کے ذریعے صاف پاکستان کے مختلف الزبان
 علاقے ایک دوسرے سے بات نہ کر سکتے ہیں کیسے درباری زبان ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے
 ہاں درباری زبان کے معنی عوامی زبان کے ہوں۔ بہر حال اردو وہ واحد زبان ہے جس کا تعلق کیا
 پیداؤں سے ہے کہ آج تک عوام سے رہا ہے۔ انگلستان و امریکہ میں انگریزی عوامی زبان ہے لیکن
 پاکستان میں انگریزی عوام کی نہیں سرکار درباری زبان ہے۔ اس لیے اگر وہ یہ کہتے کہ پاکستان میں
 انگریزی درباری زبان ہے تو بات کچھ میں آتی لیکن ان کا مقصد تو ایک نعرہ دینا تھا۔ ایک لائن یعنی
 نئی نگرانی لائن اختیار کر کے اردو کے نفاذ کو معرض التوا میں ڈال دیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا
 کہ اردو مشکل زبان ہے۔ اگر یہ مشکل زبان ہوتی تو عوام کی زبان نہیں بن سکتی تھی اور چون کہ یہ عوامی
 زبان ہے اور درباری کی زبان ہے اس لیے مشکل کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر مشکل سے مراد یہ تھی کہ اس
 میں تاریخی و ادبی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو مشکل ہیں تو وہ یہ بھول گئے کہ تاریخی و ادبی ہمارے زبان میں ہیں جن
 سے ہمارا انوار ہم کوئی کسی بھی زبان بولتے ہوں۔ یہی تہذیبی و ادبی ثروت ہے اور وہ تو میں بولنے نہ بول
 اپنی تہذیب و ادبی کی راہنمائی کر رہے ہیں۔ اپنے اندر شہر قلعہ کی طرح ہیں تو وہ اپنے حافظے کو کھول سکتی ہیں اور حافظہ کھولنے
 سے جیسے نر اگل ہو جائے اسی طرح حافظہ کھولنے کے بعد معاشرہ بھی پائل ہو جائے۔ قرآن پاک میں
 تقریباً دو ہزار سے کچھ زیادہ بنیادی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کی مختلف صورتوں کا جواب دہی ہزار الفاظ بن جاتے

ہیں۔ ان دو ہزار بنیادی الفاظ میں سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سے زیادہ الفاظ ایسے ہیں جو اردو زبان میں استعمال ہوتے ہیں اور ان میں سے کم و بیش پانچ سو الفاظ ایسے ہیں جو اردو اور پاکستان کی دوسری علاقائی زبانوں مثلاً سندھی، پنجابی، پشتو، بلوچی، بھارتی وغیرہ میں مشترک ہیں۔ سندھی کو بھیجیے۔ سندھی میں تقریباً ۲۵۰ فی صد الفاظ اردو زبان کے ہیں۔ کیا اس فطری ہسانی مشترک سے روگردانی کر کے ہم ملک کی یک جہتی اور قومی اتحاد کو نقصان نہیں پہنچائیں گے؟ یہ بات یاد رکھیے کہ اگر اس ملک میں اردو زبان کو جلد نافذ کیا گیا تو ہماری قومی یک جہتی روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتی جائے گی اور ایک دن آگے گا اور خدا کرے وہ میری زندگی میں نہ گئے کہ آسمان ہمارے سروں پر گر پڑے گا۔ اردو، جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے کل اور پریوں اپنے میکچروں میں بتایا، کم مایہ زبان نہیں ہے۔ وہ زبان جس نے تیر غالب، اقبال جیسے خاں پیدا کیے ہوں وہ زبان جس نے مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خان اور عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے جادو بیان مقرر پیدا کیے ہوں وہ زبان جس نے سر سید احمد خان، مولانا محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد اور شبلی وصال جیسے نثر نگار پیدا کیے ہوں وہ زبان جس نے مولانا مودودی، ابو الحسن علی ندوی اور عبدالماجد دریا بادی جیسے اردو نثر نگاروں کے پیدا کیے ہوں کیا کم مایہ زبان کہلائی؟ اس وقت ہمارا معاشرہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقل اور نور و فوں سے محروم ہو گیا ہے۔ وہ اچھائی اور ہمدانی میں امتیاز کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو گیا ہے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا ملک ہے جہاں دو نظام تعلیم رائج ہوں، ایک انگریزی تعلیم کا نظام اور دوسرا اردو تعلیم کا نظام۔ انگریزی تعلیم حاکم پیدا کر رہی ہے۔ ایسے حاکم جولاڈ میکالے کے قصودات کی جہتی جانتی تصویر ہیں جن کے ذہن، جن کی روح، جن کی فکر بدی اور سامراجی ہے اور دوسرے اردو تعلیم، جو رحمت اور محکوم پیدا کر رہی ہے۔ اس سے رفتہ رفتہ جو صورت حال پیدا ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ معاشرہ اپنی بہترین صلاحیتوں سے محروم ہو کر اسی راستے پر چل رہا ہے جس پر ہیں انگریزی سامراج چلا گیا تھا۔ اسی لیے ہمارا تعلیم پانڈہ طبقہ انگریزی و غریبی سامراج کا نمائندہ و ترجمان ہے اور جاہل عوام ہماری تہذیب، ہماری ثقافت اور ہماری روایت کے ترجمان ہیں۔ اسی لیے گزشتہ ۲۵ سال سے ہم مسلسل عدم استحکام

کا شکر رہے ہیں۔ صاحبزادہ قریب اس طرح نہیں جنتیں جس طرح اودھیں اندازے ہمارے حکمران ۲۵ سال سے اسے رہا ہے ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ صاحب اسی نقطہ نظر کے ترجمان اودھ اسی مقصد کے علمبردار ہیں۔

میں نے ڈاکٹر عبداللہ صاحب کی کم و بیش ساری تحریریں اور کتابیں پڑھی ہیں۔ ان کی کتابوں اور خیالات سے استفادہ کیا ہے۔ ان کی جوان ہمت سے اپنے اندر کام کرنے کا حوصلہ پیدا کیا ہے۔ میں یہاں ان کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ نہیں لے رہا ہوں بلکہ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر عبداللہ جیسے لوگ روز بروز پیدا نہیں ہوتے۔ اب جس مشن کو لے کر وہ نکلے ہیں اردو کے نفاذ کے سلسلے میں وہ جو کچھ علمی اقدام کر رہے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم سب ان کا ساتھ دیں ان کی ہمت بڑھائیں تاکہ وہ اردو کے نفاذ کی تحریک کو منزل مقصود تک پہنچا سکیں۔ انہیں ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ احساس محرومی کا شکار نہیں ہونا چاہیے بلکہ حکمران طبقے کو راہ راست پر لانے اور انہیں شعور و عقل سے نصیحت کرنے کے لیے اپنی جدوجہد کو بانٹنا چاہیے۔ حضرات! جیسے ہمارے ملک میں قحط سالی کے زمانے میں بارش کے لیے نماز استسقاء ادا کی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ ہم کو گوارہ پر اپنی رحمتوں کا نزول فرما کر بارش بھیج دیتے ہیں اسی طرح کیے ہم نفاذ اردو، ملکی سلامتی اور قومی یکجہتی کے لیے ”نفاذ نفاذ“ ادا کریں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم پر جلد ہوش و شعور کی بارش برسائے اور اہل اقتدار کا تہذیبی حلقہ واپس آجائے۔

گنگوہی اور اقبال کے محبوب صوفیا وغیرہ اسی سلسلے کی تصانیف ہیں جو کئی ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی اثنا میں متعدد مضامین بھی لکھے جو مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے۔ فارسی و عربی کی فاضلانہ استعداد رکھتے ہیں۔ شریک جہانگیری کا اردو میں ایسا ترجمہ کیا جو نہ صرف مستند مانا جاتا ہے بلکہ اپنے حواشی کی وجہ سے بڑی افادیت کا حامل ہے۔ "سیرالاولیاء" کا اردو ترجمہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ کام اور صرت کام مولانا اعجاز الحق قدوسی کی حقیقی زندگی ہے۔ اب تک اردو میں کیا سندھی میں بھی سندھ کی کوئی ایسی تاریخ نہیں تھی جو سارے ادوار کا احاطہ کرتی ہو۔ مولانا نے تین جلدوں میں تاریخ سندھ لکھی جو ان کی دوسری کتابوں کی طرح اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے ایک سے زیادہ ایڈیشن شائع ہوئے اور یونیورسٹی کالجوں کی اعلیٰ جماعتوں میں شامل نصاب کی گئی۔

مولانا سے ملیے تو ان کے چہرے کی گفتگو، ان کے ٹسکراتے ہونٹ، ان کی بولتی آنکھیں آپ کو بھی احساس نہیں ہونے دیں گی کہ انھوں نے ساری عمر مفلسی میں بسر کی ہے۔ معمولی آمدنی، بڑا کنبہ، جب یہ صورت ہو تو لکھنے پڑھنے والے انسان کے لیے ہمارے مضافات معاشرے میں سانس لینا بھی دو بھر ہو جاتا ہے۔ لطف یہ کہ اس کام میں مزدوری ہے اور نہ عزت و احترام۔ معاشرہ لکھنے پڑھنے والے کو ایک ایسا دیوانہ سمجھتا ہے جو اپنا وقت، اپنی عمر اور اپنی زندگی بے کار گنوار رہا ہے۔ مولانا قدوسی اگر مستند کتابیں لکھنے کے بجائے اسی گلوں کے ساتھ ٹھیلہ لگاتے تو تیس سال میں زیب النساء اسٹریٹ، انارکلی یا راجہ بازار میں ان کی بڑی سی دکان ہوتی، کار میں کوٹلی سے نکلتے، بچوں کو انگلستان، امریکہ تعلیم کے لیے بھیجتے۔ معاشرے میں، دولت کی وجہ سے، ان کی عزت ہوتی۔ بڑی بڑی دعوتوں میں بلائے جاتے۔ اہل سیاست ان سے چندہ لینے آتے اور اقتدار ملنے پر خطبات اور درآمدی پرشوں سے نوازتے۔ مولانا کی حالت یہ ہے کہ آج سے اکتیس سال پہلے بھی بے زدی کا شکار تھے اور آج بھی۔ ہندو ہزار صفحات اور پچاس لاکھ سے زیادہ الفاظ لکھ کر، ۱۹۷۱ء، ۱۹۷۲ء، ۱۹۷۳ء کی عمر میں اسی طرح مفلس اور تلاش

معاش میں سرگرداں ہیں اور رعبہ زدہ ہاتھ سے بیاہت آباد رلاؤ کھیت کے گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سرد کمرے میں بیٹھے لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر عبرت ہوتی ہے اور اپنے سفاک معاشرے کے خلاف اعلان جہاد کرنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ معاشرہ جہاں اہل علم بے عزت ہوں، جہاں ادب و فن نگاہ سچوس سے بھی زیادہ بے قیمت ہوں، جہاں اہل ادب کے ساتھ بدسلوکی ہے اعتنائی برتی جاتی ہو، جہاں انھیں حقارت سے دیکھا جاتا ہو اور اہل اقتدار منافقت کے ساتھ بے فیض تعریف کرتے ہوں وہاں علم و حکمت اور عقل و دانش کے پھول کیسے کھل سکتے ہیں اور مرید احمد خان، محمد علی جوہر، علامہ اقبال کیسے پیدا ہو سکتے ہیں؟ بہر حال علم و ادب کے شہداء انہوں نے ان حالات میں بھی کام کیا ہے اور ان شہداء انہوں میں مولانا اعجاز الحق قدوسی کا نام معدود سے چند لوگوں میں سے ایک اور محترم نام ہے۔ اب جب کہ عمر کے برگد کو ٹنڈ اور تیز ہوائیں ہلا رہی ہیں مولانا قدوسی نے اپنی زندگی کے پچھتر سال کی داستان بھی قلم بند کر دی ہے جو دل چسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ قدوسی صاحب نے رعبہ زدہ ہاتھ سے اپنی داستان حیات لکھ کر احباب کی اس فرمائش کو پورا کر دیا ہے جس کا اتفاق وہ برسوں سے کر رہے تھے۔

ہر باشعور انسان کی زندگی، اس کے تجربے، اس کی جدوجہد، کشمکش، عمل و رد عمل کی لہر، روایت و انحراف کے دائرے، عملِ خیر کی نئی نئی صورتیں اتنا اور ایسا مواد فراہم کرتی ہیں کہ ان سب کا بیان ناول کی طرح دلچسپ بن جاتا ہے۔ اسی لیے خود نوشت سوانح عمری ایسی دلکش تصنیف ہوتی ہے جس میں انسان کے باطن میں چھپی ہوئی روح جلوہ فگنی ہوتی ہے اور دل کی آواز رس گھولتی ہے۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی کی خود نوشت بھی اسی لیے دل چسپ ہے۔ اس تصنیف میں زندگی کے تجربوں کے بیان میں ایک ایسی ادبیت ہے کہ ہر شخص اسے روانی و ذہنی انہماک کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ مولانا کے لکھنے کا پنانا ازا ہے جس میں ادبی شائستگی، مہذب انسان کی نرم مزاجی، ہماری رول ریتی شعر رستی اور بات کو میٹھے سلونے لہجے میں کہنے کے خفایاتی عمل نے ایسا رس گھول دیا ہے کہ

ان کی عبارت دل موہ لیتی ہے۔ اس تصنیف کو پڑھ کر ایک حساس، باشعور انسان کی زندگی کے وہ پہلو سامنے آجاتے ہیں جو پڑھنے والوں کے لیے سرمۂ بصیرت ہیں۔ اس خودنوشت میں ہماری ملاقات ایسے بہت سے انسانوں سے بھی ہوتی ہے جنہوں نے انسانی رشتوں کو تقدس عطا کیا ہے، جنہوں نے گریختوں کو سہارا دیا ہے جنہوں نے علم و فضل سے معاشرے کو روشنی عطا کی ہے، جنہوں نے بے لوثی و ایثار کا چراغ روشن کر کے انسانیت کو زندہ رکھا ہے جنہوں نے اس صدی کے بڑے حقیقے کی ترجمانی و نمایندگی کی ہے اور جواب تاریخ کا حقہ بن گئے ہیں۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی کی یہ عمر گزشتہ حیات اسی لیے دل چسپ اور اہم ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی اسے میری طرح شوق سے پڑھیں گے۔

(۲۲ مئی ۱۹۸۱ء)

اے کے بروہی کی یاد میں

جناب اے کے بروہی بھی وفات پا گئے۔ انا نقد و آنا الیہ راجعون۔ موت برحق اور ایک ایسا عمل ہے جس سے ہر ذی روح کو دو چار ہونا پڑتا ہے لیکن ممتاز ہستیوں کی وفات سے جو خلا پیدا ہوتا ہے وہ کبھی پُر نہیں ہوتا۔ اے کے بروہی مرحوم ایک ایسی ہی ممتاز ہستی تھے جنہوں نے ۱۹۳۷ء کے بعد علم و دانش، فلسفہ و فکر اور قانون و انصاف کے دائرے میں وہ کارنامے انجام دیے کہ ان کا نام اس حوالے سے برسوں تک یاد رہے گا۔ ۱۹۳۷ء میں جب میں پاکستان آیا تو وہ بحیثیت وکیل عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور ختم کو سندھ مسلم لاکالجی میں اصول قانون (Jurisprudence) پڑھاتے تھے۔ اس زمانے میں ان میں بھی ایل ایل بی کا طالب علم تھا۔ سندھ مسلم لاکالجی اپنی موجودہ عمارت میں مستقل نہیں ہوا تھا بلکہ سندھ مدرسۃ الاسلام ہی میں واقع تھا۔ ہم روز شام کو صدر دروازے سے داخل ہوتے، وسیع و عریض صحن کو پار کرتے اور مسلم کی عمارت میں سیڑھیوں سے اوپر چڑھ جاتے جہاں تھوڑے سے طلبہ کلاسوں سے آتے جاتے یا برآمدے میں کھڑے باتیں کرتے نظر آتے۔ یہ پاکستان کا ابتدائی دور تھا اور زیادہ تر بڑے صغیر بچے وہند کے دور و راز گوشوں سے کنے والے نوجوان ہی یہاں دکھائی دیتے تھے۔ مولوی صاحب، خدا ان کی مغفرت فرمائے، پرنسپل تھے۔ نیک، دل نیک، نہاد اور نیک سیرت۔ سدا بڑے صغیر ہندو مسلم فسادات کی آگ میں جل رہا تھا۔ کراچی شہر پاکستان کا بنیاد دار الحکومت تھا۔ قائد اعظم اور لیاقت علی خان زندہ تھے۔ خٹا جیروں کے قافلے کراچی پہنچ رہے تھے اور نہایت محبت و خلوص کی فضا میں ہر شخص ایک دوسرے کے دک درد میں شریک ہو رہا تھا۔ جب معاشرے کے افراد ایک دوسرے کے غم

بانٹ لیتے ہیں تو بڑے سے بڑا سا خرچہ جسے کھیلے گا گزر جاتا ہے۔ اس سارے بھرانہ اور قتل و غارتگری کے باوجود ہم سب سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ایک تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دشمن ہماری طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی ہمت بھی نہیں کرتا تھا۔ اے کے بروہی صاحب اکثر کلاس میں دو قومی نظریے پر روشنی ڈالتے اور بڑے عظیم پاک و ہند میں ہونے والے واقعات پر اپنے مخصوص انداز سے اظہار خیال کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن جب وہ کلاس لے رہے تھے تو اچانک بجلی چلی گئی۔ سارا علاقہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ رہے۔ دُور سے ریڈیو پر صحافیوں کا آواز آرہی تھی۔ بروہی صاحب نے کہا بجلی چلی گئی ہے۔ اے بھول جاتے۔ اب میں موسیقی کے پس منظر میں نصاب سے گریز کر کے کچھ اور باتیں کروں گا۔ پھر انھوں نے پاکستان اور بھارت کے بارے میں پُر مغز گفتگو کی۔ بجلی آئی تو بھی وہ اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ کچھ جب میں اس گفتگو پر غور کرتا ہوں تو بروہی صاحب تحریک پاکستان کے ایک ایسے داعی نظر آتے ہیں جن کی ساری فکر و نظر کا محور پاکستان تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ بروہی صاحب ممتاز ہوتے گئے اور کس ایسی شخصیت کے روپ میں ابھرے جسے قومی سطح کی شخصیت کہا جاسکتا ہے۔ عام انسان مسکان کی قید میں رہ کر خوش ہوتا ہے لیکن بڑا انسان وہ ہے جو اپنے گلوں اور اپنے علاقے کی سطح سے اٹھ کر ملک کی سطح پر ابھرے اور پھر اپنا رشتہ اپنی زمین کے ساتھ ساتھ، ساری زمین سے جوڑ دے۔ بروہی صاحب نے یہی کیا اور ساری عمر اسی لیے وہ پھیلتے، بڑھتے اور بلند ہوتے گئے۔ اس تمام عرصے میں گلے کا ہے ان سے ملاقات ہوتی رہی اور جب کراچی یونیورسٹی میں طبی نفسیات کا انسٹیٹیوٹ قائم کیا گیا تو اس کے بورڈ میں نے اپنے خاص نمائندے کے طور پر ان کا نام تجویز کیا اور ان سے اس تجویز کو قبول کرنے کی درخواست کی جسے انھوں نے بخوشی قبول کر لیا۔

بروہی صاحب کا تعلق کسی مذہبی یا سیاسی جماعت سے نہیں تھا۔ ان کی ذات اور ان کی دانش و حکمت ان سب چیزوں سے بلند تھی۔ وہ سفیر بھی رہے اور وزیر بھی لیکن ان کی شخصیت عہدوں سے ہمیشہ بلند رہی۔ ان کی حقیقی حیثیت ایک ایسے فلسفی اور دانش ور کی تھی جو اسلام کا شہدائی تھا۔ وہ ملک کے چٹل کے کیل تھے اور اس حیثیت میں ان کا نام خود ایک

افسانہ بن گیا تھا۔ قانونی دلائل اور قانون کا علم ان کی شناخت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جس حالت میں جاتے عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے۔

اسلام کے تعلق سے انھوں نے ہمیشہ عہد حاضر کے ان فلسفیوں کے نظریات پر تنقید کی جو سائنس کو مذہب پر فوقیت دیتے رہے ہیں اور جن میں سگنڈ فرائیڈ، کارل مارکس، ماہر غرائیہ و زیم و غیرہ شامل ہیں۔ بروہی صاحب کا زاویہ نظریہ تھا کہ مذہب دراصل عقیدے اور ایمان کا معاملہ ہے جس کے ساتھ صاحب ایمان شب و روز بسر کرتا اور زندگی کا سفر طے کرتا ہے۔ اس عمل سے وہ مذہبی شعور پیدا ہوتا ہے جو زندگی کی تاریکیوں کو روشن کر دیتا ہے۔ بروہی صاحب کا بنیادی نقطہ نظریہ تھا کہ انسانی صورت حال ہی کچھ ایسی ہے کہ انسان بغیر خدا کے بامعنی زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس صورت حال میں انسان کے سامنے دو راستے رہ جاتے ہیں: آیا وہ سچا مذہب اختیار کرے یا جھوٹا مذہب اختیار کرے۔ مذہب اس کی منزلت بھی ہے اور مجبوری بھی۔ انسان کی شخصیت کی حقیقی نشوونما اسی شعور سے پیدا ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے جو مذہبی سچائی سے وابستہ ہے۔ یہ کائنات گہرے اور بامعنی مقصد کے ساتھ پیدا کی گئی ہے اور انسان کا فرض ہے کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے سجدگی کے ساتھ جدوجہد کرے۔ یہ کائنات ایک مربوط وحدت ہے اور اصولاً توحید کے تحت چل رہی ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ ان علامات اور اشاروں سے خدا اور اس کی قدرت کو اس کے جلال و جمال کو حسن و قہر کو معرفت تدریج میں بلکہ اپنے باطن کی گہرائیوں میں مسلسل تلاش کرے۔ یہ اس کا مذہبی فریضہ ہے۔ بروہی صاحب کی تقریریں اور تحریریں اسی نقطہ نظر کی ترجمانی کرتی ہیں۔

اب بروہی صاحب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی ساری فلسفیانہ تحریروں کو یکجا کر کے دو جلدوں میں شائع کر دیا جائے اور انھیں طاق تاربخ پر رکھ دیا جائے تاکہ تاریخ ان کی اصل قدر و قیمت کا تعین کر کے بروہی صاحب کا درجہ متعین کر سکے۔

میر علی احمد خان تالپور مرحوم

وقت کو کس نے روکا ہے۔ ہوا کے جھونکے کی طرح آتا ہے اور پہلے بھر میں گنبد چلا ہے اور یادوں کی خوشبو اور کانٹوں کی چھین چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ شاید یہی زندگی ہے اور اسی لیے گُنیا۔۔۔ سرائے فانی ہے۔

موت ایک ماندگی کا وقفہ ہے

یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

میر علی احمد خان تالپور کی زندگی سے لبریز گفتگو ابھی تازہ تھی کہ پتا چلا کہ ان کی وفات کو ایک سال ہو گیا ہے۔ یادوں کی پریاں ایک ایک کر کے سختی رواں سے اُترنے لگیں اور تیس سال پہلے کی ایک تصویر سامنے آگئی۔ اب تو کراچی کچھ سے کچھ ہو گیا ہے۔ وہ جگہ جہاں آج شیرٹن ہوٹل نظر آتا ہے، وہاں پہلے پتھر کی بنی ہوئی اونچے گنبد والی ایک شاندار عمارت تھی جس کے وسیع و عریض مرغزار جون جولا کی تپتی ہوئی سرسبز میں قلب و نظر کو ٹھنڈک بہم پہنچاتے تھے۔ یہ پبلیس ہوٹل کی عمارت تھی۔ ہم چند ادیب گاہے ملے آدھری جاناٹکے اور راہ داری میں چڑی ہوئی مکرسیوں پر ایک وجیبہ انسان کو اکثر وہاں دیکھتے جس کے ارد گرد چند دوست احباب بیٹھے ہوتے اور وہ بلند آواز میں گفتگو کر رہے ہوتے۔ ایک دن تعلد ہو تو معلوم ہوا کہ یہ میر علی احمد خان تالپور صاحب ہی جو کچھ عرصے پہلے تک حکومت مغربی پاکستان کے وزیر بائدیر تھے۔ فراخ دل، فراخ پیشانی، روشن آنکھوں میں ذہانت و دانائی کی چمک، طویل قامت، چہرے سے شرافت و تدبیر نمایاں منتقل مزاج، اور باسلیقہ، خوش لباس، خوش مزاج۔ بات کرتے تو جوہر نکلتے۔ اردو فارسی کے بر محل اشعار

ایس بے ساختگی سے پڑھنے لگے کہ گفتگو میں نکھارا جاتا اور بات سیدھی دل میں اتر جاتی۔ ان کی سادگی، وسیع المشرتی، وطن کی محبت، وسیع مطالعہ، نئی نئی کتابوں کی باتیں۔ مضامین تو کئے انبار لگ جاتے۔ مسائل حاضرہ پر ایسے گفتگو کرنے کے سننے والے کا ذہن روشن ہو جاتا۔ ساری گفتگو مصلحت سے پاک اور بے لگ ہوتی۔ کوئی اختلاف کرتا تو وجہ سے سنتے اور پھر اس کا جواب دیتے۔ بعض دفعہ تو اسی عمل میں گفتگوں گزرد جاتے۔ اب ایسے لوگ کم ہو گئے ہیں جو مسائل کو خور و فکر اور تبادُل خیال سے صاف کریں اور نہ صرف اپنا بلکہ دوسروں کا ذہن بھی نکھار دیں۔ میں نے ایسے لوگ کم دیکھے ہیں جن کا مطالعہ امتداد وسیع ہو جتنا میر علی احمد تالیف و تصانیف کا تھا۔ کتاب پڑھنے اور کتاب جمع کرنے کا شوق ایسا تھا کہ آج بھی ان کا کتب خانہ دیکھنے اور دکھانے کی چیز ہے۔ ایک دن گیارہ بجے پیر حسام الدین راشدی مرحوم اور میں دونوں ان کے گھر گئے۔ میر صاحب نے اندر ہی بلا لیا۔ بستر پر ڈھیر ساری کتابیں رکھی تھیں اور میر صاحب کمرٹ سے لیٹے ہوئے کتاب پڑھ کر دنیا کی سیر کر رہے تھے۔ دنیا کی سیر میر کی صحبت میں ہو گئی۔ میں جب بھی ملا انھیں کتابوں کے اندر دیکھا۔ میر صاحب نے جو کچھ علم حاصل کیا اپنے ذوق اور مطالعہ سے کیا۔ انھیں فارسی، اردو، انگریزی اور سندھی پر دسترس حاصل تھی۔ کثرت مطالعہ نے ان کے ذہن کو روشن اور دل کو فراخ کر دیا تھا اسی لیے وہ دوسرے سیاست دانوں سے بالکل مختلف تھے۔ رسا زشوں اور جوڑ توڑ سے پاک۔

ایک خاص بات میر صاحب میں یہ تھی کہ وہ کچھ کتابوں کے ذمے تھے۔ جب آدمی اقتدار میں ہوتا ہے تو اس کے حوالی مالی اپنی پسند و ناپسند اور ضرورت و مصلحت کے مطابق صاحب اختیار کے کان بھرتے رہتے ہیں اور اس طرح اصل حقائق کو اس سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ جناب میر علی احمد تالیف و تصانیف کے اندر ان لوگوں کو پہچاننا بہت ضروری ہوتا ہے تاکہ حقائق اور سچائیاں نظروں سے پوشیدہ نہ ہوں۔ میر صاحب سیاست دان ہوتے ہوئے بھی اسی لیے صاف گو اور بے پاک انسان تھے۔ ۱۹۷۰ء میں انھوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ سندھ میں پی پی پی کی مقبولیت میں ان کا بڑا

ہاتھ تھا لیکن جب یہ جماعت برسرِ اقتدار آئی تو میر صاحب دو چار سال کے بعد ہی اس سے الگ ہو گئے۔ میر صاحب قومی اسمبلی کے ان چار اراکین میں سے ایک تھے جنہوں نے ۱۹۷۳ء کے آئین پر اصول کی بنیاد پر دستخط نہیں کیے اور جب پانی سر سے گزرے گا تو پاکستان قومی اتحاد میں سرگرم عمل ہو کر ایسی تحریک چلائی جو کچھ ہی عرصے میں کامیابی سے ہم کنار ہو گئی۔

میر صاحب کی بڑی عظمت شخصیت کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ متحمل مزاج تھے اور ان کے مزاج کا نمایاں وصف یہ تھا کہ وہ دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سنت ہے کہ جس پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔ اس سے معاشرہ سدھرتا ہے اور انسانیت جہنم لیتی ہے۔ میں نے میر صاحب کو ہمیشہ ہی کرتے دیکھا۔ غریبوں کے ہمدرد، کمزوروں کے حامی، دکھ درد میں سب کے شریک، اشتراک و انسانیت کے پیکر، اصولوں پر سبک خوار، لیکن محبت و اخلاص میں — رشہم کی طرح نرم —۔ میر صاحب یقیناً جنتی تھے۔

میر صاحب سے میری آخری ملاقات دسمبر ۱۹۸۶ء میں ہوئی۔ وہ لندن چلنے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہٹاش بٹاش تھے۔ حسبِ معمول حکمت و دانش کی، علم و ادب کی مسکرت و تدبر کی اور نئی کتابوں کی باتیں کرتے رہے۔

میں نے میر صاحب کو کبھی ملاؤس نہیں دیکھا۔ اس شام انہوں نے بہت دلچسپ باتیں کیں۔ اپنے بچپن کی باتیں کرتے رہے۔ پاکستان بننے سے پہلے اور بعد کے واقعات بیان کرتے رہے۔ مختلف نامور شخصیات کے بارے میں پُر لطف قصے سناتے رہے۔ میں نے کہا میر صاحب! اگر آپ اپنی خود نوشت لکھ دیں تو گزشتہ تین چوتھائی صدی کی تہذیبی، علمی، سیاسی اور معاشرتی تاریخ محفوظ ہو جائے گی۔ میر صاحب نے آمادگی کا اظہار کیا۔ میں نے کہا اکل میں آپ کو دو عمدہ قسم کے رجسٹر بھیجوں گا۔ آپ روز ناشتے کے بعد کسی کو بلا کر لکھا دیجیے۔ چند ماہ میں یہ سب باتیں محفوظ ہو جائیں گی۔ دوسرے دن میں نے رجسٹر بھیج دیئے۔ ایک ہفتے بعد فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ لندن چلے گئے ہیں اور

پھر تین مہینے بعد جب ان کا جسدِ خاکی واپس آیا تو میر صاحب وہاں جا چکے تھے جہاں سے
جا کر کوئی واپس نہیں آتا

قابلِ سیر نہیں بس کہ جہانِ گُذراں

جو گویاں سے کبھی اس نے نہ پھر کر دیکھا

(مصحف)

میر صاحب جیسی شخصیتیں روز بروز پیدا نہیں ہوتیں۔ ہمیں ان کی یاد نگار
قائم کرنی چاہیے۔ ان کے خاندانی لواذرا کتابیں اور سب اشیاء کو محفوظ کر کے ان کے
نام پر بنائے ہوئے ادارہ میں محفوظ کر دینی چاہئیں تاکہ حدائقِ جاریہ کا ثواب ہم بھی حاصل
کر سکیں۔ اپنے قومی محسنوں کو یاد کرنے اور رکھنے کا یہی سب سے اچھا طریقہ ہے۔

(۷ اپریل ۱۹۶۸ء)

صادقین کے بارے میں

۱۰ فروری ۱۹۸۷ء منگل کے دن صبح ہی صبح سید صادقین احمد نقوی جنہیں دنیا زمانہ صادقین کے نام سے جانتا تھا، اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آنا اللہ وانا الیہ راجعون۔ مرنا ایک فطری عمل ہے اور موت زندگی کی سب سے بڑی سفاک حقیقت ہے لیکن صادقین کی وفات کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ دنیائے فن سے ایک ایسا فن کار رخصت ہو گیا تھا جو نہ صرف ممتاز و منفرد بلکہ بے بدل تھا۔ ایسے جو کبھی کبھار پیدا ہوتے ہیں۔ اخبارات چھپ چکے تھے لیکن صادقین کی وفات کی خبر آگ کی طرح آٹا ٹاٹا میں پھیل گئی اور نماز جنازہ میں کم و بیش ہر وہ شخص شامل تھا جو صادقین کو جانتا یا اس کے فن سے آشنا تھا۔ تیر کا یہ شعر بار بار میرے ذہن کے دریچے سے جھانک رہا تھا :

کن فیندوں اب تو سوتی ہے لے چشم گرے ناک

مڑنگاں تو کھول مشہر کو سیلاب لے گیا

صادقین میرے دوست تھے۔ ایسے دوست کہ جو ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور دلوں میں محبت کی خوشبو میں بسائے جب بھی ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ان کا وجود محبت و خلوص کی ادھی خوشبو سے ہبکا اٹھتا ہے اور ملنے والے ایسے تازہ دم ہو جاتے ہیں جیسے ابی ہلی غسل کیا ہو مجھے یاد ہے کہ صادقین کے بڑی پہلی ملاقات غالباً ۱۹۵۵-۵۶ء میں اسپین کے ساجی سیلار و شہید سہروردی کے بڑے بھائی 'مرحوم شاہد سہروردی' کے کمرے میں جہانگیر مدثر پرواق ایک کوٹلی کی ذیل داری میں ہوئی تھی۔ اسی سال کی عمر دہلا پتلا جسم، مسلسل کاٹھا ہوا کرتا، چوڑے پانچوں کا پانچامہ، آنکھوں پر عینک، استخوان ناک، چھوٹی چھوٹی

سیکڑواں مونچھیں، ڈاڑھی صاف نکلتا ہو، گندمی رنگ، آواز میں کراہا پن، قیل سے چپکنے ہوئے سیاہ بال، موزوں قد۔ شاہ سہروردی صاحب نے جو ادب اور آرٹ کے عالم، انگریزی کے شاعر، تہذیب و شائستگی کا نمونہ تھے، میرا تعارف کرایا اس زمانے میں ان کے فن کی شہرت تیزی سے پھیل رہی تھی اور وہ ایک ہونہار مصور کی حیثیت سے فن کے افق پر نمودار ہو رہے تھے۔ کچھ دیر تک رک کر باتیں ہوئیں اور پھر وہ چلے گئے۔ کوئی دو ہفتے بعد ایک دن میرے پاس دفتر آئے اور کوئی ڈھائی تین گھنٹے بیٹھے رہے۔ پھر اگلے جانے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ میرے اور ان کے درمیان خلوص و محبت کی جو شمع روشن ہوئی تھی وہ مرنے دم تک باقی رہی۔ کراچی آتے تو ایک ہارٹیل فون مژدہ کرتے۔ ایک دن ملاقات ہوئی۔ دل چسپ باتیں ہوئیں۔ کہنے لگے جوش صاحب میری نمائش میں آئے تھے۔ میں نے پوچھا حضرت کیسی رہی۔ کہنے لگے جی بھئی میں نہیں آئی۔ فقیر نے کہا جوش صاحب! جب میں دس برس کا تھا تو آپ کی شاعری بھی میری بھئی میں نہیں آتی تھی۔ صادقین نہایت ذہین انسان تھے۔ خوب صدمت آپ کر رہے تھے۔ ایسی دلدرا باتیں کہ ذرا سی دیر میں مرکز تو جہنم جانتے تھے۔ ۶۹۶۲ میں وہ پیرس میں تھے۔ میں بھی اُس زمانے میں کوئی دو مہینے پیرس میں رہا۔ روز ملاقات ہوئی، ٹیڑھی ٹڈی کیلے میں ہم گھنٹوں بیٹھے رہے۔ دوپہر کو کھانا عام طور پر ساتھ کھاتے۔ دنیا زمانے کی باتیں ہوتیں۔ ابھی بھی بُری بھی۔ کاغذ اور پینسل، قلم ان کے ساتھ ہوتے کسی کا چہرہ پسند آیا۔ ذرا کا دیر میں اس کی تصویر بنا ڈالی۔ اکثر یہ ہوا کہ وہ جس کی تصویر بن رہی ہوتی خود اُٹھ کر ہماری میز پر آجاتا اور اس کیچ دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا۔ دس بارہ دفعہ ایسا ہوا کہ وہ خاک لے جاتا تو سوچا اس ڈالر زبردستی صادقین کے سامنے رکھ جاتا۔ صادقین منع کرتے مگر یورپ و امریکا کا یہی دستور ہے۔ ہماری طرح نہیں کہ فن کار ساری عمر بھوکا مارتا رہتا ہے اور فن کے پرستار، زرداری کے باوجود تصویر پر مفت حاصل کرنے کی سبیل نکال لیتے اور اسی بیماری میں مبتلا رہتے ہیں۔ پیرس میں میں نے صادقین کو پہلی بار کسی مالی بحران میں مبتلا نہیں دیکھا۔ صادقین کے مزاج میں ایک درویشی تھی۔ ایسی درویشی جو مرنے کا اور ادیب شاعر میں ہونی چاہیے۔ فن ان کا اور دنیا بھوکا اور ان کی زندگی کی منزل تھا۔ ساری عمر اسی میں لگا دی۔

دشاوی بیاہ کے جھنجھٹ میں پڑے اور نہ گھر بار کے بکھرے ٹھوں میں اُلجھے۔ اچھی کامیاب زندگی گذاری اور زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق بسر کیا۔ اور اس طور بسر کیا کہ کوئی نذر دار صاحب ثروت ایسی بھرپور دلچسپ اور بامعنی زندگی کیا بسر کرتا۔ وہ ہر دم فن کی دنیا میں رہتے تھے اور ہر لمحہ فن کی خوشبوؤں میں بسی دلہن کے ساتھ ریاض کرتے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنا کام صادقین نے کیا نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا میں بہت کم معاصر فن کاروں نے اتنا کام کیا ہے۔ اُنھیں محنت کے بغیر فن کی دنیا آباد ہو سکتی ہے اور نہ خورن جگر کی نمود ہو سکتی ہے۔ صادقین نے اس نکتے کو سمجھ لیا تھا۔ عوام، مظلوم عوام، انسان کی عظمت و رفعت اور حیرت و استحصال سے بغاوت ان کی مصوری کے عام موضوعات تھے۔ ان کا ایک کمال یہ تھا کہ انھوں نے خطاطی کے ذریعے فن کو خواص و عوام تک پہنچا دیا۔ اسی لیے پاکستان کا کوئی دوسرا فن کار ایسا نہیں ہے جسے خواص و عوام دونوں اس طور پر جانتے پہچانتے اور چاہتے ہوں۔ اس وقت موقع نہیں ہے کہ میں تفصیل سے صادقین یا ان کے فن کے بارے میں کچھ بات کروں۔ یادوں کا ایک سیلاب ہے جو اُمڈ آتا ہے۔ اس وقت تو میں میرے اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

وے لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے

پیدا کیے تھے چرٹ نے جو خاک چھان کر

محمد نقوش کے بارے میں

ہنسل کا نوجوان خواب دیکھتا ہے اور ان خوابوں کی تعبیر سے وہ اپنے راستے اور اپنی منزلیں مقرر کرتا ہے۔ میری نسل کا نوجوان جب خواب دیکھتا تھا تو اس میں بڑا مصنف، بڑا شاعر، بڑا صحافی، بڑا مؤجد یا معلم حاصل کر کے بڑا آدمی بننے کی خواہش مضمر ہوتی تھی اور وہ نوجوان خود کو اپنے خواب کی تعبیر کے لیے وقف کر دیتا تھا۔ یہ وہ خواب تھے جن سے معاشرے میں بڑے آدمی پیدا ہوتے تھے اور معاشرہ ہر دم سرسبز و شاداب رہتا تھا۔ آج کا نوجوان بھی بڑا آدمی بننے کے خواب دیکھتا ہے لیکن ان خوابوں میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کی آرزو شامل ہوتی ہے۔ آسائش سے معذور زندگی، اور دولت کی ریل پیل، یہی آج بڑے آدمی کی پہچان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں آسائش سے معذور بڑے گھروں اور کاروں کی تو کثرت ہے لیکن بڑے آدمیوں کا کال پڑ گیا ہے۔ محمد طفیل مرحوم نے بھی 'اپنے نسل کے خوابوں کے عین مطابق' بڑا مدبر اور بڑا ناشر بننے کا خواب دیکھا اور ساری عمر اسی خواب کی تعبیر میں لگا دی اور پھر یہ ہوا کہ محمد طفیل کو سارے دنیا زمانے نے اپنے دور کا سب سے بڑا مدیر تسلیم کر لیا۔ یہی ان کا کارنامہ ہے اور اسی کارنامے سے ان کا نام نہ صرف آج روشن ہے بلکہ آنے والے زمانوں میں بھی روشن رہے گا۔

محمد طفیل کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ نوجوان تھے۔ سیدھے سادے، خاموش طبع، کم آواز لیکن مفلسانہ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے غم گسار، مولانا اسحاق علی تھانی کی نظم 'پن پانی' کی طرح دن رات کام میں لگے رہنے والے۔ دُھن کے پورے۔

کلام کے کچے، نقوش کے مرشد بھی اور نقوش کے مرید بھی۔ یہی کام تھا۔ یہی مقصد حیات تھا۔ کثرتِ ذکر سے دھڑوں ایک ہو کر ایک دوسرے میں گم ہو گئے۔ محمد طفیل کا ذکر کیجیے تو وہ محمد نقوش کا ذکر ہو گا، محمد نقوش کا ذکر کیجیے تو وہ محمد طفیل کا ذکر ہو گا۔ تاکس نہ گوید بعد ازین من دیگر م تو دیگری۔ اسی لیے دونوں اسی طرح لازم و ملزوم ہیں جس طرح میاں بشیر احمد اور بہادری مولانا صلاح الدین احمد اور ادبی دنیا، نیا ذوق پوری اور نگار شاہ احمد دہلوی اور لکئی حکیم یوسف اور نیرنگ خیال، یہ ادبی جوائید کا عظیم دور تھا اور محمد طفیل اور نقوش اسی روایات کی آخری کڑی تھے۔

”نقوش نے کسی نگری یا ادبی تحریک کو جنم نہیں دیا لیکن اردو ادب کے بہترین شہ پاروں کو گھر گھر پہنچا کر فروغِ ادب کی عظیم خدمت انجام دی اس میں معاصر ادب بھی شامل ہے اور کلاسیکی ادب بھی۔ نقوش کی مقبولیت کا راز یہ تھا کہ محمد طفیل اسے معیاری مواد سے مزین کر کے حسنِ ترتیب اور ذوقِ جمال کے ساتھ اس طرح پیش کرتے کہ جو پڑھتا داد دیتا اور پھر سنبھال کر محفوظ کر لیتا۔ اسی لیے نقوش وہ واحد رسالہ تھا جو پڑھا بھی جاتا تھا اور سینٹ کر، سنبھال کر رکھا بھی جاتا تھا۔ نقوش کی شہرت کا راز یہ بھی تھا کہ محمد طفیل نے ایسے معیاری اور بلند پایہ خاص نمبر شائع کیے کہ جو مواد کے اعتبار سے منفرد اور حسنِ ترتیب کے اعتبار سے بے مثل تھے اور جن کی مجموعی تعداد محدود ہے۔ محمد طفیل معیاری ادب کا اتنا بڑا انکلاص تھا کہ اب بھر کر پیش کرنے کا قارئینِ ادب کے ذوق کی پوری طرح آسودگی ہو جاتی۔ غزل نمبر، شخصیات نمبر، مثنوی نمبر، مکاتیب نمبر، شوکت کھاناوی نمبر، آپ بیتی نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر، میر نمبر اور آخو میں رسول نمبر وہ خاص شمارے ہیں جو اب ہماری ادبی تاریخ کا حصہ ہیں اور جن کا ڈنکا سارے بر عظیم میں بج رہا ہے۔

محمد طفیل مرحوم نے نقوش میں بلند پایہ تحقیقی مقالات شائع کر کے جدید اور قدیم کی حد فاصل کو پاٹ دیا۔ اس سے ایک طرف جدید تحقیقات کی روشنی نے علمِ ادب کے حلقوں کو متوجہ کیا اور دوسری طرف خود نقوش نئی تحقیق کا حوالہ بن گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ حوالے پھیلتے اور بڑھتے جاتے گئے اور انہیں حوالوں کے تعلق سے نقوش کی اہمیت بھی قائم و دائم رہے گی۔ نقوش اور دوسرے علمی و ادبی رسالوں میں یہ بنیادی

فرق ہے اور اسی لیے نقوش نئے اور پرانے دونوں حلقوں میں یکساں مقبول تھا اور مقبول رہے گا۔

محمد طفیل کی شخصیت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ کم گو تھے۔ یہ خصوصیت اس نسل کے دور کے ادیبوں کی ایک عام مشترک خصوصیت تھی۔ اس دور کے ادیب کم بولتے اور زیادہ لکھتے تھے۔ آج کے دور کے ادیب کی مشترک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام طور پر زیادہ بولتے اور کم لکھتے ہیں۔ زیادہ بولنے میں فائدہ یہ ہے کہ ہاتھ کے ہاتھ رنگ چوکھا آتا ہے اور کم بولنے اور زیادہ لکھنے میں نقصان یہ ہے کہ فائدے کا پتا بہت دیر میں چلتا ہے۔ محمد طفیل کے نفع نقصان کا پتا بھی اسی لیے دیر سے چلا اور اسی لیے وہ مرنے کے بعد آج بھی زندہ ہیں۔

محمد طفیل کے نام کام اور شخصیت کے ساتھ مثنوی مولانا جامی کی وہ حکایت مجنوں یاد آتی ہے جس میں ایک صحرانورد نے مجنوں کو تنہا بیٹھے اور اپنی انگلیوں کے قلم سے "ریت پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھا" صحرانورد نے مجنوں سے پوچھا کہ یہ خط کس کے نام لکھ رہے ہو بھی تیزا ہوا کا ایک جھوٹکا آئے گا اور سب کچھ مٹا کر رکھ دے گا۔ مجنوں نے جواب دیا :

گفت شرح حسن بیلے می دہم
خاطر خود را تسلی می دہم
تا چشم دیدم جرعت از حباب او
عشق بازی می کنم با نام او

یہی سچے عاشق کی پہچان ہے اور محمد طفیل، خدا انھیں کر دے کہ وہ چین دے، ایک ایسے ہی عاشق تھے جو ساری عمر اپنے خوابوں کو حقیقت

میں بدلنے کے لیے ادب سے عشق بازی کرتے رہے۔ ان کے کام کی خوشبو آج بھی
چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور ہمارے مشامِ جاں کو معطر کیے ہوئے ہے شاید
جرات نے یہ شعر ایسے ہی عاشقوں کے لیے کہا تھا :

جو مرہق تھا پڑا جاں بلبِ خبر اور کچھ نہیں اس کی اب
مگر اتنا کہتے ہیں لوگ سب کہ بڑا یہ نیک خصال تھا

(۶ جولائی ۱۹۸۷ء)

مولانا مہر القادری

انسان فانی ہے اور اسے ایک نہ ایک دن اس کو دنیا سے رخصت ہونا ہے لیکن اس کے کام اور اس کے کارنامے برسوں بلکہ صدیوں تک زندہ رہا کرتے ہیں۔ گویا تخلیق کم فانی یا لافانی ہوتی ہے اور یہی وہ حقیقی معیار ہے جس پر ہمیں کسی شخص کی بڑائی کو پرکھنا چاہیے۔ اس دور میں جب علم و ادب اور فن و ہنر بے وقت ہو کر رہ گئے ہیں اور انسان کی بڑائی صرف روپے کی ریل پیل سے ناپی جاتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ علم و ادب و فن معاشرتی اقدار کے عدم توازن کا شکار ہو کر پس پشت چلے گئے ہیں اور بہت کم لوگ ایسے رہ گئے ہیں جو اپنی زندگی کا مقصد علم و ادب کو قرار دیتے ہیں۔ اسی منفی رجحان کی وجہ سے ادب و فن کے نام پر اب وہ کام سامنے آ رہے ہیں جن کا مقصد تخلیق کے بجائے صرف حصولِ زر ہے۔ اگرچہ پورا معاشرہ حسیبِ زر کی شدید بیماری میں مبتلا ہے اور یہ بیماری اب کم و بیش ہر طبقے میں پھیل گئی ہے۔ آج کے اس معیار سے دیکھیے تو مولانا مہر القادری صاحبِ زہ نہیں تھے اور اس لیے بڑے آدمی بھی نہیں تھے لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ اس کے باوجود ہم ان کی یاد منانے کے لیے یہی نادر منعقد کر رہے ہیں۔ یہی نادر تو بڑے لوگوں کے لیے منعقد کیا جاتا ہے؟ اس سبب نادر کے انعقاد سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ معاشرے میں ایک طبقہ آج بھی ایسا موجود ہے جو ذہن پرستی کے رجحان کو معیارِ زندگی تسلیم نہیں کرتا بلکہ تخلیقِ فن کو عظمت کی کسوٹی سمجھتا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جس کی وجہ سے علم و ادب ابھی باقی و زندہ ہیں۔

علم اخلاق کے جو ہر کو جلا دیتا ہے اور جہل کے پردے کو اٹھا دیتا ہے۔ اسی سے

عظمت انسان متعین ہوتی ہے۔ مولانا ماہر القادری اسی لیے بڑے کوئی تھے۔ انھوں نے ساری عمر علم و ادب کی خدمت میں گزاری اور اپنی ساری صلاحیتوں کو جہل کے پردے اٹھانے اور اخلاق کے جوہر کو جلا دینے پر صرف کر دیا۔ ان کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی مہربانی کے ساتھ سچائی کا اظہار تھی۔ وہ جس بات کو حق کہتے پر ملا اس کا اظہار کرتے۔ اسی وجہ سے وہ ہر محفل میں اکثر بحثوں میں اُچھے نظر آتے۔ مولانا سے میری ملاقات کراچی میں ہوئی تھی اور شعر و ادب کی محفلوں میں اکثر ہوتی رہی۔ جب ملتے محبت و غلو سے ملتے اور ہمیشہ فرماتے: ”اب کون سی کتاب پر کام ہو رہا ہے؟“ ”فاران“ ”پابندی سے مجھے بھولتے“ ”کبھی دسویں کبھی ڈاک سے۔ خط لکھنے میں بڑے ماہر تھے۔ پابندی سے جواب دیتے۔ ایک دفعہ کسی محفل میں زبان کے سلسلے پر مجھ سے اُلجھ پڑے۔ میں نے عرض کیا کہ جب بات بڑے چلتے تو ضروری ہے کہ مستند کتابوں سے رجوع کیا جائے تاکہ بات صاف ہو جائے۔ کہنے لگے کہ ہاں یہ بات آپ نے ٹھیک کہی۔ میں نے گھر آکر لغات دیکھیں اور اتفاق سے میری بات درست نکلی۔ مولانا کا دوسرے دن فون آیا۔ کہنے لگے کہ لغات میں تو وہی لکھا ہے جو آپ کہہ رہے تھے لیکن بات اس کے علاوہ بھی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہیں زبان کے نکات و رموز پر اتنی قدرت حاصل ہو۔ زبان کے سلسلے میں سینکڑوں صفحات پر پہلی ہوئی ان کی تحریریں آج بھی مختلف رسائل و جرائد میں بکھری ہوئی ہیں جنہیں دیکھا و مرتب کرنے کی فوری ضرورت ہے۔ ”آر و لغت“ کے سلسلے میں جس جانفشانی و محنت سے زبان و معنی کے نکات کو بغیر کسی معاذ سے کے بیان کیا اس کی داد ہمیشہ دی جائے گی۔

مولانا کی فکر و شخصیت کی کئی جہتیں تھیں۔ وہ شاعر تھے اور اپنے دور کے نامور شاعر تھے جن کا کلام نہ صرف ہر اچھے رسالے میں شائع ہوتا تھا بلکہ کوئی بڑا مشاعرہ ان کے بغیر بڑا ہونے سے کچھ کم رہ جاتا تھا۔ وہ جان مشاعرہ بھی تھے اور جان محفل بھی۔ اپنے فقیروں و طیفیوں اور دلچسپ انداز سے محفل کو زعفران دار بنائے رہتے تھے جیسی محفل ہوتی جیسی ہی غزل یا اشعار پڑھتے۔ ان کے خریطہ کلام میں ہر قسم کا مائل تھا جسے وہ چپ

طلب تقسیم کرتے رہتے۔ ان کی شخصیت کی دوسری جہت یہ تھی کہ وہ ایک ممتاز ماہر زبان تھے۔ الفاظ و محاورات کے معنی و مفہوم کے لطیف و ہاریک پردوں کو وہ جس طرح اُٹھاتے تھے بہت کم لوگوں کو یہ سلیقہ و شعور حاصل ہے۔ تیسری جہت یہ تھی کہ وہ ایک باسلیقہ مدیر تھے۔ ۱۹۳۹ء سے وفات (مئی ۱۹۷۸ء) تک وہ باقاعدگی سے فاران نکالتے رہے جو ان کی وفات کے بعد اب بھی مولانا اسماعیل احمد مینائی کی زیر ادارت شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالے نے دو قابل ذکر کام کیے۔ ایک یہ کہ صحت زبان کے مسئلے کا اپنے پڑھنے والوں میں شعور پیدا کیا۔ دوسرے ادب و اخلاق کے رشتے کو گہرا اور استوار کیا۔ مولانا ماہر کا مقصد ادب یہ تھا کہ ادب اخلاق کے جوہر کو چلا دیتا اور پاکیزگی، فکر و خیال کو پروان چڑھاتا ہے۔ دین ان کی سیاست تھی اور یہی وجہ ہے کہ فکری سطح پر وہ مولانا مودودی مرحوم سے بہت متاثر تھے۔ اسی انداز نظر سے فاران کا مزاج بنا تھا۔

مولانا ماہر القادری عاشق رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھے۔ اس کا اظہار کثرت سے اور بار بار ان کی شاعری میں ہوا ہے۔ ان کی فطرت ہم عام طور پر محفل میلاد میں آج بھی سنتے ہیں اور اس طرح سنتے ہیں کہ ہمارے دلوں کی تاریکی نور کی حرارت سے دور ہو کر آنسوؤں کی صورت میں بہہ جاتی ہے۔ ان کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی ان کا اخلاص تھا۔ وہ ایک سمجھدار مخلص انسان تھے۔ ایک خلوص نے شعور ہوتا ہے اور ایک خلوص ہاشعور ہوتا ہے۔ بے شعور خلوص ہادش کے پانی کی طرح ناپید ہو جاتا ہے اور ہاشعور ہوتا ہے۔ بے شعور خلوص انسان و انسانیت کو فائدہ پہنچاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مولانا ماہر القادری نے انسان و انسانیت کی قدروں کو اس دور زرہستی میں بھی پروان چڑھایا۔ مولانا کے دو شعر ہیں :

خوف ہو یا لالچ ہو پیارے! موت ہے یہ فن کا عدد کی
دیس کی دھن میں گھانے والو! یہ دھن تو درباری ہے
اہل قلم کا یک جانا ہے علم و ادب کی رسوائی
سچی بات کہے گا کیا وہ جس کی زباں سرکاری ہے

یہی وہ اخلاص ہے جس نے ان کے قلم ان کی زبان میں بے باکی اظہار کی نوک کو خیز کر دیا تھا اور یہی وہ اخلاص تھا جس کی گرجی سے سننے والوں کے دل پگھل کر آب ہو جاتے تھے۔

کسی بہت کم لوگوں کو یہ بات شاید یاد ہے کہ مولانا مہر القادری افسانہ نگار اور ناول نگار بھی تھے اور ان کے کئی ناول اور افسانوں کے مجموعے شائع ہو کر عام ہوئے تھے۔ انگریزی (۱۹۳۶ء)، فلسفہ حیات (۱۹۳۷ء)، محبت بھرے خطوط (۱۹۴۱ء)

حسن و شباب (۱۹۴۵ء)، پیلے (۱۹۴۶ء)، بیگنے (۱۹۵۳ء) ان کے افسانوں کے چند مطبوعہ مجموعے ہیں۔ جب میں جون ہٹی (۱۹۵۲ء) کردار (۱۹۴۲ء) اور کائناتی ہاؤس (۱۹۴۸ء) ان کے تین ناول ہیں۔ فکشن کی یہ سب کتابیں خالص رومانوی انداز کی ہیں۔

کاروانی حجاز ان کا ایک سفر نامہ ہے۔

مولانا مہر القادری کی شاعری کے بھی کئی مجموعے شائع ہوئے جن میں ظہورِ فکر

(۱۹۳۶ء)، نعتیہ کلام، محسوسات، ماہر (۱۹۴۱ء)، انغمات، ماہر (۱۹۴۳ء)، جذبات، ماہر (۱۹۴۳ء)، ذکرِ جمیل (۱۹۴۴ء)، فردوس (۱۹۵۵ء) شامل ہیں۔ ابھی

ان کا بہت سا کلام ایسا ہے جو کتابی صورت میں شائع کیا جانا چاہیے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک طویل مثنوی انھوں نے کراچی کو موضوع بنا کر لکھی تھی اور اس کی ایک نقل مجھے بھی نیا دور میں اشاعت کے لیے بھیجی تھی۔ آج ان کی شاعری کے مجموعے عام طور پر نہیں ملتے۔ بہتر یہ ہے کہ ”کلیات، ماہر القادری“ کے نام سے ان کے سارے کلام کو یکجا کر کے زمانے کی گود میں ڈال دیا جائے۔ یہ کام مداحانِ ماہر کو فوراً کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ان کی نثری تحریروں، بالخصوص ان مضامین کو جو زبان کے تعلق سے لکھے گئے ہیں،

جمع کر کے شائع کرنا چاہیے۔ مرحوم ابداد و شعر کے بارے میں جو تحریروں انھوں نے فاران میں لکھیں، وہ تو کتابی صورت میں کچھ عرصہ پہلے شائع ہو گئی ہیں۔ اب ان کی دوسری تحریروں کی طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

مولانا مہر القادری ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ کراچی کی ادبی محفلیں سوتلی ہو گئی ہیں۔ مشاعرے اب بے رونق ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان محفلوں کو دوبارہ آباد کرنے

کے لیے ضروری ہے کہ ہم مولانا ماماہر کے مدرسہ فکر کو آباد کریں اس کی ترویج و اشاعت کریں اور ادب و فن کی تخلیق کی اہمیت کو دوبارہ اپنے معاشرے میں قائم کریں۔ تخلیق ہی سے معاشرے کو پالتے اور زندہ رہتے ہیں ورنہ جنگل بن کر دشت و صحرا میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

(۱۶ جولائی ۱۹۸۶ء)

ابراہیم جلیس

تاریخ اور دن تو یاد نہیں البتہ اتنا یاد ہے کہ ۱۵۵۰ء کا موسم گرم تھا جب ابراہیم جلیس سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ کسی اخبار میں کام کرتے تھے۔ اور بہادر مار جنگ ہائی اسکول میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا ڈرامہ "دلی کی آخری شمع" دیکھنے آئے تھے۔ نظر حید آبادی مرحوم نے قعات کرایا کر یہ ابراہیم جلیس ہیں مشہور افسانہ نگار۔ بہشتی کر ابراہیم جلیس نے قہقہہ لگایا۔ یہی قہقہہ آج بھی میرے کان میں گونج رہا ہے۔ منہس مکہ شاداب چہرہ، لمبا قد، گھنے سیاہ بال، بھرا بھرا جسم، روشن آنکھیں، چہرے پر خلوص کی نرمی جو آنکھوں کی چمک میں بھی شامل تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں ہم ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو گئے کہ شاید برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ میں اس وقت ان کی دو کتابیں "چالیس کروڑ بھکاری" اور "چور بازار" پڑھ چکا تھا اور ان کے متعدد افسانوں سے لطف اندوز ہو چکا تھا۔ ابراہیم جلیس نہ صرف موہنی شخصیت کے مالک تھے بلکہ ان کا قلم بھی موہنی قلم تھا۔ ان کی تحریر دلوں میں اتر جاتی تھی۔ جو پڑھتا تھا ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ان کی تحریریں ان تحریروں پر مشتمل ہوتی تھیں جو براہ راست زندگی سے حاصل کیے گئے تھے۔ ان کا دل دردمند عوام کے دل کے ساتھ دھڑکتا تھا اسی لیے اس میں وہ روبرو معاشرہ شامل تھی جو تحریروں کو پڑا اثر بنادیتی ہے۔

پاکستان آکر، اس دور کے ہر نوجوان کی طرح، انھوں نے اپنی صلاحیت اور اپنی محنت سے اپنی زندگی کو بنایا اور وہ شہرت اور عزت حاصل کی جو کم لوگوں کو میسر آتی۔ وہ ساری عمر کسی نہ کسی اخبار سے وابستہ رہے اور اپنی خوش رنگ تحریروں سے قارئین کے ایک وسیع حلقے

کو متاثر کرتے رہے۔ جدید اردو صحافت کی جب بھی تاریخ لکھی جائے گی ابراہیم جلیس کا نام روشن حروف میں لکھا جائے گا۔ انھوں نے اپنے کالم سے تحریر کا ایک نیا مزاج پیدا کیا۔ اپنے پڑھنے والوں میں ایک نیا شعور پیدا کیا۔ معاشرتی مسائل کی طرف ان کی توجہ دلائی اور اس طرح عوام و خواص کے ذہن کو بدلنے اور اسے آگے بڑھانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

ابراہیم جلیس زندہ دل انسان تھے۔ ہر محفل میں سمجھتے تھے اور ہر حلقے میں مقبول تھے۔ چھوڑوں میں چھوٹے اور بڑوں میں بڑے۔ نہایت مہذب اور شائستہ۔ شریف النفس اور وضع دار۔ دوسروں کے کام کئے والے۔ دکھ درد میں شریک ہو کر دوسروں کے غموں میں ہاتھ بٹانے والے۔ اس زمانے میں جن نوجوانوں نے ادب کے افق کو وسیع کیا ان میں نظر ثانی آبا کی خواجہ معین الدین، صمدانی نقوی، عبدالقیوم اور عبدالماجد کے علاوہ ابراہیم جلیس کا نام شامل تھا۔ اب یہ سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور اپنا اپنا وقت پورا کر کے چلے گئے ہیں :

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے

اکثر ہمارے ساتھ کے پیار مر گئے

لیکن ان کے نام، ان کے کام کے ساتھ آج بھی ہمارے لیے شمع نور ہیں۔ ابراہیم جلیس روز بروز پیدا نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ ایسا جاندار و پُر اثر قلم ہر کھنڈے والے کو نہیں دیتے۔ جس صلاحیت اور قوت قلم کا اظہار مرحوم ابراہیم جلیس نے سترہ سال کی عمر میں کیا وہ ۵۵ سال کی عمر تک روز افزوں قوت کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ وقت کے ساتھ تحریر پر افسردہ ہو کر مرجھانے لگتی ہے لیکن ابراہیم جلیس کا قلم آخر وقت تک تو مزید توانا رہا اور اس کا رنگ و اثر ہمیشہ قائم رہا۔ اگر پاکستان کے نامور صحافیوں کی ایک فہرست مرتب کی جائے تو ابراہیم جلیس کا نام فہرست کی لوح پر لکھا جائے گا۔ وہ ساری عمر نامور ادیب اور صف اول کے صحافی کی حیثیت سے مشہور رہے اور یہ اللہ کی دہی ہے جسے بھی

ابراہیم جلیس اب ہم میں نہیں ہیں۔ ان کی وفات کو ۸ سال ہو گئے ہیں۔ آٹھ سال کا عرصہ انسان کی زندگی میں خاصا عرصہ ہوتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کل ہی اس چہان سے گزرتے ہیں۔ اس احساس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تحریروں کا جاذبہ کج بھی ہوتا ہے سرچڑھ کر بول رہا ہے۔ ابراہیم جلیس یقیناً مر گئے ہیں لیکن ابراہیم جلیس آج بھی زندہ ہیں۔ ان کی تحریروں آج بھی اپنی شگفتہ بیانی سے ہمارے دلوں کو موہ رہی ہیں اور آنے والے زمانوں میں بھی شاید اسی طرح متاثر کرتی رہیں گی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی مختلف تحریروں اور کالموں کا ایک سلا انتخاب کر کے اشاعت کیا جائے تاکہ ان کی تحریروں اخباروں کے قبرستان سے زندہ معاشرے کے صاحبان ذوق تک پہنچ سکیں۔ ابراہیم جلیس کی یاد کو تازہ رکھنے، ان کی تحریروں کو نئی نسلوں تک پہنچانے کا سب سے بہتر اور سب سے موثر طریقہ یہی ہے۔

موت برحق ہے۔ وہ سب کو آتی ہے۔ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہی موت ہے۔ اس وقت مجھے حیرت کا یہ شعر یاد آتا ہے :

دنیا میں دیر رہنا ہوتا نہیں کسو کا

یہ تو سرائے فانی اک کارواں مرا ہے

مرنے والوں کی یاد کو زندہ و تازہ رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ان کی تخلیقات کو ان کی تحریروں کو آنے والی نسلوں تک پہنچاتے رہنا چاہیے اور یہی میری آپ سب سے گزارش ہے۔

کامل القادری مرحوم

۲۲ جولائی ۱۹۸۲ء کو کامل القادری اچانک وفات پا گئے اور کہیں تیسرے دن اخباروں کو معلوم ہوا کہ کراچی مشہر کی علمی و ادبی زندگی کو نہان کرنے والا شخص مسات روڈ کے ایک کوارٹر میں پر صول رات مر گیا ہے:

بن جن کو حق پہ عشق کا آزار مر گئے
بکثر ہمارے ساتھ کسے یاد مر گئے

وہ لوگ جو کامل القادری کو جانتے تھے میرے ساتھ اس بات کی گواہی دیں گے کہ وہ ایک بہت مخلص انسان تھے۔ سونے کی طرح کھرے اور کٹنے کی طرح صاف۔ علم و ادب ان کی زندگی تھے اور وہ دن رات اپنی دھن میں لگن اسی کام میں لگے رہتے تھے۔ زبان کے سچے۔ بات کے پختے۔ متعدد کتابوں کے مصنف، شاعر، ادیب، محقق، نقاد، بلوچستان اور اس کی تہذیب کے عاشق، کامل القادری پہلے پاکستانی ادیب و محقق ہیں جنہوں نے بلوچستان کو اپنا موضوع بنایا اور اس کی تہذیب و تاریخ کے بارے میں کئی کتابیں اردو و انگریزی اور بلوچی، بروہی میں لکھیں۔ کامل القادری کے اس کام نے، اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، بلوچستان کی نئی نسل میں ایسا اعتماد پیدا کیا کہ اب وہاں اس موضوع پر کام کرنے والوں کی ایک خاصی تعداد موجود ہے۔ کراچی میں رہتے ہوئے بھی اُن کا دل بلوچستان کی وادیوں اور کہساروں میں بھٹکتا رہتا تھا اور ان کی بے قرار روح ہر وقت وہاں کی تہذیب و تاریخ میں سفر کرتی رہتی تھی۔ بروہی زبان میں ان کی کتاب ”شروخ“ برسوں سے شامل نصاب ہے۔ جس لگن اور دل جمعی کے ساتھ

کامل القادری مرحوم نے بلوچی ادب و تہذیب کی خدمت کی اسے پاک تان کی تہذیبی تاریخ جو کسی ملک کی بنیادی تاریخ ہوتی ہے، فراہم نہیں کر سکتی۔ ۱۹۶۱ء میں ان کا ایک اہم علمی مقالہ ”اردو اور براہوئی“ شائع ہوا تو اس مقالے نے لسانی تحقیق کا ایک نیا دروازہ کھول دیا۔ مہات بلوچستان کے نام سے دو جلدوں میں ان کی کتاب تقریباً دو سال پہلے شائع ہوئی تھی اور اتفاق دیکھیے کہ ۱۹۸۱ء کو کامل القادری اپنی اس کتاب کی تقریب رونمائی میں اسٹیج پر موجود تھے اور محترم میر علی احمد خان تاجپور صاحب آج کی طرح، مہمان گرامی و خصوصی تھے اور یہ خاکسار آج ہی کی طرح اصرار جلسہ تھا اور آج ۲۲ فروری ۱۹۸۳ء کو ہم سب ماشاء اللہ موجود ہیں لیکن کامل القادری اس لیے موجود نہیں ہیں کہ وہ اب ہم سے اتنی دور چلے گئے ہیں کہ واپس بھی نہیں آسکتے۔

پھر نہ گئے جو ہوئے خاک میں جا آسودہ

غائباً زیرِ زمیں تیرے آرام بہت

کامل القادری بڑی خوبوں اور بڑی صلاحیتوں کے انسان تھے۔ میں نے ایسے بہت کم لوگ دیکھے ہیں جو ہوش و شعور کے ساتھ باطل زندگی گزارتے ہیں لیکن یہ عمل ان کی اپنی ذات یا اپنے فائدے کے لیے نہیں بلکہ علم و ادب کی خدمت کے لیے ہوتا ہے جس سے معاشرے کا ذہن روشن اور تہذیبی ترقی کا آفتاب عالم تاب طلوع ہوتا ہے۔ کامل القادری نے اپنی زندگی اپنے لیے نہیں بلکہ قوم و معاشرے کے لیے وقف کر دی تھی۔ ساری عمر وہ یونہی بسر کرتے رہے اور آخر دم تک اسی عمل میں لگے رہے اور جب ۲ جولائی ۱۹۸۳ء کو انھوں نے اچانک وفات پائی تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ زبان کا کوئی ذاتی مسکن تھا اور ان کے پاس پیسہ تھا اور نہ کوئی ایسا وسیلہ جس سے ان کے بعد ان کی بیوی اور ان کے چھ پھوٹے پھوٹے بچے اپنا پیٹ پال سکیں۔ ایسے معاشرے میں جہاں کوئی کسی کا پڑ سالن حال نہیں ہے۔ زندگی کی بنیادی ضروریات کو چھوڑ کر علم و ادب کی خدمت کرنا بظاہر کوئی عقل مندی کی بات معلوم نہیں ہوتی لیکن کامل القادری جیسے لوگوں کی دیوانگی ہی نے اس دنیا دار اسلامی معاشرے کو زندہ رکھا ہے اور اسے نور و روشنی عطا

کی ہے۔ یہ بات دنیا دار معاشرے کی سمجھ میں نہیں آسکتی اور آتی بھی نہیں چاہیے کہ یہ اس کے اختیارِ فہم سے بالا ہے لیکن اگر معاشرے میں علم و ادب، تہذیب و تہذیب کی بے لوث خدمت کرنے والے دیوانے ہوتے ہیں تو سارا معاشرہ محض بڑا سا گنگنا جنگل بن کر رہ جاتا اور اس میں رہنے والے وحشی درندے سب ایک دوسرے کو کھا جائیں۔ اس لیے وہ صاحبانِ اقتدار اور وہ صاحبانِ دولت و ثروت، جو جوش مند ہوتے ہیں، علم و ادب کے دیوانوں کو سہارا دیتے ہیں، ان کے حوصلے بڑھاتے ہیں اور ان کے اس عمل سے اپنے نام کو روشن کر کے تاریخ میں ٹیک نام ہو جاتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ علم و ادب کے دیوانے اپنے اچھے ٹہرے کو نہیں سمجھتے یا وہ کم عقل اور کند ذہن ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے لیے یہی شخص اور اذیت ناک راستہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ کانٹوں بھرا راستہ جسے صاف کر کے وہ خود تو لہو لہا ہو جاتے ہیں لیکن سارے معاشرے کے لیے خوشبو و لطافت کے سدِ بہار پھول کھلا جاتے ہیں اور اس طرح معاشرے کی 'بصارت' میں 'بصیرت' کا اضافہ کرتے ہیں۔ اسے صاحبانِ اقتدار و ثروت انھیں حقارت کی نظر سے مت دیکھو کہ یہ غریب لوگ، یہ دیوانے فی الحقیقت بہت بڑے لوگ ہیں اور وہ کام کر رہے ہیں جو محض اقتدار اور دولت سے نہیں کیا جاسکتا۔

میر تقی، اقبال، صاحبانِ اقتدار تھے اور نہ صاحبانِ دولت لیکن آپ خود دیکھیے کہ آج ہم اپنے معاشرے کو، اپنی تہذیب کی روح کو، اپنی بصیرت کو انھیں کے ناموں کے سچاوتے ہیں۔ آج بھی دیوانے ہمارے معاشرے کی، ہماری تہذیب کی شناخت ہیں اور ہم خود کو انھیں دیوانوں کے حوالے سے جلتے اور فخر کرتے ہیں۔ اگر ہمارے فرزندانے، صاحبانِ اقتدار اور صاحبانِ دولت ان دیوانوں کو ان کی اپنی زندگی میں پہچان لیں اور ان کے لیے صرف اتنا کریں کہ جو ایک زندہ فلاحی معاشرے میں انسان کی بنیادی ضرورت کہلاتا ہے تو ہمارا معاشرہ کتنا زندہ اور کتنا فعال و پُر قوت ہو کر دنیا کی عظیم قوموں کی صف میں شامل ہو جائے۔ ہمارے ادیب، ہمارے مفکر و دانش ور جن حالات میں کام کرتے ہیں، معاشرتی بدحالیوں کی جس کش مکش سے ہر وقت دوچار رہتے ہیں اور اپنی باطنی آواز سے مجبور ہو کر علم و ادب کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں، اسے ہم فی سبیل اللہ جہاد ہی کہہ سکتے ہیں۔ یہ

بات ہم سب کو یاد رکھنی چاہیے کہ روٹی پٹڑا مکان انسان کی فی الواقعہ بنیادی ضرورت ہے اور جب یہ میسر نہ آجائے تو اس کے بعد ہی دوسری ذہنی و علمی اور فکری و تخلیقی سرگرمیاں شروع ہوتی ہیں ہمارے ہاں صورت حال یہ ہے کہ ہمارے ادیب، ہمارے دانشور، ہمارے مفکر ساری عمر اسی بنیادی ضرورت کو پوری کرنے میں لگے رہتے ہیں اور غاہر ہے کہ وہ وہ نہیں کر پاتے جو وہ کر سکتے ہیں اور جس سے معاشرے زندہ، روشن اور ٹھیک نام ہوتے ہیں۔

کامل القادری مرحوم نے ان ساری مشکلات کے ساتھ علم و ادب کی دنیا میں بہت کام کیا اور اپنے اس کام سے نہ صرف اپنے معاشرے کا نام روشن کیا بلکہ اس کے شعور اور فکر و نظر میں بھی بہت اضافہ کیا اور اب جب وہ اپنی عمر طبعی کو سپینے سے پہلے ہی ہم سے رخصت ہو گئے ہیں ان کے یومی بچوں کی کفالت اور تعلیم و تربیت ہماری ذمہ داری ہے۔ ہم ان اداروں کے تہ و تول سے شکر گزار ہیں جنہوں نے اپنی ذمہ داری محسوس کی اور ان اداروں کے بھی یقیناً شکر گزار بلکہ احسان مند ہوں۔ آج جو اپنی اس قومی ذمہ داری کو جلد محسوس کرتے ہیں۔

مرنے والے مرحلت ہیں اور جانے والے چلے جاتے ہیں۔ ہم ان کے تعزیتی جلسے بھی کرتے ہیں اور ذرا دیر کو غم و اندوہ کا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ اس جانے والے کی تصانیف اور تحریروں کو شائع کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے کتنے بڑے بڑے ادیب اور دانشور ان چند سالوں میں ہم سے جدا ہو گئے۔ مڑگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا۔ لیکن ان کی کتابیں جو کبھی چھپی تھیں اب نایاب ہیں۔ کیا یہ ہماری قومی ضرورت نہیں ہے کہ ہم مرنے والے دانشوروں، ادیبوں اور مفکروں کو خراج تحسین پیش کرنے اور علمی، ادبی و فکری روایت کے تسلسل کو باقی و زندہ رکھنے کے لیے ان کی ساری مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحریروں کو شائع کریں تاکہ نئی نسل ان کی تحریروں سے فکر و ادب کے چراغ کو روشن رکھ سکے اور ساتھ ساتھ ان کتابوں کی رائلٹی سے مرنے والے کے خاندان کی کفالت کر سکیں۔ "اکادمی ادبیات پاکستان" اس بنیادی کام کو ختم و خرابی نہ کر سکتی ہے۔

خواتین و حضرات! میں نے جو کچھ عرض کیا اس پر انفرادی حیثیت میں آپ بھی غور کیجیے اور جہاں تک ممکن ہو علم و ادب اور فکر و دانش کے فروغ کے لیے اپنے اپنے طور پر عملی قدم اٹھائیے اور اپنے معاشرے کو تعلیمات کی پائال سے نکال کر روشنی و نو بہم پہنچانے کا سامان کیجیے۔ کامل القادری کی وفات میرے لیے جناب میر علی احمد خان تاپور صاحب اور دوسرے عزیز و اقارب کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان، ایک گہرا فانی غم اور ہر ایک بڑا سانحہ ہے۔

تھاجن سے لطف و زیست سو سے یاد رکھئے

لیکن قومی سطح پر کامل القادری کی وفات ان عبرت ناک معاشرتی حالات کی طرف ہمیں متوجہ کرتی ہے جن کی آندھیوں میں علم و ادب کے چراغ، ٹھوٹھو جھوٹ جاتے ہیں۔ کیا ہم اس صورت حال کو یوں ہی نظر انداز کرتے رہیں گے؟

(۲۶ فروری ۱۹۸۳ء)

ڈاکٹر ایوب قادری

انہیں افراد سے جلتی ہیں اور افراد کے اتحاد کو عرف عام میں انجمن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہ افراد قابل تعریف ہیں جو انجمن بناتے ہیں اور کام کرتے ہیں اور کام اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے دل خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں اور سرشار اس لیے ہوتے ہیں کہ وہ پہل بنا، سپاہ بنا، مسجد و مکتب بنائے کے مطابق اپنی سماجی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایسے نیک کام کرتے ہیں کہ کام کے حوالے سے ان کا نام بھی زندہ و باقی رہتا ہے۔ محنتی تیرے شاید اسی لیے کہا تھا جڑ

ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

آج کی تقریب میں ”ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ایوارڈ“ ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا جا رہا ہے۔ آج کی تقریب اس لیے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے جو جامعہ کراچی کے وائس چانسلر اور پرنسپل رہ چکے ہند کے نامور مورخ تھے، تاریخ کو اس طور پر پیش کیا کہ ماضی کو حال میں لاکھڑا کیا اور ساتھ ساتھ اسے مستقبل سے ملادیا۔ یہ تینوں زمانے اور ان زمانوں کا شعور وہ زاویہ ہے جو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم نے تاریخ کو دیا ہے۔ تاریخ انسان کے حافظے اور اس کے کارناموں کا نام ہے۔ مورخ انہیں یکجا کر کے اس طور پر بیان کرتا ہے کہ انسانی حافظہ زندہ ہو جاتا ہے اور ایک نیا شعور اس کی اجتماعی قوتوں کو تندہ و تیز کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ انسانی فکر و شعور کو زندہ و متحرک کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ وہ قومیں جو تاریخ کو بھلا دیتی ہیں، تاریخ انہیں بھلا دیتی ہے۔ وہ قومیں جو تاریخ سے

سبق نہیں سیکھتیں ہمیشہ خوار و پس ماندہ رہتی ہیں۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تاریخ ہمیں وہ بتاتی ہے جو ہم ہیں اور ساتھ ساتھ وہ بھی بتاتی ہے جو ہم بننا چاہتے ہیں۔ آج بحیثیت قوم ہم وہ ہیں جو تاریخ نے ہمیں بتایا ہے لیکن ہم وہ نہیں ہیں جو ہمیں بننا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے تاریخی شعور کو اپنی قومی زندگی کے دریا میں شامل نہ کر کے خود قوم کے دریا کو خشک کرنے کا عمل شروع کر رکھا ہے۔ ہم اسی لیے زر پرست ہو گئے ہیں۔ ایسے زر پرست کہ میدانِ حشر میں ہونے والی نفسا نفسی کا سماں ہمارے چاروں طرف ہوتا ہے اور ہم ایک دوسرے سے بے نیاز دولت بٹورنے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ آدمی دولت حاصل کرے لیکن اس کی محبت میں مبتلا نہ ہو۔ یہی رویہ دولت مند اور زر پرست میں فرق پیدا کرتا ہے۔ ہم بحیثیت قوم مفلس ہیں لیکن ہم بحیثیت فرد خستہ زر کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ اسی لیے زندگی کی دوسری قدریں ہمارے معاشرے میں سوکھ کر مر جھا رہی ہیں۔ ہم آدمی کو زر سے پہچانتے ہیں اور بے زر کو کمتر سمجھتے ہیں۔ اہل علم بھی اسی لیے زر پرستی کی دوڑ میں لگ گئے ہیں اور علم و ادب اور فکر و شعور کی قیمتی بُری طرح سوکھ رہی ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کی کتبہ تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہیں کہ قومیں تاریخی شعور سے زندہ رہتی ہیں۔ ماضی کوئی پتھر یا ڈالا نہیں ہے بلکہ وہ ایک زندہ سماجی شعور کا نام ہے۔ ڈاکٹر ایوب قادری بھی اسی روایت کے علم بردار تھے۔ وہ ساری عمر تاریخ کو کھنگالتے رہے اور صدفِ تاریخ سے گوہر آبِ دار ہمارے سامنے لاتے رہے۔ وہ صحیح معنی میں صاحبِ علم تھے۔ کتا میں پڑھنا آتے ہیں لکھنا، علم کی شمع کو روشن رکھنا اور ماضی کی شمع سے زمانہ حال کو روشن رکھنا یہی ان کا کام تھا۔ مرحوم ایوب قادری نے جو کام کیا ہے وہ ہمیشہ اسی کام سے زندہ رہیں گئے۔ کتے والی نسلیں انھیں اسی کام سے پہچانیں گی اور ان کا نام پاکستان کی علمی دنیا میں عزت و احترام سے لیا جائے گا۔ وہ طبیعتی موت نہیں مرے بلکہ ایک سفاک تیز رفتار سنوزوکی نے انھیں مار دیا اور وہ مر گئے۔ ہمارے عظیم و نامور خطاط استاد یوسف دہلوی بھی ایک ایسی ہی سفاکی کا شکار ہو گئے تھے۔ زر پرست

معاشرے میں صاحبان علم کی موت بھی کوئی بڑا قومی سانحہ نہیں بنتی لیکن جب ہمارے معاشرے کو پوٹھن آئے گا تو ہم محسوس کریں گے کہ ہماری خود غرضانہ تیز رفتاری نے کیسا ظلم ڈھایا ہے؟ ایوب قادری کے مرنے کے دن جہیں تھے۔ ابھی ان کا قلم جوان تھا کام کرنے کا جذبہ زندہ تھا اور وہ دن رات کام میں لگے ہوئے تھے۔ جب بھی میرے پاس آتے کسی کتاب کی تلاش میں یا کسی علمی موضوع پر تہاؤں خیال کے لیے آتے۔ علم کی یہ نگین اور کام کرنے کا یہ دھن اس دور میں جہاں فرزانے بہت اور دیوانے بہت کم ہیں، مجھے خال خال نظر آتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ یونی کیرپن نے پس منظر ڈاکٹر ایوب قادری کو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ایوارڈ "دے کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے اور یہ اعتراف یقیناً ایک بڑا اعتراف ہے۔

(۲۲ اکتوبر ۱۹۸۴ء)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان: ایک تعارف

استاذ الاساتذہ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب ان تابعدار روزگار ہستیوں میں سے ایک اور ممتاز ہیں جن پر نہ صرف ہم سب فخر کرتے ہیں بلکہ آنے والی نسلیں بھی فخر کریں گی۔ وہ جامع الصفات ہیں۔ ایک ہی ذات میں اتنی صفات کا رکھنا ہو جانا ایک ایسا کمال ہے جو اس دور میں کم کم دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ عظیم استاد ہیں۔ ایسے فاضل و شفیق استاد جن کی مثال اس دور میں نہیں ملتی۔ ان کے شاگرد اس برصغیر اور بیرونی ممالک میں اپنی علمی و ادب پر چھائے ہوئے گیسوئے زندگی کو اس طور پر سنوار رہے ہیں کہ استاد کا فیض معاشرے کو روشن و منور کر رہا ہے۔ ایسے محقق اور مفکر کہ ان کی تحقیقات نے ادب و فکر کے دروہام پر اٹھا لایا ہے۔ ایسے قطب اقطاب اور ایسے بزرگ ملی افتخار کہ ہزاروں لاکھوں گم کردہ راہ کو راستی کی طرف موڑ کر ان کی زندگی کو نیکی کے راستے پر لگایا ہے جس پر توجہ کی پادس بن گیا۔ جسے نظر کیسیا اثر سے دیکھ لیا کنند ہو گیا۔ روشن آنکھیں، شگفتہ و خندان نورانی چہرہ صاف و صیما ہر دل میں اتر جانے والا، ہاتھ جیسے گلوں کی خوشبو، کم سخن لیکن ہر سخن میں معنی کا ایک دریا۔ جب کبھی غم ہٹا کر اپنے ہاتھ سے کھلایا اس کی لذت کلام و دہن کا مستقل مزاج بن گئی چشمہ فیض ایسا کہ ہر دم جاری ہے۔ جو آیا شاد کام گیا۔ بیمار آیا صحت مند گیا۔ در ماندوں کے رفیق دشمنوں کے دوست، سب کے لیے دعا گو۔ جب بھی دیکھنے کا موقع ملا عبادت گزاری میں دیکھا۔ دن کو بھی اور رات کو بھی۔ مزار جا فقیر لیکن امیروں کے پیشوا۔ جو لفظ دل کی زبان سے نکلا مشرف بقبولیت ہوا۔ علم اتنا کہ بہت سے عالموں کے پاس مل کر نہ ہو گا۔ لکھائی ایسی کہ جیسے صفحہ قرطاس پر موتی ٹانگ دیے ہوں۔ اردو اور انگریزی پر یکساں قدرت، فارسی و عربی

پر پوری دسترس و خطوں کے جواب اس تیزی سے دیتے ہیں جیسے ہم آپ سلام کا جواب دیتے ہیں۔ رسول کے عاشق و سُنّت کے پیروکار، شریعت و طریقت کے پابند، سلسلہ نقشبند یہ ہیں میرے اُستاد۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب۔ ہادی بھی۔ راہنما بھی۔ اللہ تعالیٰ ایسے استاد سب کو دے۔ غالب نے کہا تھا "وہ وہی میں" استاد کے لیے کہتا ہوں۔

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے موت و بیکاس ستر

۲

ڈاکٹر صاحب کی اب تک سائنس کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں علمی، ادبی تحقیقی کتابیں بھی ہیں جیسے "سید حسن غزنوی" جو عہد غزنوی پر پہلی بنیادی تحقیق کا درجہ رکھتی ہے۔ "حالی کا ذہنی ارتقا" جس نے تحقیق میں نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ فارسی پر اردو کا اثر، علمی نقوش افادہ کی قدیم شعراء تحقیقی جائزے "ادبی جائزے" تحریر و تقریر، متین برہان پوری کے مرثیے۔ "ثقافتی اردو" تو ایک ایسی کتاب ہے کہ یہ موضوع اس انداز سے پہلی بار سامنے آیا ہے "اردو میں قرآن و حدیث کے محاورات" تحقیق کا ایک نیا باب کھولتی ہے۔ سندھی اردو و لغت اور اردو سندھی لغت وہ لغات ہیں جو آج سے تیس سال پہلے تالیف کی گئی تھیں اور آج تک ان پر اضافہ نہ ہو سکا۔ جامع القواعد (حصہ نچو) وہ تصنیف ہے جو کج بھی استاد کا درجہ رکھتی ہے۔ اقبال ان کا محبوب موضوع ہے اور محبوب اس لیے ہے کہ اقبال کی شاعری میں انھیں روح اسلام کا دلہا نظر آتی ہے۔ اقبال اور قرآن اور محارف اقبال جیسی کتابوں کے علاوہ متعدد مضامین انھوں نے اقبال کی شاعری کے تعلق سے لکھ کر روح اقبال اور روح اسلام کو اجاگر کیا ہے۔ دیوان روشن اور دیوانِ عظیم نقوی تدوین متن کی ممتاز مثالیں ہیں۔ ادب و تحقیق کی طرح تصوف ان کا خاص موضوع ہے اور اس موضوع پر ان کی کم و بیش ۳۰ تالیفات شائع ہو چکی ہیں جن میں رسائل مشاہیر نقشبندیہ، ملفوظات صوفیہ، ارشاد رحیمیہ،

ہدایت الطالبین، تحفۃ کوناریہ، وسیلۃ القبول، اثبات النبوة، رسالہ تہلیلہ، مکاشفات عینیہ، تاریخ اسلاف، سوانح امیر کلال، سعید البیان، گلشن وحدت، مکتوبات سیفیہ، مجمع البحرین، رسالہ سلوک، الواح خانقاہ مظہریہ، سراج منیر اور تین جلدوں میں مکتوبات امام ربانی اور مکتوبات معصومیہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بعض کتابوں مثلاً حضرات القدس، خزینۃ المعارف اور زبدۃ المقامات کے اردو تراجم بھی کیے ہیں۔ انگریزی میں ان کی دو کتابیں تاریخ بہرام شاہ، غازی و اور بر صغیر میں فارسی ادب قابل ذکر ہیں۔ فن لغت پر ایسا عبور کہ ماہرین فن ان کی رائے کے محتاج ہیں۔ سر تاپا انکسار اور سر تاپا علم۔ یہی ہماری عظیم روایت تھی اور آج اسی روایت کے وہ ملک بھر میں واحد اور ممتاز نمائندے ہیں۔

دین اسلام اور اس کی روایت ان کی ہر تحریر میں رنگ و خوشبو پیدا کرتی ہے۔ یہی ان کی تصنیف و تالیف کا مقصد ہے۔ ایک جگہ نئی نسل سے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں :

”دین کی تکمیل علم، عمل اور اخلاص سے ہو کرتی ہے.....
 دنیوی معاملات کے لیے بھی یہی تین چیزیں ضروری ہیں۔ وہ علم ہے کار
 ہے جس پر عمل نہ ہو اور وہ عمل محض فریب ہے جس میں اخلاص نہ ہو۔
 ذرا دیکھیے جو عمل (ادب) ہم پیش کر رہے ہیں اس میں اخلاص کس
 درجے میں موجود ہے؟ یا نہیں۔ اشتراکیت اور جنسیات اپنی جگہ
 مرد و دہنیں اور ان کا موضوع سخن بنانا کوئی عیب نہیں لیکن بقول
 میر طر

عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

یاد رکھیے پاکستان صرت ریت کے ٹیلوں کا نام نہیں۔ وہ جس مقصد
 کے لیے بنایا گیا ہے اس کے حصول کی کوشش کیجیے ورنہ آپ کو نہ
 صرت قوم کے سامنے بلکہ خدا کے سامنے جواب دینا ہو گا۔

(حقیقی جائزے ص ۱۲۲-۱۲۳)

ہو۔ (تحقیقی جائزے ص ۸۲-۸۵)

یہی وہ رویہ ہے جس کی ہمیں، ہمارے ملک اور قوم کو زندگی کی ہر سطح پر اپنانے کی ضرورت ہے۔ اس سے مثبت اور تعمیری فکر کے سوتے پھوٹتے ہیں اور ایک جہتی و اتحاد کی فضا پیدا ہوتی ہے اور معاشرہ منفی و انتہا پسندانہ رویوں سے گریز کر کے تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ استاد محرم ڈاکٹر صاحب نے ساری زندگی کو ایک اکائی کے طور پر اسی نظر سے دیکھا ہے اور یہی وہ طرز فکر ہے جس سے علمائے دین، صاحبانِ ادب اور اہل نظر کو ساری زندگی اور اس کے مسائل کو دیکھنا چاہیے۔ یہ وصل کا راستہ ہے اور باقی سارے راستے فصل کے راستے ہیں۔ مولانا دروم نے کہا تھا:

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

لسانی، نسلی و صوبائی تعصبات کے اس دور میں اسی طرز فکر کے باعث ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب ایک ایسی مشعل پر نور کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے پاکستانی معاشرے کی غلطیوں دور ہو سکتی ہیں۔ وہ از سر تا پا محبت ہی محبت ہیں۔ وہ محبت جس سے غمشیں دل میں بہا رہا جاتی ہے اور زندگی نفرتوں کی دلدل سے نکل کر انسانیت کے باغ میں آجاتی ہے، جہاں ہر طرف مشامِ جان کو معطر کرنے والے پھول ہی پھول کھلے ہیں۔ اسی شگفتگی اور اسی خوشبو سے ڈاکٹر صاحب دینی و دنیوی زندگی کو حیاتِ نو بخش رہے ہیں۔ خدا انہیں ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔ آمین۔

۲۸ فروری ۱۹۸۸ء

اختر حسین رائے پوری

کہیں پڑھا تھا، یاد نہیں کہاں کہ ہر پانچ نظر اور ہر شعور انسان کی زندگی میں مشاہدات و تجربات کا اتنا تنوع اور اتنا انوکھا پن ہوتا ہے کہ اگر انہیں بیان کیا جائے تو ایک دلچسپ ناول و جرم میں آسکتا ہے لیکن عام طور پر کتاب درست اور خود پورا انسان اپنی جڑائی کے بہاؤ بنائے میں لگ جاتا ہے اور اس کے اصل تجربات جھوٹی جڑائی کے طے تلے دب کر رہ جاتے ہیں۔ اسی لیے بہت کم خود نوشتیں ایسی ہوتی ہیں جو پڑھنے والوں کے دل کو چھوئی ہیں۔ ”مگر دراہ“ اس اعتبار سے اردو زبان میں ایک مختلف خوردنوشت ہے۔ مگر دراہ کی خوبی یہ ہے کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنی زندگی کے حالات، اپنے تجربات و مشاہدات کو انتہائی دھیمے انداز میں، انگسار و معروضیت کے ساتھ، انا پرستی اور خود پروری نے نیکی کر اس سادگی سے بیان کیا ہے کہ یہ خوردنوشت قارئین کے دل چسپ اور زندگی سے زیادہ حقیقی بن گئی ہے۔ ”مگر دراہ“ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ پوری کتاب میں ہیں ایک جہت، ایک زاویے کا احساس ہوتا ہے یہاں زندگی اپنے زمانے کی روح سے پیوست ہے اور زمانہ حالات سے مربوط ہے۔ ساتھ ساتھ واقعات، حالات، تجربات و مشاہدات کے مربوط بیان سے اس دور کی زندگی کے خدو خال اس طور پر ابھرے ہیں کہ زندگی اور زمانے کے رنگ نکھر کر اس تصویر کو خوب صورت بنادیتے ہیں۔ کتاب بقا ہر مختلف ابواب میں تقسیم کی گئی ہے لیکن زاویے نظر اور جہت کے سرے اس میں ایک

ایسا ربط اور ہی ترتیب پیدا کر دیتے ہیں کہ شروع سے آخر تک یہ ایک دل کش اور جاذب نظر تحریر بن جاتی ہے۔ یہی ربط اگر در راہ کو ایک خوبصورت اور دل فریب ساخت عطا کرتا ہے اور اسے ایک باقاعدہ تصنیف بنادیتا ہے۔ ایک ایسی تصنیف جس میں فلسفہ حیات بھی ہے اور نظریات و افکار بھی ہیں اور ساتھ ساتھ وہ انوکھی دل چسپی بھی جو ایک داستان میں ہوتی ہے۔ ایک ایسی داستان جسے ایک پانچ نظر پختہ کار اور لفظوں کا پارکھ ادیب بیان کر رہا ہو۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے جب مجھ سے کہا کہ ”گر در راہ“ کے آخری پروف میں دیکھ دوں تو میں نے اس محنت کے پیش نظر تقریباً تیس سال سے میرے اور ان کے درمیان ہے، اہمی بھری اور عرض کیا کہ ایک ماہ میں پروف دیکھ کر واپس کر دوں گا لیکن جب میں نے پروف پڑھنے شروع کئے تو تین دن میں سارے پروف پڑھ ڈالے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ کتاب اتنی دلچسپ تھی کہ میں تین دن تک اس کے علاوہ کوئی اور کام نہ کر سکا۔ اپنی زندگی کے حالات و واقعات دوسروں نے بھی بیان کیے ہیں اور متعدد خود نوشتیں اردو میں لکھی اور شائع ہوئی ہیں لیکن ”گر در راہ“ اس صنفِ ادب میں ایک ایسا اضافہ ہے کہ آئندہ خود نوشت لکھنے والے اس تصنیف کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں گے۔ بظاہر یہ ایک عام سا جملہ ہے لیکن اس میں بہت سی ایسی باتیں پوشیدہ ہیں جن کے اظہار کے لیے ایک تفصیلی مضمون کی ضرورت ہے، جو میں آج تو نہیں لیکن جلد لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

سر دست تو میں آپ کی توجہ اس اہم تصنیف کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں تاکہ جب میں اپنے اس جملے کا طلسم کھولوں تو آپ بھی میرے ساتھ شریک ہوں۔

”گر در راہ“ میں ایک اور چیز جو دل کو موہتی اور پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے وہ سچائی کا جرات کے ساتھ واقعاتی اظہار ہے جسے اتنی سادگی اور خلوص سے بیان کیا گیا ہے کہ سچائی کا اظہار قاری کو اپنے اثر کے سیلاب میں بہا لے جاتا ہے۔ ادبی صحافت کے اس دور میں جب ساری زندگی اخبار کے صفحات پر اگر مبتذل ہو گئی ہے، گر در راہ اپنے خاص ادبی اظہار اور ادبی رنگ کی وجہ سے ہمیشہ ویسی ہی تازہ رہے گی جیسی

آج ہے اور جسے پڑھنے والا ہر بار پڑھ کر اس کی معنویت سے اس کی خوشنوا اور رنگوں کے نکتے اندوز ہوتا رہے گا۔ یہ باتیں میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری میرے سامنے موجود ہیں۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کتاب کو دوسری بار پڑھ کر میں اس کے ظہر میں اور زیادہ گرفتار ہو گیا ہوں۔ کتنی کتابیں ہیں جو آپ دو بار پڑھ سکتے ہیں۔ کتنی کتابیں ہیں جو آپ لفظاً لفظاً اور سطر ب سطر پڑھ سکتے ہیں۔ مگر وہ ایک ایسی کتاب ہے جو ایک عرصے کے بعد پتھر آتی ہے۔

یہاں میں ایک بات کی طرف اور اشارہ کرتا چلوں کہ گردِ راہ میں ایک ایسا اسلوب ابھرتا ہے جو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی شناخت بن جاتا ہے اور جو لہجے کے دھیمے ہیں، لفظوں کو کفایت کے ساتھ استعمال کرنے کے تہنہ، مشابہات و تہجرات کو ناپ تول کر بیان کرنے کی خصوصیت اور صاف ذہن کے ساتھ اپنی بات پوری طرح پڑھنے والوں تک پہنچانے کے شعوری عمل سے وجود میں آیا ہے۔ اسی اسلوب نے اس تصنیف کو بلند پایہ، منفرد اور ممتاز بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری صاحب نے اس تصنیف میں بہت سے اردو و فارسی اشعار بھی استعمال کیے ہیں اور یہ سب اشعار اسی برجستگی اور خوبی کے ساتھ نشر کا حصہ بن کر آئے ہیں کہ سوائے ابوالکلام آزاد کے کسی دوسرے ادیب کے ہاں یہ حسن اشعار نہیں ملتا۔ ڈاکٹر اختر حسین صاحب نے نثر کی اگادہی میں اشعار کو گنیے کی طرح جڑ دیا ہے۔ اور بھی کئی پہلو ہیں جن پر گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن یہ سب پہلو میں آئندہ کسی وقت پیش کروں گا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

جامعہ کراچی کے لیے یہ ایک یادگار دن ہے کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمارے درمیان تشریف رکھتے ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب ہمارے دور کی وہ منتخب روزگار شخصیت ہیں جنہوں نے جدید دور کے تعلق سے اسلام کی ترجمانی کر کے ہمارے ذہنوں کی بے شمار الجھنوں کو دور کیا ہے اور ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے جن کے جواب کی تلاش میں آج کا جدید ذہن سرگرداں ہے۔ مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے ان تمام مسائل کا نہ صرف حل پیش کیا ہے بلکہ اس انداز سے پیش کیا ہے جو نئی نسل کے لیے قابل قبول اور حاذق جواب ہے۔ اقبال بھی اسی وجہ سے مولانا کے مطالعہ کا مرکز ہیں۔ نقوش اقبال کے نام سے ان کی ایک تصنیف شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔ میں مولانا کے پہلی بار ان کی معرکتہ الآراء تصنیف "ماریخ دعوت و عزیمت" کے ذریعے متعارف ہوا۔ اس وقت میں خود ایک کتاب لکھنے میں مصروف تھا جو ۱۹۶۴ء میں "پاکستانی کلچر" کے نام سے شائع ہوئی۔ ماریخ دعوت و عزیمت کی اب تک چار جلدیں میری نظر سے گذری ہیں جن کے مطالعے سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان کتابوں کا لکھنے والا ایک ایسا ذہین رکھتا ہے جس میں فکر و اجتہاد کے ساتھ روایت کا شعور بھی موجود ہے۔ اس کے بعد سے جہاں کہیں مولانا کی کوئی تحریر میری نظر سے گذرتی میں اُسے دلچسپی سے پڑھتا۔ آج سے دس پندرہ سال پہلے پروفیسر محمد مجیب کی کتاب "انڈین مسلم" میں نے پڑھی تھی جس سے میں متاثر ہوا تھا اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کی کتاب ہندوستانی مسلمان" میری نظر سے گذری جس نے مجھ میں ایک نئی روشنی کا احساس پیدا کیا۔ اس کے بعد ان

کی ایک اور کتاب ”انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر“ جب میں نے پڑھی تو اس میں ایک ایسے زاویے سے جدید دور اور اسلام کے تعلق پر روشنی ڈالی گئی تھی جو بالکل نئی تھی۔ ان کی ایک اور تصنیف ”مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش“ بھی اسی نقطہ نظر کی مزید وضاحت کرتی ہے۔ ان سب تصانیف میں ہیں ایک ایسے نئے ذہن سے واسطہ پڑتا ہے جس کے لیے جدید دنیا کے مسائل اور ان کے حل کی جستجو ایک منزل کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا کے قلم کی ثوابی یہ ہے کہ وہ عام زبان میں بڑی سے بڑی بات کو اس طور پر بیان کر دیتے ہیں کہ ان کی بات پڑھنے والوں تک پورے طور پر پہنچ جاتی ہے۔ بڑی سے بڑی بات کو عام زبان میں بیان کرنے کے کٹھن تخیلی عمل سے وہی لگ واقف ہوتے ہیں جنہوں نے لاکھوں الفاظ کو استعمال کر کے اس عمل کی مشق بہم پہنچائی ہے۔ اس سلسلے میں محام شخصیتوں پر جو قلبی تاثرات و مشاہدات مولانا نے لکھے ہیں وہ خوب صورت تحریروں کا معطر مجموعہ ہے جو ”پرانے چراغ کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔

مولانا پاکستان کو اسلام کی ایک تہذیب گاہ سمجھتے ہیں۔ ”مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش“ میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ پاکستان کا:

”یہ تہذیب جو اپنی اہمیت، نزاکت اور اپنے دور رس نتائج کے اعتبار سے تاریخ کا ایک اہم ترین اور عہد آفرین واقعہ تھا، ان ہی راہنماؤں کے ہاتھوں کامیاب ہو سکتا تھا جو اسلامی شریعت کی ابدیت اور اسلامی تہذیب کی برتری پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہوں، جن کا خلوص اور صداقت، خود غرضی مفاد پرستی اور مصلحت کو شی سے پاک اور ہر شے سے بالاتر ہو، ان کا ذہن مغربی اقدار و افکار کی غلامی اور ان کی میرٹ غیر اسلامی تحلیم و تربیت کے اثرات سے بالکل آزاد ہو چکی ہو اور ایمان راسخ اور اخلاقی جرأت کے ساتھ جدید علوم کے پیمانہ کردہ وسائل اور قوتوں کو اپنے اعلیٰ دینی و اخلاقی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی قدرت اور آزاد و جدید اسلامی معاشرہ

کے ماحول کے مطابق ان کو ڈھلنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔“

(ص ۱۰۰)

اسی سلسلے میں آجے چل کر لکھتے ہیں کہ

”پاکستان کا اپنے بنیادی مقاصد سے انحراف اور عصر حاضر کی دوسری نامذہبی اور تجدد پسند حکومتوں کی تقلید تکبرجہ جدید کا ایک عظیم سانحہ ہو گا اور ان کروڑوں افراد کے ساتھ بے وفائی جنہوں نے اس اسلامی مہتمل اور حجبہ گاہ کے قیام کے لیے شدید ترین تکالیف برداشت کیں اور عظیم قربانی پیش کی۔ اس سے بڑھ کر اس کا نقصان یہ ہو گا کہ یہ طرز عمل ہمیشہ کے لیے اس آئنگ اور آرزو کو سرور کر دے گا اور اس تجربہ کی کامیابی کے امکان کو اگر ختم نہیں تو نہایت بعید بنا دے گا۔“ (ص ۱۰۳)

یہ چند باتیں میں نے اس لیے آپ کے سامنے پیش کیں تاکہ پاکستان کے حوالے سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کے خیالات سے آپ متعارف ہو سکیں۔ ان کی تحریر میں غیر معمولی تنوع ہے۔ انہوں نے عہد جدید بے شمار مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی تصانیف سے لاتعداد لوگوں نے استفادہ کیا ہے اور یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ حضرت مولانا آج ہمارے مادر علمی میں نہ صرف موجود ہیں بلکہ آپ سے ابھی خطاب فرمائیں گے۔ ان الفاظ کے ساتھ میں مولانا کا نہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ جامعہ کراچی میں تشریف لائے اور سب کی طرف سے مولانا کو خوش آمدید کہتے ہوئے ان کا خیر مقدم کرتا ہوں : ع

آمد آن یارے کہ مامی خواستیم

ڈاکٹر سہیل بخاری: ایک تعارف

ڈاکٹر سہیل بخاری کی تصانیف پر نظر ڈالے تو ان میں آپ کو ایک ایسا تنوع نظر
 آئے گا جو کم لکھنے والوں کے ہاں ملتا ہے۔ ایک طرف ان کے ہاں تحقیق و تنقید ملتی ہے جس
 کے تحت جہاں "ناول نگاری" کے موضوع پر ایک کتاب ملتی ہے وہیں "سب دس پر ایک نظر"،
 "بارغ و بہار پر ایک نظر"، "غالب کے سات رنگ" اور "اقبال: مجدد عصر کے عنوانات کے
 تحت ان کی کتابیں سامنے آتی ہیں۔ اردو داستان کو بھی ہم اسی ذیل میں لاسکتے ہیں۔ اس موضوع
 پر ہمارے ہاں بہت کم کام ہوا ہے۔ لے نوے کروڑ چار کتابیں ہیں جن میں کلیم الدین احمد کی
 "فن داستان گوئی" اور گیان چند جین کی "اردو کی نثری داستانیں" جس کا حال ہی میں ترمیم شدہ
 ایڈیشن اپریل ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا ہے، یقیناً قابل ذکر ہیں۔ سید وقار عظیم کی کتاب "ہماری
 داستانیں" بھی اسی ذیل میں شامل کر لیجیے۔ ان کے علاوہ چند مضامین کو چھوڑ کر داستانوں پر
 کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کی زیر نظر تصنیف "اردو داستان" یقیناً اس
 موضوع پر ایک اضافہ ہے۔ داستانوں نے اردو کو زبان و بیان کے نئے کینڈے اور اظہار کے
 ایسے رنگ اسالیب دیے ہیں کہ اہل علم کو داستانوں کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ پچاس کے
 عشرے میں حسن عسکری مرحوم نے "طلسم ہوشربا" کا ایک انتخاب شائع کیا تھا اور اس انتخاب
 سے اردو ادب کے پڑھنے والوں میں داستانوں کا چرچا شروع ہوا تھا۔ بعض لکھنے والوں
 نے اس کے کرداروں اور اسالیب کو اپنی تخلیقی تحریروں میں استعمال بھی کیا تھا لیکن ان
 داستانوں کو پڑھنے کی بہت کم لوگوں کو توفیق ہوئی تھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان

داستانوں کو دوبارہ پڑھا جائے اور ان سے وہ رنگ و نور اخذ کیا جائے جو ان ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی داستانوں میں موجود ہے۔ ڈاکٹر سیل بخاری کی تصنیف سے اردو داستانوں کی طرف نہ صرف رغبت پیدا ہوتی ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ کئی نئے نئے دور میں اردو داستانیں اور بالخصوص مسلم جوہر کا احیاء ہو گا اور ہمارے لکھنے والے اس بحرِ فکار میں غوطہ زنی کر کے اہل ادب کے سامنے سچے موٹی چٹن کر لائیں گے۔ جب تہذیبیں اپنے سوتوں سے کٹ جاتی ہیں تو ان کے ادب کا وہی حشر ہوتا ہے جو ہمارے ادب کا ہوا ہے۔ ہم مغرب کے چبائے ہوئے باسی لقموں کو آخر تک ہنگ چباتے رہیں گے۔ آپ مغرب سے سب کچھ سیکھے لیکن اپنی فضا، اپنے موسم میں سانس لیجیے۔ اسی سے آپ کی اور آپ کے ادب کی شناخت پیدا ہوگی۔ ڈاکٹر سیل بخاری کی اس تصنیف سے ہمیں یہی راستہ ملتا ہے۔ یہ بات تو میں نے صفاً کہہ دی۔ آپ چاہیں تو اسے جملہ معترضہ کہہ لیجیے۔ میں تو ڈاکٹر سیل بخاری صاحب کی تصانیف کے تنوع کی بات کر رہا تھا۔ ان کا ایک اور اہم موضوع زبان و لسانیات ہے جس کے تحت ہم ان کی دو کتابوں ”اردو کا روپ“ اور ”اردو کی کہانی“ کو رکھ سکتے ہیں۔ یہاں میں ایک اور کتاب کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں اور وہ ہے ”اردو کا اشتقاقی لغت“۔ یہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی لغت ہے اور اس پر بھی ہمیں دل کھول کر ڈاکٹر سیل بخاری کو داد دینی چاہیے۔ ایک اور کتاب ان کی ”تصور الوہیت“ کے بارے میں ہے جسے آپ مابعد الطبیعیات کے ذیل میں لاسکتے ہیں۔ لیکن اس کتاب کی طرف ہمارے صاحبانِ نظر کی نظر اس لیے نہیں گئی کہ ہم تو مابعد الطبیعیات کو کبھی کاٹک کرنے کی تہمت کر چکے ہیں۔ ہمارے منِ مسکری برسوں اس کی طرف توجہ دلاتے رہے مگر ہم بحیثیت قوم اس کام کو جس سے ہم اپنے تہذیبی سوتوں کو تلاش کر سکیں، خیر یاد کہہ چکے ہیں۔ آخر ہم سائنس و ٹیکنالوجی کے مینار سے شیخ محی الدین ابن العربی کی رجعت پسندانہ خیالات کیوں سنیں گے۔ بہر حال ایک آدھ کتاب اور ہے جس کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہا ہے۔ شاید وہ کتاب جسے ڈاکٹر سیل بخاری صاحب نے اس

خاکسار کے نام محزون کہا تھا۔

ان سب قصانصیف پر نظر ڈالے تو سہیل بخاری صاحب ہمیں اس دور کے ایک بڑے اور اہم نگھنے والے نظر آئیں گے۔ ہمیں ان کی قدر کرنی چاہیے اور ان کا حق یقیناً ان کو پہنچانا چاہیے۔

(۲۲ ارجح لائی ۱۹۹۶ء)

بچوں کی شاعری : محشر بدایونی

حضرت محشر بدایونی شاعر بھی اچھے ہیں اور انسان بھی۔ انسان کی پہچان تو خیر دیر میں ہوتی ہے لیکن شاعر کی حیثیت سے آج سارے عظیم میں ان کی شہرت ہے۔ کوئی اچھا مشاعرہ ان کے بغیر اچھا نہیں ہوتا۔ جہاں جاتے ہیں اپنے شعروں سے دلوں میں اتر جاتے ہیں۔ یہی اس لیے شاعر کی پہچان ہے اور اسی لیے میں ان کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ لیکن اس قدر دانی کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ وہ جہاں بڑوں کے لیے شاعری کرتے ہیں وہاں بچوں کے لیے بھی ایسی شاعری کرتے ہیں کہ بہت کم شاعر ان کے رتبے کو پہنچتے ہیں۔ محشر بدایونی صاحب نے دوسرے شاعروں کی طرح بچوں کا حق نہیں مارا بلکہ دل لگا کر محبت کے ساتھ ایسی شاعری کی ہے کہ قوم کے بچوں کی کثیر تعداد ان کی پرستار ہے۔

۱۹۶۱ء میں ”بین باجے“ کے نام سے ان کی نظموں کا ایک مجموعہ چھپا تھا جس کی نظمیں آج بھی بچوں کو یاد ہیں۔ یاد اس لیے ہیں کہ ان میں شاعرانہ مٹھاس بھی ہے اور بہتے دریا کی سی روانی بھی۔ ۱۹۶۲ء میں ”شاعرانہ“ کے نام سے ان کا ایک مجموعہ شائع ہوا جس میں بیشتر سے لے کر مچانک اردو شاعروں کو بچوں سے متعارف کرایا تھا۔ ۶۵-۶۶ء میں ”سائنس نامہ“ کے نام سے ایک اور مجموعہ شائع ہوا جس میں جابر بن حیان سے لے کر البہر فلانی تک مسلم سائنس دانوں کو بچوں سے متعارف کرایا تھا۔ یہ دونوں مجموعے بچوں میں مقبول ہوئے لیکن ”بین باجے“ کی نظمیں بچوں کے ادب میں یقیناً اضافہ ہیں۔ اب برسوں بعد ان کا زیر نظر مجموعہ ”کلام“ ”جگ مگ تارے“ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان نظموں میں بھی وہی تازگی، وہی سادگی اور وہی رچاؤ ہے جو ”بین باجے“ میں ملتی ہے۔

لیکن تخیل کی پرواز اور بچوں کی نفسیات نے شاعرانہ اثر کو اور بڑھا دیا ہے۔ یہ سب نقلیں ایسی ہیں کہ جس بچے کے ہاتھ لگ جائیں وہ انہیں کا ہو کر رہ جائے۔ بڑے بچے تو ماضی کے درپے کھل جائیں اور بچپن کی جنت سے آنے والی خوشبو سے سارا وجود نازہ دم ہو جائے۔ بچے پڑھیں تو ان میں نئی دنیا قل کے سفر کا حوصلہ پیدا ہوا اور دنیا کی تربیت و نشو و نما ہو۔

بچوں کے لیے شاعری کرنا بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے لیکن ابھی شاعری کیجئے تو پتا پانی ہو جائے۔ یہ بات تو سب کہتے ہیں کہ بچے قوم کا مستقبل ہوتے ہیں لیکن کہنے شاعر ہیں جو اس بات کو اپنے عمل سے آگے بڑھاتے ہیں۔ اسی لیے میں محشر ہدایونی کا قدردان بھی ہوں اور متداع بھی۔ بچوں کی شاعری میں میں انہیں اسی روایت کا علم بردار سمجھتا ہوں جس کی ابتدا اسماعیل میرٹھی نے کی تھی۔ محشر ہدایونی اسی روایت کے ممتاز شاعر ہیں۔ اب جب کہ میں محشر ہدایونی کے بارے میں لکھ رہا ہوں تو اس موقع پر ان سے ایک آدھ فرمائش بھی کرتا چلوں۔ اردو شاعری میں شادی بیاہ، ساگر، تہوار آزادی وغیرہ کے گیت تو ہیں جو مل جل کر گائے جاتے ہیں، لیکن ایسے گیت نہیں ہیں جو مختلف سماجی موقعوں پر کورس کی صورت میں گائے جاسکیں۔ یہ اس دور کے بچوں کی بنیادی ضرورت ہے مثلاً بچے بیچ دیکھ رہے ہیں۔ جد بات مسرت سے ان کے دل معمور ہیں۔ اب ایسے موقع پر اگر کسی گیت کے لہلہ جس کی دھن مقرر ہو اور جسے بچوں نے اپنے اسکول میں دیکھا اور مل کر گایا ہو، ہونٹوں پر آکر کورس بن جاتے تو اس سے ایک طرف نظم و ضبط پیدا ہوگا، جذبہ حب الوطنی بیدار ہوگا اور ساتھ ساتھ بچوں کے جذبات کا تزکیہ (کیٹھارسس) بھی ہو جائے گا۔ غور کیا جائے تو جدید زندگی میں بے شمار ایسے موقعے کتنے ہیں جہاں بچوں کو مل جل کر گانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ محشر صاحب یہ کام سلیقے سے کر سکتے ہیں۔ یہی گیت بچے بڑے ہو کر ایسے موقعوں پر کورس کی صورت میں گائیں گے اور اس طرح یہ قومی گیت بن جائیں گے۔ اس قسم کے گیت ہماری قومی ضرورت ہیں۔ یہی پاکستانی قوم کی شناخت اور ہمارے

قوی مزاج کے ترجمان بنیں گے۔ محشر صاحب کے اس مجموعے میں اس قسم کے گیتوں کی ہلکی سی جھلک مجھے ”ہم بچے ہمت والے ہیں“، ”آزادی کا دن“، ”جاگ رہا ہے پاکستان“ میں ملتی تھی۔

حضرت محشر دہلوی کا یہ مجموعہ ہر اعتبار سے اس قابل ہے کہ بچے اسے پڑھیں اور اس سے لطف اندوز ہوں۔ مجھے امید ہے کہ محشر صاحب بچوں کی نظموں کی طرف اب اور توجہ دیں گے اور بچوں کی شاعری کے اس خلا کو بھی جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے پُر کر دیں گے۔

(۱۸ اگست ۱۹۸۴ء)

بچوں کی نظمیں : شان الحق حقی

شان الحق حقی صاحب کمال کے آدمی ہیں۔ ان کا قلم ہر طرف چلتا ہے۔ وہ ”غزل“ بھی کہتے ہیں اور ”نظم“ بھی اور دونوں اپنے رنگ کی ترجمہ کرتے ہیں تو ترجمے کو بھی ”اصل“ بنادیتے ہیں۔ وہی لہجہ، وہی سہاؤ جو اصل میں ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا حق صاحب نے کچھ مکتوبات اور پہیلیاں لکھیں اور ایسی لکھیں کہ حضرت امیر خسرو کی یاد تازہ ہوگئی۔ چھوٹے بڑے سب بوجھنے بیٹھ گئے اور گھنٹوں مزے لیتے رہے۔ نظر نہ کھنے پائے تو افسانے بھی لکھے اور خوب صورت مضامین بھی۔ لطف یہ کہ نثر بھی نظم کی طرح چٹخا رہے دار۔ جوڑھے زبان و بیان کا مزالے۔ اس بار وہ بچوں کے لیے مزید ان نظموں کا دل فریب تحفہ لے کر آئے ہیں۔ ”سہانے ترانے“ میرے سامنے رکھا ہے۔ میں نے ایک ایک نظم پڑھی۔ پڑھ کر دل بارغ بارغ ہو گیا۔ کئی نظمیں بچوں کو بلا کر سنائیں۔ سب نے لطف اٹھایا اور بچوں نے بھی مزے لے لے کر سنیں۔ ان میں وہ سب کچھ ہے جو بچے پسند کرتے ہیں۔ مشاہدات بھی ہیں، دل چسپ کہانیاں بھی۔ کہاوتوں کو بھی نظم میں ڈھالا ہے۔ معلومات بھی ہیں، پہیلیں بھی ہیں اور اٹھکھیلیاں بھی۔ ڈوٹوئیں ہیں بھی ہے اور لڑائی جھگڑا بھی، چٹخ پکار بھی، شور شرابا بھی۔ مہنسی مذاق بھی ہے، ادھیک گانشی بھی۔ ان نظموں کو پڑھ کر میلے کا سا سماں بندھ جاتا ہے۔ بہت عرصے بعد بچوں کی ایسی ہی نظمیں پڑھنے کو ملی ہیں۔ آپ بھی پڑھئے۔ لپٹے آئی آؤ کو بھی سنائیے اور آپا، باجی کو بھی، بھتیجا کو اور بھائی جان بھی۔ سب پسند کریں گے۔

قوم کے ادیب بڑھے بڑھے اور راہبر و راہنما بھی کہتے ہیں کہ بچے قوم کا مستقبل ہوتے

ہیں لیکن جیسے وہ اپنے مستقبل سے بے پرواہ ہو گئے ہیں اسی طرح بچوں کے مستقبل سے بھی ۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے لکھنے والے ہیں۔ سب ایک سے ایک طرسم خاں مگر کیا مجال کہ بچوں کا ذرا بھی خیال ہو۔ نہ ان کے لیے لکھنے میں نہ ان کے لیے سوچتے ہیں۔ کہے یہی جانتے ہیں کہ بچے قوم کا مستقبل ہوتے ہیں۔ ذرا ان کے کوئی بڑا تو پوچھے کہ قبلہ! آپ کی بات سراسر آنکھوں پر لیکن آپ نے خود بچوں کے لیے کیا لکھا ہے؟ بچوں کو تو روز ایک کتاب چاہیے۔ اچھی لکھی ہوئی، اچھی چھپی ہوئی، تصویروں اور خاکوں سے جڑی ہوئی۔ جن سے ان کی تربیت ہو۔ جنہیں پڑھ کر وہ سوچیں کہیں ان کی معلومات میں اضافہ ہو۔ ان کا ذہن کھلے اور مستقبل کے لیے وہ تیار ہو جائیں۔ آپ ان کے لیے کیا کرتے ہیں؟ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔ وہ تو بس خالی جمع خرچ کرتے ہیں۔ ہم تو جب جائیں کہ ہمارے سب لکھنے والے اپنے اور اپنی قوم کے بچوں کے لیے اچھی (جی کن ہیں نکھیں۔ اتنی کن ہیں کہ لائبریری یاں بھر جائیں اور بچے ان کو پڑھنے پر تامل جائیں۔ وہ کیسا اچھا زمانہ ہوگا کہ قوم کے سب بچے گاؤں، دیہات کے بچے، قصبوں، شہروں کے بچے سب ان کتابوں کو پڑھ رہے ہوں گے اور واقعی قوم کا مستقبل سنوڑ رہا ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ شان الحق صاحب اس ایک مجموعے پر بس نہیں کریں گے بلکہ بچوں کے لیے نہ صرف ڈھیر ساری نظمیں لکھیں گے بلکہ نثر میں بھی نئی نئی کتابیں لکھیں گے۔ معلومات کی کتابیں، سائنس کی کتابیں، کہانیوں کی کتابیں، ٹہنات کی کتابیں، سفر کی کتابیں، حالات زندگی کی کتابیں، اخلاق و روایت کی کتابیں، غرض کہ ہر طرح کی کتابیں جنہیں پڑھ کر بچے حقیقی صاحب کی لمبی عمر کی دعا مانگیں گے اور اچھے اللہ میاں بچوں کی دعائیں بہت سننے ہیں۔

نعت گوئی: احمد سہارنپوری

بچپن تھا اور میں گورنمنٹ ہائی اسکول سہارنپور میں پڑھتا تھا۔ اس زمانے میں شام کو کھیلنا بھی تعلیم کی طرح ضروری تھا۔ کھیل کے میدان میں باقاعدہ حاضری ہوتی تھی۔ جو نہ جاسکتا وہ درخواست دیتا ورنہ غیر حاضر ہونے پر جرمانہ ادا کرتا۔ شام کو گھر سے کھیل کے میدان جانے کے لیے نکلتا تو محلہ شاہ مدار راستے میں پڑتا۔ محلے میں ہائیں طرف ایک مکان تھا جس کے باہر کے دروازے پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ میرے ہم جماعت نے بتایا کہ یہاں ایک شاعر احمد صاحب رہتے ہیں۔ ایک دن میں اپنے والد مرحوم کے ساتھ بازار حارہا تھا کہ راستے میں ایک صاحب ملے۔ درمیانی سادہ گٹھا ہوا جسم، ساٹلا رنگ، گولی گول، بھرا بھرا چہرہ والا اس پر بڑی بڑی مونچھیں۔ شیر دانی پہنے ہوئے لیکن اس کے سارے بدن کھلے ہوئے جس میں سے باریک مٹل کا کرتا جھانگ رہا تھا۔ میں نے سلام کیا۔ انھوں نے جواب دیا۔ والد صاحب نے بتایا کہ احمد صاحب بہت اچھے شاعر ہیں اور بہترین نعتیں کہتے ہیں۔ والد صاحب اور احمد صاحب باتیں کرتے رہے اور میں انھیں دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اچھا! شاعر ایسے ہونے میں ادب کا چسکا مجھے بچپن سے تھا۔ اس زمانے میں بھی میں انچوں کے رسالے پھول ہوا، غنچہ، کاخ پر تھا اور پیسہ لائبریری لاہور کی کتابوں کی کتابوں سے منگوانا اور پڑھنا تھا۔ نئی کتاب مل جاتی تو گویا جنت کی کنی ہاتھ آجاتی۔ پھر یہ ہوا کہ جب بھی حضرت احمد سہارنپوری کہتے جاتے راستے میں مل جاتے تو میں انھیں ادب سے سلام کرتا اور وہ بڑی محبت سے جواب دیتے۔

میں بلی اے کا طالب علم تھا۔ یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے کہ حضرت احمد کا محبوبہ کلام

”ہلالا بیڑی کے ہم سے شائع ہوا اور میں نے اسی زمانے میں پڑھا۔ آسان زبان لیکن اخلاص و محبت کی ایسی گرمی کہ شعروں کو کپڑے لٹکتے تھے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے گہری عقیدت مسلمان گھرانوں کی تہذیب کا ایک حصہ ہے۔ محفل میلاد کا عام رواج تھا اور سہارنپور میں حضرت احمد سہارنپوری کا کلام نعت خوان نہایت خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ ان کا ”سلام“ تو اتنا مقبول تھا کہ ہر گھر میں میلاد کے موقع پر پڑھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ریڈیو کار وارج بھی عام ہو گیا تھا۔ ایک دن ریڈیو سن رہا تھا کہ اعلان ہوا ”اب حضرت احمد سہارنپوری اپنا کلام پیش کریں گے“ میں ہمت نہ ہونے لگا۔ انھوں نے بڑے اچھے انداز میں اپنی غزل سنائی۔ ریڈیو سے ان کے شعر سن کر میں ان کا اور قائل ہو گیا۔ کچھ دن بعد ملے تو میں نے غزل کی تعریف کی۔ بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے ”کیا آپ بھی کچھ کہتے ہیں؟“ بڑوں کے سامنے یہ کہنا کہ ”جی ہاں میں بھی کہتا ہوں“ اس زمانے میں بڑی بات بھی جاتی تھی۔ میں نے انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ نفرت تو کہتے تھے کہ آپ بھی شاعری سے شوق رکھتے ہیں۔ میں خاموش رہا۔

احمد صاحب غریب سہارنپوری کے شاگرد تھے اور حضرت قریشی احمد صاحب کے شاگرد تھے جو میرے عزیز دوست اشتیاق احمد قریشی کے قریبی عزیز تھے۔ چند سال ہوئے حضرت قریشی لاہور میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میں پر ابھی نظر تھی۔ استاد اذ شعر کہتے تھے۔ ۱۹۳۷ء تک حضرت احمد سہارنپوری سے گاہ بگاہ ملاقات ہوتی رہی۔ پھر میں پاکستان آگیا اور چند سال بعد معلوم ہوا کہ احمد صاحب وفات پا گئے ہیں۔ اتفاق کی بات دیکھیے کہ ۲۵-۲۶ سال بعد جناب ضبط سہارنپوری نے ایک مجموعہ کلام لاکر دیا اور مجھ سے کہا کہ اذرا و کرم اس پر مقدمہ لکھ دیجیے۔ یہ حضرت احمد سہارنپوری کا کلام ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اس نعتیہ کلام کو یہاں سے بھی شائع کیا جائے۔ کلام دیکھا تو ماضی کے درپے کھل گئے اور خوشبو بھری تازہ ہوا کے جھوکوں سے دل و جان محظوظ ہو گئے۔ پہنے بچپن کے مقبول و مشہور شاعر کا کلام اتنے عرصے بعد پڑھا تو معلوم ہوا کہ اچھا شعر ہمیشہ اچھا ہوتا ہے اور وقت کی گرد اس پر نہیں بیٹھتی۔ وہی تازگی وہی اخلاص کی جھلک وہی محبت کی گرمی اور عقیدت کا جوش اس میں محسوس ہوا۔ احمد سہارنپوری کا کلام عام رواج و رکی زبان میں لکھا گیا ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ اس میں

اخلاص کی وہ گرمی ہے کہ یہ عوام و خواص دونوں کے دلوں میں گھر کر رہتا ہے۔ اس میں ایسا سوز ہے جو دل عاشق میں ہوتا ہے اور اس سوز میں وہ دالہانہ کیفیت ہے جو سرشاری عشق سے پیدا ہوتی ہے۔ رسول اللہؐ کی محبت کے گیت جس نے گائے، عقیدت کے پھول جس شاعر نے چڑھائے اس کا کلام ہمیشہ کے لیے تازہ ہو گیا۔ حضرت احمد سہارنپوری اردو کے ان نعت گو شعرا میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں جنہوں نے عشق رسولؐ سے سرشار ہو کر ایسا نغمہ چھیڑا جس کی لے آج بھی سرشار کیے جاتی ہے۔ ان کا کلام ہم آج بھی محفل میلاد میں سننے میں اور بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ حضرت احمد سہارنپوری کا کلام ہے۔ وہ احمد سہارنپوری جو عاشق رسولؐ تھے، جو کوئے محمدؐ کے راہرو تھے، جو ساقی شرب کے مے خوار تھے، جو کالی کالی والے کی محبت میں سرشار تھے۔ اسی لیے ان کے اشعار میں وہ اثر آج بھی محسوس ہوتا ہے جو عشق کی آگ سے پیدا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ "ہلال شرب کی اشاعت" سے حضرت احمد سہارنپوری کا نعتیہ کلام نئی نسلوں تک پہنچے گا اور یہ کلام پاکستان میں لکھے جانے والے نعتیہ کلام کی روایت کا "پیش رو" کہلائے گا۔

(سمراست ۶۹۸۳ء)

قومی شاعری : منظرِ ایوبی

منظرِ ایوبی ہمارے معروف شاعر ہیں۔ ”تکلم“ کے نام سے ان کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۸۱ء میں اور شناخت کے نام سے دوسرا مجموعہ ۱۹۸۳ء میں شائع ہو چکا ہے اور اب قومی شاعری پر مشتمل تیسرا مجموعہ ”کلام“ چڑھتا چاند، ابھرتا سورج کے نام سے آپ کے سامنے ہے۔ منظرِ ایوبی، پختہ گو اور شائق شاعر ہیں۔ انھیں غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ حد درجہ حساس ہیں اور دل و درد مند بھی رکھتے ہیں۔ پاکستان ان کے لیے عشق بھی ہے اور حسرت بھی اور اسی وجہ سے ان کی شاعری میں خیر نی بھی ہے اور نفی بھی۔ یعنی اس لیے کہ پاکستان ان کے خوابوں کی سرزمین ہے اور وہ اسے وہ بنا رہا ہے جس کا خواب ان کی نسل نے دیکھا تھا۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں عدل و انصاف بھی ہو اور معاشی و معاشرتی مساوات بھی۔ یہی وہ سماجی شعور ہے جو منظرِ ایوبی کی شاعری میں اثر و تاثر پیدا کرتا ہے۔ پاکستان کو اپنے خوابوں کی حقیقی سرزمین بنانے کا یہی جذبہ ہمیں چڑھتا چاند، ابھرتا سورج کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ اس شاعری میں حب الوطنی کی سرشاری قدم قدم پر محسوس ہوتی ہے۔ یہاں ان کے خواب شاعری کے روپ میں داخل گئے ہیں۔

منظرِ ایوبی نے اپنے اس مجموعہ ”کلام کو ملی نغمے، رزمیہ نغمے، محنت کشوں کے گیت اور قومی نظمیں وغیرہ کے ذیلی عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔ ان عنوانات سے آپ اس مجموعے کے تنوع کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس مجموعے کی بیشتر نظمیں، نغمے اور گیت کورس میں لکائے جانے کے لیے لکھے گئے ہیں تاکہ شاعری کے ذریعے قومی آدرشوں، آرٹھوں، خوابوں اور حسرتِ وطن کو قوم کی گردنوں میں شامل کیا جاسکے۔ قومی شاعری ہمارے متعدد شاعروں نے کی ہے۔

اس شاعری نے دلوں کو گر مایا بھی ہے اور نئے نئے خواہوں کو جاگ بھی کیا ہے لیکن اس شاعری کا بہت کم حصہ ایسا ہے جس میں شاعرانہ جوہر بھی ہو اور معنویت بھی۔ سماجی شعور بھی ہو اور خواہوں کا اظہار بھی۔ منظر ابوبی کی شاعری میں یہ سب خصوصیات بیک وقت موجود ہیں۔

منظر ابوبی اپنی آر کے شاعر نہیں ہیں۔ جن شاعروں کی پی آر مضبوط اور تعلقات عامہ استوار تھے انھوں نے ریڈیو، ٹیلی وژن کی مدد سے اپنے نظموں اور گیتوں کی دھنیں بزمائیں اور انھیں مقبول عام بنانے کے لیے اس طرح کام کیا جس طرح صنعت کار اپنی اشیاء کی فروخت کے لیے منصوبہ بندی کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد صاحبانِ نظر ان نظموں اور گیتوں کی طرف بھی توجہ دیں گے تاکہ شاعری کے ذریعے قومی خواہوں کی فصل بونے کا کام سہل ہو سکے۔ زندہ قومیں اپنے قابل ذکر شاعروں کو پہچانتی ہیں اور میرا خیال ہے کہ منظر ابوبی صاحب ہمارے ایسے شاعر ضرور ہیں جن کو پہچانتا ہمارا تہذیبی فرض ہے۔ مجھے امید ہے کہ منظر ابوبی صاحب قومی شاعری کے اس عمل کو جاری رکھیں گے اور مختلف سماجی و اجتماعی مواقع و محل کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسے نئے اور گیت بھی لکھیں گے جنہیں مختلف اجتماعات، جلسوں، جلوسوں، کھیلوں، مقابلوں، مسمر، پک، ٹک اور جشن وغیرہ کے موقع پر کورس کی شکل میں گایا جاسکے تاکہ نئی نسل میں اتحاد و فکر اور یک جہتی کا عمل تیز ہو سکے اور یہ کورس گیت نظمیں ایسے مواقع پر ہمارے جذبات کی ترجمانی کر کے ہمارا تزکیہ (کی تھراپس) کر سکیں۔ اس قسم کے گیتوں اور نظموں کی میں منظر ابوبی میں غیر معمولی صلاحیتیں پاتا ہوں۔

(۶/۵/۸۵)

اردو گیت : ڈاکٹر بسم اللہ نیاز

زمانے کو کس نے روکا ہے۔ ایسے گزرتے جیسے آیا ہی نہیں تھا۔ نصرت کی آنکھ سے دیکھے توکل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ میں ایک طالب علم تھا اور دنیا نے اوپر میں کچھ کر گزرنے کے دلوں سے ہر دم سرشار رہتا تھا۔ سوتے جاگتے ہیں یہی دن تھی کہ مجھے ادیب بننا ہے۔ یہی منزل تھی اور یہی مقصود حیات۔ دن رات کتابیں پڑھنے یا علم و ادب کی باتیں کرنے میں گذر جاتے۔ ہر مہینے ادبی رسالوں کا اسی طرح انتظار ہوتا جیسے دیدار محبوب کا۔ رسالوں میں ماہنامہ ”نگار“ بھی آتا تھا۔ ”نگار“ میں بھیجی ہوئی ہر تحریر صحیفہ آسمانی معلوم ہوتی تھی۔ اسی زمانے میں اردو گیتوں پر ایک مضمون ”نگار“ لکھوں میں چھپا۔ لکھنے والی کا نام بسم اللہ نیگم تھا۔ یہ نام میں نے اس سے پہلے کسی نہیں سنا تھا۔ مضمون پڑھا تو اچھا لگا اور اس میں لکھی ہوئی باتیں ایسی دل میں اتریں کہ وہ آج بھی میرے شعور کے دھندلوں میں جگنو کی طرح چمک رہی ہیں۔ محترمہ بسم اللہ نیگم صاحبہ سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ترقی پسند تحریک اردو ادب پر چھائی ہوئی تھی۔ دامنِ جوہد، مظلومی فرید آبادی، آرزو لکھنوی، احتیاط جالندھری اور میراجی کے گیت بہت مقبول تھے اور یہ قدیم صنفِ ادب نئے شعور و احساس کے ساتھ نئے شعرا میں مقبول تھی۔ قدیم صنفِ سخن نے جب عہدِ حاضر کی روح کو لفظوں میں سمیٹا تو یہ نئے گیت گردشِ خون میں شامل ہو کر معاشرے کے دل کی دھڑکن بن گئے۔ یہ دور اردو گیتوں کی مقبولیت کا ایک نیا دور تھا۔ اسی زمانے میں محترمہ بسم اللہ نیگم صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔ وہاں پان ہی، سافولی سلونی، سن، انتہائی شائستہ خاتون۔ نرم لہجہ، دھیمی آواز لیکن ایسی صاف ککڑوں میں رس گھول دے۔ باتیں کریں تو پھول جھریا

اور احترام کرنے کو ہی چاہیے طالبات کی محبوب استاد۔ میری بہنیں بھی ان کی شاگرد تھیں۔ کوئی ان کی شفقت کا ذکر کرتا۔ کوئی ان کی قابلیت کے گن گاتا۔ کوئی کہتا اللہ ایسا اچھا پڑھتا ہے کہ علم و ادب کا ورثہ شاگردوں کے ذہن کے کوزے میں سما جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ برسوں سے گیتوں پر کام کر رہی ہیں اور دن رات اسی میں لگی رہتی ہیں۔ عمر عزیز کا بڑا حصہ بسم اللہ نیا صاحبہ نے اسی مقالے کی تیاری اور تصنیف پر لگا دیا۔ کراچی یونیورسٹی سے انھیں اس پر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی ملی اور اب برسوں بعد ان کا یہ کام کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ لگن کے ساتھ اتنی محنت کم لوگوں نے اپنی تصنیف پر کی ہوگی اور اسی وجہ سے یہ ایک ایسی تصنیف ہے کہ اس موضوع پر آئندہ جو کئی کام کئے جائیں گے ان کے لیے بسم اللہ کی کتاب کو نظر انداز کر لے کی حرات نہیں کر سکے گا۔ یہ کتاب گیت کے موضوع پر ادب میں یقیناً ایک اہم اضافہ ہے۔

اس تصنیف کی بڑی خوبی یہ ہے کہ پروفیسر بسم اللہ صاحبہ نے اپنے موضوع کا کوئی گوشہ تشہ نہیں چھوڑا۔ ایک طرف انھوں نے گیتوں کو بزرگوں کی تہذیب و معاشرت سے ملا دیا ہے اور دوسری طرف ان کی ادبی و تخلیقی اہمیت بھی واضح کی ہے۔ اپنے موضوع کی تلاش میں انھوں نے سارے قدیم و جدید ادب کو کھنگالا ہے اور فائدہ و ذرہ جمع کر کے سلیقے سے اس مواد کو ایک خوب صورت مجملے کی صورت میں گوندھ دیا ہے۔ فاضل مصنف نے پورے مقالے کو جس طور پر مرتب کیا ہے اور جس طرح ابواب بندی کی ہے اس سے پوری کتاب منطقی ترتیب کے ساتھ اپنے پڑھنے والوں سے کلام کرنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر بسم اللہ نے جہاں رجحانات و میلانات کا تجزیہ کیا ہے وہاں گیت نگاروں کے گیتوں کا تنقیدی مطالعہ بھی تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور ذہنی دیانت داری کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ میراجی کی کوشش کو سچی ناکام کہتی ہیں۔ آپ ان کی رائے سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اسے بے وزن نہیں کہہ سکتے۔

اس تصنیف کا اسلوب بھی سادہ اور دل نشین ہے۔ ڈاکٹر بسم اللہ نے علمی مباحث کو عام بول چال کی معیاری زبان میں اختصار کے ساتھ اس طرح سمیٹا ہے کہ پڑھنے

والا پوری کتاب کو دل چسپی کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف پر میں پروفیسر
 ٹو اکسٹر بسم اللہ نیاز صاحبہ کو دل مبارک باد دیتا ہوں اور ساتھ ساتھ ایک فرمائش بھی کرتا
 ہوں کہ ایک اور جلد میں وہ ان تمام گیتوں کو بھی یکجا و مرتب کر دیں جو دوران تحقیق انھوں
 نے جمع کیے ہیں۔ یہ ایک بڑی خدمت ہوگی ورنہ یہ قیمتی سرمایہ ضائع ہو جائے گا اور کوئی
 دوسرا اس گنن کے ساتھ انھیں پھر جمع نہیں کر سکے گا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تصنیف دنیا کے
 ادب میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جائے گی اور صاحبانِ علم پروفیسر بسم اللہ کو ان کے
 اس کارنامے پر خراجِ نیاز پیش کریں گے۔ یہ

(۱۹۸۵ء)

جدید مرثیہ : ڈاکٹر یاور عباس

سفر لباً اور منزل دور ہو تو بچے مڑ کر دیکھنے کی فرصت کہاں اور کسے ہوتی ہے؛ لیکن ایک دن، جب ڈاکٹر دلاور عباس اپنے بچے ڈاکٹر یاور عباس کے ساتھ آئے تو میں نے محسوس کیا کہ عمر رفتہ آواز دے رہی ہے۔ بچے مڑ کر دیکھا تو یادوں کے بے شمار چراغ تاحہ نظر ٹٹھا رہے تھے۔ ان چراغوں کی روشنی میں بعض چہرے صاف نظر آ رہے تھے اور بعض اتنے دھندلا گئے تھے کہ پہچانتا بھی مشکل تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یادوں کے پوشیدہ مکان کی دہلیز پر یہودی مالک مکان اتنی پانچو مارے بیٹھا ہے اور مکان کے اندر اور مکان کے باہر دور دور تک چراغ ہی چراغ ٹٹھا رہے ہیں اور میں تپتے ہوئے صحرا میں بارش کا منتظر ہوں۔

رٹیہ یو پاکستان کراچی کے سلسلے "سجد منزل" میں ڈاکٹر یاور عباس مرحوم اپنے سرخ و سفید رنگ اور سفید بالوں کے ساتھ مریضوں کے ہجوم میں میز پر جھکے ہوئے نسخے لکھ رہے ہیں۔ ایک میز پر ان کے بیٹے ڈاکٹر یاور عباس بیٹھے ہیں اور مریضوں کو دیکھ رہے ہیں اور ایک کمرے میں ڈاکٹر دلاور عباس ناک پر لگی ہوئی چھوٹی سی عینک کے بالائی حصے سے شمس زمیری کو دیکھ کر کوئی فقرہ چست کر کے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ عباس بالی کلیٹک میں گیا گئی ہے۔ آنے جانے والوں کا ناتا بندھا ہے۔ مریض اور بیماریاں ہیں۔ دوست احباب بھی ہیں اور شاعر و ادیب بھی۔ وہ ہر جوہر گری یا سردی ہو۔ چائے سے خاص خاص احباب کی قواضیح ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر یاور عباس کے پاس مریضوں کا جھگڑا ہے۔ جب فرصت ہوتی ہے تو وہ آٹھ کمرے پاس آتے ہیں، شگفتہ چہرے اور مسکراتے ہوئے ہونٹوں اور محبت کی سنحاس کے کاغذوں میں رس گھول دیتے ہیں۔ کونا سادہ بھرا بھر جسم سیاہ رنگے ہوئے بال

بالوں میں تیل اور احتیاط سے جی ہونے مانگ، کھٹکا ہوا گندی رنگ۔ چوڑا سینہ اور سینے میں انسانی
محبت سے سمور، دھڑکن ہوا دل، شریف النفس اور نکسر المزاج، باتیں ایسی کدول گئے، اہجہ
ایسا کہ اپنائیت کی روشنی سارے وجود میں پھیل جائے۔ بات بات میں شعر و شاعری بہت اچھے
طیب بہت اچھے غزل گو اور بہت اچھے مرثیہ نویس رہیں شاہد احمد دہلوی، شمس زہری،
کرار ڈوی، ارم نکھنوی، سلیم احمد، ڈاکٹر صفدر حسین، جوش ملیح آبادی، استاد قمر جلالوی، امید فاضلی
سید آل رضا، ذوالفقار بخاری اور شہر کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں سے ملاقاتیں
ہوئیں۔ جیسے آزادی سے پہلے کتب خانہ علم و ادب دلی میں ادیبوں کا مرکز تھا، اسی طرح
”عباس پولی کلینک“ کراچی شہر میں ایک ایسا مرکز بن گیا تھا جہاں ذرا دیر بیٹھنے کو کوئی نہ
کوئی شاعر یا ادیب دیاں مزدور مل جاتا۔ ڈاکٹر یار عباس شہر میں ہونے والے خاص خاص
مشاعروں میں عام طور پر شرکت کرتے۔ غزل پڑھتے اور خوب داما پاتے۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر یار عباس نے ایام فخر میں اپنے گھر پر مجالسِ مراثی کا اہتمام کیا
اور کم و بیش ہر قابل ذکر شاعر نے ان مجالس کے لیے ہر سال نیا مرثیہ لکھا۔ ان مشاعروں میں
جوش ملیح آبادی اور آل رضا بھی شامل تھے اور نسیم امروہوی اور امید فاضلی بھی۔ اور خود
ڈاکٹر یار عباس بھی مجھے یاد ہے کہ وہ ہر سال کم از کم ایک نیا مرثیہ ضرور لکھتے اور اہل علم و ادب
کے سدا روشن چراغوں کی اسی محفل میں سناتے۔ محفل میں بڑے دھرنے کی جگہ نہ ہوتی۔ یہ
محفلیں یادگار محفلیں تھیں۔ اگر ان محفلوں کی داستان لکھی جائے تو شہر کراچی کی علم پروری
روشن ہو جائے اور لوگوں کو پتا چلے کہ ڈاکٹر یار عباس نے کس طور پر برسوں اس شہر میں شعر و
ادب کا نور پھیلا دیا ہے۔

اب نہ ڈاکٹر یار عباس ہیں اور نہ جوش ملیح آبادی، سید آل رضا اور ذوالفقار بخاری کی اللہ
کو پیارے ہو گئے۔ استاد قمر جلالوی اور ارم نکھنوی بھی اس جہان سے گزر گئے، لیکن اس دور کی
یاد اور ان محفلوں کی زندگی اب بھی میرے وجود کو تازہ دم کیے ہوئے ہے۔ جب تک ڈاکٹر
یار عباس زندہ تھے یہ محفلیں ہر سال سبقتی تھیں اور اب میخانہ حیات ویران ہو گیا ہے لیکن
یار عباس مرحوم کا کلام اب بھی تازہ اور زندہ ہے جو ان کے لائق بیٹے ڈاکٹر رضا عباس کے ہاتھوں

شائع ہو کر سامنے آتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ ہر سال ان کی برسی کے موقع پر ان کے مرثیوں کا ایک مجموعہ ضرور شائع کریں گے اور پھر ان کی غزلیات کا مجموعہ بھی اسی عرصے میں شائع کریں گے۔ ایک سعادتمند بیٹا اپنے باپ کے نام کو روشن و زندہ رکھنے کے لیے یہی کر سکتا ہے اور یہی انھیں کرنا چاہیے۔ اس طرح صاحبانِ علم کو معلوم ہو سکے گا کہ ڈاکٹر یاور عباس غزل گوئی حیثیت سے کتنے بلند پایہ شاعر تھے اور جدید مرثیہ گوئی کی تاریخ میں ان کا کتنا اہم و بلند مقام ہے؟

ڈاکٹر یاور عباس کے مرثیوں میں موضوع سخن تو یقیناً واقعات کر بلا ہیں لیکن انھوں نے ان واقعات کو دورِ حاضر کی روح سے اس طور پر پیوست کر دیا ہے کہ ان کے مرثیوں میں ہماری روح کی آواز اور باطن کا کرب شامل ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مرثیے پس منظر کرتے ہیں اور ہماری روح میں اتر جاتے ہیں۔ ان مرثیوں کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ یاور عباس مرحوم کو زبان و بیان پر کتنی قدرت حاصل تھی اور یہ قدرت بیان ہمارے دور میں کتنے شاعروں کو حاصل ہے؟ ڈاکٹر یاور عباس کے مرثیوں کی زبان کو شکر و تسنیم میں دھل ہوئی ہے۔ لفظوں کی ترتیب میں ایسا سلیقہ موجد دے جو زبان پر قدرت اور مسلسل مشق و ریاض کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اسی سلیقے سے وہ لہجہ پیدا ہوا ہے جس میں شمس بھی ہے اور اثر آفرینی بھی۔ دل گدازی بھی ہے اور جادو بیانی بھی۔ یہ مرثیے ان کی روح کی گہرائیوں سے نکلے ہیں اور سُسنے اور پڑھنے والوں کی روح میں اتر جاتے ہیں۔ ان مرثیوں کی اشاعت تاریخِ مرثیہ میں یقیناً ایک اضافہ ہے اور میرا خیال ہے کہ صاحبانِ علم و ادب ان مرثیوں کو پسند کریں گے اور مرحوم کی شاعرانہ صلاحیتوں کی دل کھولی کراؤ دیں گے۔ خدا مرحوم ڈاکٹر یاور عباس کی مغفرت فرمائے اور فردوسِ بری میں درجہِ بلند عطا فرمائے۔ آمین۔

(۲۶ مئی ۱۹۸۸ء)

سلیم احمد کے بارے میں

یکم ستمبر ۱۹۸۳ء کی شام کو جب سلیم احمد کے جسمِ خاکی کو زیرِ زمین آرام کرنے کے لیے قبر میں آگارا جا رہا تھا تو مغامیس نے محسوس کیا کہ ماضی کے دیچے کھل گئے ہیں اور گزیرے دنوں کے منظر ایک ایک کر کے تیزی کے ساتھ نظروں کے سامنے آ رہے ہیں۔

میں نے اور سلیم احمد نے اپنے ادبی سفر کا آغاز میرٹھ ہاسٹی میں کم و بیش ایک ساتھ کیا تھا۔ میرٹھ جس کی طویل تاریخ ماضی کے دھندلکوں میں گم ہے۔ وہ میرٹھ جہاں رادان کی سسرال تھی۔ وہ میرٹھ جسے اندر پرستوں کی تعمیر کے محلے میں پانڈؤں کے سب سے بڑے بھائی پدھستر نے ماہی نامی مہار کو، جاگیر کے طور پر، دیا تھا اور جہاں اس نے اپنا محل تعمیر کیا تھا۔ اس محل کے آثار آج تک اندر کوٹ نامی محلے میں پائے جاتے ہیں۔ جہاؤں کی روایت کے مطابق، یہاں جہاں آٹھ گوت آباد تھی اور یہی جہاں آٹھ بگڑکر میرٹھ ہو گیا۔

آج بھی اس پورے علاقے میں جہٹ کثرت سے آباد ہیں۔ یہ وہی میرٹھ ہے جو اس زمانے میں غزنویوں کی سلطنت میں شامل تھا جب لاہور اُن کا دار الحکومت تھا۔ فتح دہلی کے بعد قطب الدین ایبک نے غیاث الدین بلبن کو میرٹھ کا حاکم مقرر کیا تھا جس کی ایک مسجد کے آثار گڑھ مکیش شریں آج بھی موجود ہیں۔ اسی میرٹھ میں میری اور سلیم احمد کا ملاقات ہوا۔ ہم دونوں ایف۔ اے کے طالب علم تھے اور ادب کی دنیا میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ دن رات یہی اوڑھنا، پھونانا تھا۔ یہی موضوعِ سخن تھا اور یہی مقصدِ زندگی تھا۔ ہم دونوں نئی کتابیں پڑھتے، تبادلہ خیال کرتے اور گفتگوں انھیں مسائل میں گم رہتے۔ سلیم احمد اس وقت میرٹھ کے نوجوان شعراء میں سب سے ممتاز تھے۔ بہتر

تخلص کرتے تھے اور اقبال کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ”دائرۂ ادبیہ“ کے ایک جلسے میں، جو ہر سہفتہ فیض عام کالج میں ہوتا تھا، سلیم احمد نے ایک نظم سنائی تھی جس کا ٹیپ کا مصرع ”انقلاب، اے انقلاب، اے انقلاب“ تھا۔ یہ نظم اتنی پسند کی گئی تھی کہ ساری محفل تجسم واہ واہ سبحان اللہ بن کر رہ گئی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ دائرۂ ادبیہ کے ایک اور جلسے میں سلیم احمد نے جب ایک غزل سنائی تو لوگ حیرت زدہ رہ گئے اور اس شعر پر تو وہ بے ساختہ داد ملی کہ کچھ بھی وہ آوازیں میرے وجود کا حصہ ہیں :-

زمین والوں کی مشکلوں کو سمجھ سکیں گے دُش والے

کہ آسمان سے زمیں کے اوپر نگہ پڑتی ہے طائرانہ

اس زمانے میں سلیم احمد اور میں بے قرار روحوں کی طرح، سارے میرٹھ شہر کے گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے تھے۔ میرٹھ کالج کے پوسٹل سے بہتاد احمد الدین کی لال کوٹلی تک، وہاں سے بگم پل، خیرنگر، کنیوہ دروازہ، رشید چائے والے کی دوکان، کبھی کوٹلی جنت نشان کی طرف، کبھی ذاب اسماعیل خان کی کوٹلی کی طرف، کبھی رزمی صدیقی کے ہاں پروفایا من علی جہان ایلی جنوں والے ماسٹر روپی سے ملاقات ہوتی اور کبھی بھینسا کی گراؤنڈ اور نادر علی بلڈنگ، جہاں حکیم فرخ آبادی کا مطب تھا اور جہاں سلیم احمد کا گھر بھی تھا۔ کبھی سی پٹ بازار یا وپلی بازار سے ہوتے، گزدی سے گزرتے قاری محمد یونس کے گھر۔ اس تمام عرصے میں کسی نہ کسی ادبی موضوع پر گفتگو ہوتی رہتی اور یوں معلوم ہوتا کہ ہم جلد ہی کائنات کے راز بلے سر بستہ دریافت کر لیں گے۔ اسی اثنا میں کام کے منصوبے بنتے۔ نئی تحریروں پر بات ہوتی۔

گرمیوں کے موسم میں ہم جہاں سے گزرتے جمیلی، موتیا اور پیلے کی خوشبوؤں سے گلی کو چھچکے ہوتے۔ چاندنی راتوں میں رات کی رانی کی جھک قدم قدم پر تازہ دم کرتی۔ یہ خوشبوئیں آج بھی مشام جان کو معطر کیے ہوئے ہیں۔ ادب اور شعر و شاعری اس شہر کی روح میں اسی طرح شامل تھے جس طرح نذرِ پستی کرج ہماری روح میں شامل ہے۔

اسی ادب پر ور ماحول اور اسی تخلیقی فضا کا اثر تھا کہ فرزند اب میرٹھ نے اردو ادب میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ آج ان کے نام تاریخ ادب کا حصہ ہیں۔ اسماعیل میرٹھی، اکبر وارثی، محمد حسن عسکری، ڈاکٹر شوکت سبزواری، خلیق احمد نقاشی، پروفیسر کرار حسین، انتظار حسین، سلیم احمد، شمیم احمد، عالم تاب تشنہ، احمد ہدایتی، امید فاضلی، قیصر زیدی، ڈاکٹر صفدر حسین، حفیظ میرٹھی، منتخب جارجی، یوم میرٹھی، حامد اللہ افسر، سافر نقاشی، ندرت میرٹھی، وہ چند نام ہیں جن کے کاموں سے ہم سب واقف ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ اپنی زندگی کے اسی زمانے میں سلیم احمد اور میں روز ایک افسانہ لکھتے۔ کبھی کرشن چندر کے رنگ میں، کبھی عصمت چغتائی، منٹو کے رنگ میں اور کبھی ناصر علی دہلوی کے رنگ میں ادب لطیف تخلیق کرتے۔ روزانہ شام کو بے مقصد سڑکوں پر گھومتے ہوئے کسی پڑکے میچے یا کپڑے یا رخ کے سرسبز و شاداب لان پر بیٹھ کر اپنے اپنے افسانے پڑھتے، ان پر تبادلہ خیال کرتے اور اگلے افسانے کی تیاری میں لگ جاتے۔ دو تین سال کے عرصے میں ہم نے سینکڑوں افسانے لکھے اور بے شمار کتابیں پڑھیں۔ اس کا دوش سے لکھنے کی مشق ہو گئی اور ادب کا ذوق سنور گیا۔

سلیم احمد کی وفات نے ماضی کے نہاں خانے میں جو در کچھ کھولا ہے اس سے یادوں کی برات اُتر آئی ہے۔ بہت سے دھواں دھواں چہرے صاف نظر آ رہے ہیں۔ گرم شدہ واقعات کے سرے دوبارہ ہاتھ میں لگئے ہیں۔ اسی زمانے میں تحریک پاکستان نے زور پکڑا، سلیم احمد نے خاکساروں کا ہیلو سنبھال لیا اور میں لیاقت علی خان کے ایکشن میں مصروف ہو کر قرب و جوار کے گاؤں دیہات کے دوروں پر نکل گیا۔ اس دور میں تصور پاکستان نے ادب کی جگہ لے لی تھی۔ میں نے ایک پمفلٹ لکھا جس میں دو قومی نظریے کی وضاحت کے ساتھ پاکستان کی معاشی خوش حالی کو بیان کیا گیا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بن گیا اور ہم میرٹھ سے کچھ دُور جیب دوبارہ ملے تو کراچی میں تھے۔ وہ کراچی جو پاکستان کی شہرِ رگ ہے۔ جہاں ہم نے اپنی تعلیم پوری کی اور زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا اور وہیں جو آج ہم نظر آتے ہیں۔

سلیم احمد اب ہم میں نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنا سفر سب سے پہلے طے کر لیا۔ میرٹھ میں بھی وہ مقبول اور ہر دل عزیز بن گئے اور کراچی میں بھی وہ سارے شہر کے محبوب تھے۔ زندگی ہی میں برادر مظلوم صاحب نے کہا تھا کہ وہ ان کا مجموعہ کلام شائع کریں گے لیکن کسے معلوم تھا کہ وہ کام جس کا آغاز مظلوم صاحب نے سلیم احمد کی زندگی میں کیا تھا، ان کی وفات کے بعد پورا ہو گا۔ اکالی، تنظیم احباب میرٹھ کی طرف سے شائع کی جا رہی ہے لیکن دامے درمے قدمے اس کی اشاعت کا سہرا مظلوم صاحب نے صاحب کے سر ہے۔ تنظیم احباب میرٹھ دراصل میرٹھ کالج اور فیض عام کالج کے ان سابق طلبہ کی ویسی ہی ایک انجمن ہے جیسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن ہے۔ یہ ایک ثقافتی انجمن ہے جو علم ادب اور تعلیم و تہذیب کی اس شمع کو روشن رکھنا چاہتی ہے جو ہمیشہ سے فرزند ان میرٹھ کا طرہ امتیاز رہا ہے تاکہ یہ روشنی اسی طرح پاکستان کے در و بام کو بھی منور کرتی رہے جس طرح کسی میرٹھ کے در و بام کو روشن کرتی تھی۔

سلیم احمد کا تخلیقی سفر جو میرٹھ میں شروع ہوا تھا کراچی میں اس وقت انجام کو پہنچا جب ان کی تخلیقی قوت اپنے شباب پر تھی۔ سلیم احمد نے شاعری میں، ڈرامے میں، فکر و تنقید میں، صحافت میں وہ کارنامے انجام دیے جن کا اثر عہد حاضر پر گہرا پڑا ہے اور جن کا رشتہ آنے والے زمانے سے بھی گہرا ہے۔ اکالی، سلیم احمد کی شاعری کا ایک اہم مجموعہ ہے جس میں ان کی غزل کا منفرد دلچسپ اور آہنگ و اسلوب متعین ہو جاتا ہے۔ یہ وہ مخصوص لہجہ ہے جس نے غزل کی روایت میں اضافہ کیا ہے اور جو تاریخ غزل میں سلیم احمد کی پہچان ہے۔

(۱۹۸۵ء)

صبا اکبر آبادی کی غزل

صبا صاحب اردو کے ان چند اہم شاعروں میں سے ایک ہیں جنہیں دنیائے ادب میں وہ مقام اب تک نہیں مل سکا جس کے وہ اپنی قادر الکلامی اور شاعرانہ جوہر کے باعث بہرہ ورجہ مستحق ہیں۔ عمر عرب کے اس حصے میں جب عام طور پر تخلیقی سوتے خشک ہونے لگتے ہیں اور شاعری و ریش بن کر رہ جاتی ہے، صبا صاحب کا دیرپائے زیست اسی تخلیقی توانائی کے ساتھ کبھی بھراؤں پہر رہا ہے۔ ان کا کلام پڑھ کر لیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ گذشتہ ۲۵ سال سے اپنے بہترین تخلیقی دور سے گذر رہے ہیں۔ اللہ کے پاس کہنے کے لیے بھی ہے اور کہنے کا سلیقہ و شعور بھی ہے۔ وہ اس عظیم روایت زبان اور اس مخصوص نوری لہجہ کے وارث ہیں جس نے تیسرا جہان جہاں اور غالب جیسے شاعروں کی صورت گیری کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے لہجے میں زور، ان کے اظہار میں توانائی اور بیان میں وہ تو مندی ہے کہ ان کی شاعری ہمارے باطن کے نہاں خانوں میں اتر جاتی ہے۔ میں اس بات کو آج پھر کہنا چاہتا ہوں کہ اگر صبا صاحب اکبر آبادی نہ ہوتے تو ایسی شاعری ہرگز نہیں کر سکتے تھے جیسی انھوں نے کی ہے۔ اور اس بات کے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اکبر آبادی جو تاج محل کا مسکن ہے اور جسے عرف عام میں اگر کہتے ہیں، بر عظیم کی دو قدیم زبانوں کے دریائے اثر کے سنگم پر واقع ہے۔ وہ دریا جو دہلی میں بہتا ہے وہی دریا اگرے میں بھی بہتا ہے۔ اس کے راستے میں ایک مقام پر سنگسرخ کا بنا ہوا دہلی کا قلعہ معلیٰ ایستادہ ہے اور تقریباً دو سو میل کی مسافت کے بعد ایک اور مقام پر سنگ مرمر کا تاج محل سینہ کائنات بن کر اہل نظر کو دعوتِ نظارہ دے رہا ہے۔ اکبر آباد کا سراجِ مگب شروع اور سنگ سفید کے امتزاج سے

ہنا ہے۔ یہ علاقہ ایک طرف گوپیوں والے کرشن کنھیا کی موسیقانہ لے کا وارث ہے اور دوسری طرف برہم بھاشا کی شیرینی کا بھی حامل ہے۔ ساتھ ساتھ کھڑی بولی کی ترقی یافتہ صورت یعنی اردو زبان کا ایک اہم مرکز بھی ہے اور اسی لیے اس کی تہذیبی و لسانی اہمیت ہمیشہ باقی رہی ہے اور اسی لیے اہل اکبر آباد ہمیشہ احساسِ فتحکد سے سرشار رہے ہیں۔ دونوں زبانوں کا تہذیبی سنگم ہونے کی وجہ سے اہل اکبر آباد کی زبان بھی دوسرے علاقوں کی زبان سے زیادہ دلکش اور موثر رہی ہے۔ اگر محمد تقی میر اکبر آبادی نہ ہوتے تو وہ ایک طرف اپنی شاعری کی زبان کو وہ مزاج نہیں دے سکتے تھے جو انھوں نے دیالوہ دوسری طرف وہ لہجہ وجود میں نہیں آ سکتا تھا جو میر کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کی زبان کے لہجے میں برہم بھاشا اور ادھی کا وہ لونی، وہ موسیقیت اور وہ تاثیر اسی طرح از خود مل ہوئی ہے جس طرح پانی میں آکسیجن موجود ہوتی ہے۔ یہی اثر آپ غالب کی شاعری کے آہنگ میں محسوس کر سکتے ہیں اور یہی اثر نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے لہجے اور آہنگ میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہی اثر مجھے صبا اکبر آبادی کے پاس واضح طور پر محسوس ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ان کی شاعری کا آہنگ و لہجہ اردو شاعری کی عظیم روایت کا حصہ ہے۔ ان لسانی و تہذیبی اثرات کے شعور کے بغیر آپ صبا اکبر آبادی کی شاعری کی انفرادیت کے لطیف اندوز نہیں ہو سکتے۔ ان کی زبان سادہ ہے لیکن اس سادگی میں جو پرکاری ہے اور اس سادگی و پرکاری سے جو لہجہ بنا ہے وہ اکبر آباد کے لسانی و تہذیبی مزاج ہی کی دیہا ہے۔ یہ بات جو میں نے کہی ہے دراصل ذرا سی وضاحت چاہتی ہے اور اس وضاحت کے لیے میں آپ کو صبا صاحب کے دو چار شعر سنانا چاہتا ہوں :

ماہیت پر کسی کی غور نہ کر

جو نظر آئے بس وہی ہے میاں

موت وہ ڈھیٹ بھکارن ہے کہ جہاں لپٹے کو
لاکھ چاہیں کہ نہیں کئے مگر آتی ہے

کیا مدتِ ہجر دو گھنٹی ہے
یہ قبر کی رات سے بڑی ہے

جیتے جی تک شغلِ سیم تھا یہی
مرنے مرتے نامِ تیرا ہی لیا

اُس بار گلو ناز کا اعمار دیکھنا
میں چپ رہا تو دستِ دعا لے لگا

ملنے کہاں ہیں ایسے محنت رسیدہ لوگ
کرتے رہو ہماری زیارت کبھی کبھی

ابھی تو قافلہٴ خاک و خوں بھی گزرے گا
ابھی تو صرف چمن سے بہار گزاری ہے

کسی بندے کی خدائی ہو تو اُس سے پوچھیں
کتنے دن لگتے ہیں بندے کو خدا ہونے تک

دل آئینہٴ شبلی، محبوب آئینہ
کھویا ہے عکسِ سلسلہٴ انکاس میں

بھڑکتے تنہائیوں کا میلہ ہے
آدمی۔ آدمی اکیلہ ہے

بظاہر اس سادہ لہجے میں فقیرانہ بے نیازی کی ایک نرم سی کیفیت کے ساتھ ایک ایسی تیزی بھی چھپی ہوئی موجود ہے جو دل میں اتر جاتی ہے۔ نرمی اور تیزی کے اسی امتزاج سے وہ لہجہ بنا ہے جو صبا صاحب سے مخصوص ہے۔ یہی لہجہ ان کی شناخت ہے۔

صبا صاحب نے اردو غزل کی تاریخ میں جو کچھ کہا ہے وہ اردو غزل کی روایت سے پوری طرح وابستہ رہ کر کیا ہے۔ انھوں نے بعض شاعروں کی طرح روایت سے دامن بچانے کی کوشش نہیں کی بلکہ روایت میں عصر حاضر کے مزاج کو شامل کر کے اسے بدلا بھی ہے اور وسیع بھی کیا ہے۔ اس میں نئی حیثیت کو سمجھایا گیا ہے اور اپنے تجربات و مشاہدات کا اظہار بھی کیا ہے۔ اسی لیے صبا صاحب کی غزل ایک باشعور شاعر کے احساس زیست کا زندہ اظہار ہے اور اسی لیے ان کے شعر ہمارے دلوں کی ترجمانی کر کے ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ ان کی غزل میں ماضی بھی محفوظ ہے اور حال بھی لیکن حال ماضی بن کر نہیں بلکہ ماضی حال بن کر محفوظ ہوا ہے۔

اردو غزل کی روایت میں لاتعداد شاعروں نے شعر کہے ہیں لیکن کتنے شاعر ہیں جنھوں نے اس روایت کو گنگے بھی بڑھایا ہے اور میرا خیال ہے کہ صبا اکبر گاہوی دوبرہ حاضر کے غزل گو یوں میں اسی لیے ممتاز ہیں اور اسی لیے وہ ہماری ادبی تاریخ کا حصہ ہیں!

لے ناقدانہ عیب و ہنر احتیاط سے

میری متاب عیب ہی بہن ہنر نہ ہو

(۱۴ فروری ۱۹۸۵ء)

فارسی رباعیات غالب کا اردو ترجمہ

اب تو ہواؤں کا ٹرخ بدل گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب فارسی زبان ہمارا اڑھتا بچھوتا تھی۔ بچوں کی تعلیم کا آغاز جب تک اینڈ جل وینٹ اپ دی بل کے بھائے گلستان بوستان سے ہوا تھا لوگ شوق کے فارسی پڑھتے تھے۔ فارسی اشعار اور فارسی ضرب الامثال چشمہ شیریں کی طرح زبان سے رواں تھیں۔ بزرگ عظیم پاک و ہند کی مسلم تاریخ اور کم و بیش ساری علمی و ادبی میراث اسی زبان میں محفوظ تھی اور آج بھی محفوظ ہے لیکن فارسی زبان کے عدم رواج نے اس میراث کو ہمارے لیے بے معنی بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آج اپنی تاریخ کی صحیح ترجمانی سے قاصر ہیں۔ جو انگریزوں نے لکھ دیا ہمارے لیے مستند ہو گیا اور آج انھیں حوالوں سے ہم اپنی تاریخ کو پہچانتے ہیں اور اسے بے مایہ و حقیر جانتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمیں اپنی چیزیں کم تر اور اپنی میراث بے وقعت نظر آتی ہے۔ غور کیجیے کہ اٹھارویں صدی عیسوی تک ہمارا جو کچھ ادبی، علمی، تہذیبی و تاریخی سرمایہ تھا وہ زیادہ تر فارسی زبان میں تھا اور آج ہم فارسی زبان سے کم و بیش ناواقف ہیں۔ ماضی سے ہمارا رشتہ کم زور ہو گیا ہے اور اسی وجہ سے ہماری جڑیں کھوکھلی ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہی صورت حال دی تو مجھے یقین ہے کہ ہم اسی طرح تیسرے بلکہ چوتھے درجے کی قوم بن کر راہ حیات کو طے کرتے رہیں گے۔ بہر حال جب میری قوم نے یہ طے کر لیا ہے کہ اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنی میراث کو ترک کر کے بیرونی تہذیب کو اپنانے لگی تو پھر میں اور آپ کیا کر سکتے ہیں۔ ہم تو زیادہ سے زیادہ بقول اکبرؒ

نیک و بد حضور کو سمجھائے ملتے ہیں

حضرت صبا اکبر آبادی کو بھی میری طرح یہی خلش تھی اور اسی لیے انھوں نے

غالب کی فارسی رباعیوں کا اردو میں ترجمہ کیا تاکہ ہندو چٹے کاٹنے کھول دیں اور اہل ذوق کی تشنگی دور کرنے کا سامان مہیا کر دیں۔ غالب ہمارا عظیم شاعر ہے۔ ایک ایسا شاہ جو مسلم تہذیب کی علامت بن گیا ہے۔ وہ آج بھی ہمارا ایسا شاعر ہے جو مختلف موڑوں پر زندگی کے مختلف تجربات کے دوراں ہوں پر ہمارے جذبات و احساسات کی ترجمانی کر کے ہمیں تازہ دم کرویتا ہے۔ غالب کا اردو کلام بلاشبہ لافانی ہے لیکن اس کا فارسی کلام بھی اردو ہی کی طرح لافانی اور بے مثل ہے۔ اس کا اپنا لہجہ اور اس کا اپنا رس ہے لیکن ہم فارسی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر اس سے لطف اٹھانے کی اہلیت ہی گنوا بیٹھے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے علمی، ادبی، تہذیبی و تاریخی سرمائے کو اردو میں منتقل کریں تاکہ ہندو قلعے کا دروازہ کھل جائے اور ہم اپنے ماضی کی میراث سے اپنا حقیقی تہذیبی رشتہ قائم کر سکیں۔ حضرت صہابہؓ آبادی نے کئی سال پہلے عمر خیام کی رباعیات کا اردو ترجمہ کیا تھا اور ایسا کیا تھا کہ ترجمے میں کمرورج کی کلی کھل اٹھی تھی اور اب غالب کی ۱۰۴ رباعیات کا اردو ترجمہ کر کے ایک اہم اور قبیح کام کیا ہے۔ غالب نے فارسی میں ۱۲۰ رباعیات لکھیں جن میں سے ۱۰۴ کا ترجمہ اردو زبان میں اس طور پر ہوا ہے کہ اگر غالب اپنی رباعیوں کا اردو میں ترجمہ کرتے تو میرا خیال ہے کہ وہ ایسا ہی ترجمہ کرتے جیسا حضرت حسبانے کیا ہے۔ ترجموں کو چڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف غالب کے لہجے، غالب کی شاعری کے رس، غالب کی فکری لطافتوں کے راز و ان ہیں بلکہ انھیں اردو زبان، اس کے اسلوب اس کے مختلف لہجوں اور اظہار و بیان پر پوری قدرت بھی حاصل ہے۔ یہ کلام ہمارے دور میں حضرت صہابہؓ آبادی ہی کر سکتے تھے اور خوشی کی بات ہے کہ یہ کام انھوں نے ہی کیا ہے۔ حسبانے نے غالب کی فارسی رباعیات اور اپنے ترجموں کو ساتھ ساتھ شائع کیا ہے اور اہل نظر دیکھ سکتے ہیں کہ ان ترجموں میں وہ تخلیقی شان موجود ہے جو غالب کی فارسی رباعیوں میں نظر آتی ہے۔ یہ کام کہ کے انھوں نے فارسی گو غالب کو ہماری تہذیب کے آئینوں میں لاکھڑا کیا ہے اور اس موقع

پر اگر میں حضرت صبا سے یہ فرمائش بھی کر بیٹھوں تو بے جا نہ ہو گا کہ حضرت صبا! فارسی کا چلن ہمارے دور میں بہت کم ہو گیا ہے۔ کئے والے زمانوں میں یہ چلن اور کم ہو جائے گا۔ اس لیے اگر وہ غالب کی فارسی غزلوں کا اردو میں ترجمہ کر دیں تو نہ صرف اردو زبان پر احسان ہو گا بلکہ ہماری تہذیب کے چمن میں بہار اُبھائے گی۔ یہ بہت بڑا کام ہے لیکن سارے ملک میں اس کام کو صبا صاحب ہی کر سکتے ہیں۔
غالب نے خود کہا تھا:

فارسی میں تا بہ بین نقشبائے رنگ رنگ
بگذرانہ مجموعہٴ اُردو کہ بے رنگ من است

آپ خود سوچیے کہ جب غالب کا اُردو کلام جسے اس نے ”بے رنگ من است“ کہا ہے اتنا بول رہا ہے تو وہ فارسی کلام جسے غالب نے ”نقشبائے رنگ رنگ“ کہا ہے ہماری تہذیبی زندگی میں کیسے کیسے نئے رنگ نہ گھولے گا؟۔ حضرت غالب بھی جناب صبا سے اس رباعی میں شاید یہی کہہ رہے ہیں:

مائل بہ کرم عالم رعبا در ہے شاید مرا غم خانہ بھی آباد ہے
مجھ سے تو وہی مطلب خوش نحو اچھا ہمدردوں کے گیت پہ دل شاد ہے
(ہم کلام ص ۱۱۱)

اب دو چار رباعیاں اور سن لیجیے اور اندازہ کیجیے کہ حضرت صبا نے کیا خوب صورت ترجمہ کیا ہے:

شب کیا ہے سویلئے دل اہل کمال بڑھ جاتا ہے اور حسن کا زلف و خط و خال
معراجِ رسولؐ بھی ہوئی تھی شبِ مینا اس سے بہتر نہیں تھا کوئی نہنگامِ سال

اک روز شراب چھوڑنا ہے غالب پھر ساقی کے ہاتھ جوڑنا ہے غالب
کیا فائدہ یہ ہوائی تو بہ کر کے دُخِ دونوں طرف جو موڑنا ہے غالب

افلاس کے عالم میں ہوئی تلخ حیات
لے کاش نماز اور روزہ ہوتے
طاقت بھی نہیں ہوتی ب امید نجات
مشروط بہ مال جیسے حج اور کثرت

زاہد جنت میں کیوں قلائع نہیں نہ بھریں
ان کا ہے وہی حال ز روئے تشبیہ
لب تک نہ کیے تھے جو مزے کہیں نہ کریں
جو پائے ہرے کھیت کو جس طرح چریں

غالب تیرا سخن میں مہسر تو نہیں
مے چاہتا ہے مفت نفیس اور بے حد
پھر بھی تو حد ہوش سے باہر تو نہیں
یہ پیر مغال ساقی کوثر تو نہیں

شادی جو کرے گا ہو گا دانا کیسے
مگر سادی خدائی میں ہے گھر والی نہیں
افکار سے پھر جان پہچانا کیسے
پھر میرا خدا نہ ہو تو انا کیسے

(۹ مارچ ۱۹۷۷ء)

ضیا جالندھری کی شاعری

ضیا جالندھری چالیس پینتالیس سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ”کلام“ سرشام کے نام سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا جب انھیں شاعری کرتے ہوئے چودہ پندرہ سال ہو چکے تھے۔ دوسرا مجموعہ کلام ”تیرہ سال بعد“ نارسا کے نام سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا اور اس کے سترو سال بعد ان کا تیسرا مجموعہ کلام ”غلاب سواب“ کے نام سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ اس تمام عرصے میں انھیں نے ہر قسم کی ملازمت کی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے مگر شاعری کا ہمراہ زندگی کی دھوپ چھاؤں میں سائے کی طرح ہمیشہ ان کے ساتھ رہا۔ ضیا جالندھری مجھے عزیز ہیں۔ عزیز اس لیے ہیں کہ ان میں شرافت اور وضع داری کی وہ خوب پائی جاتی ہے جو مجھے اچھی لگتی ہے۔ پھر اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ میرے دو عزیز دوستوں کے عزیز دوست رہے ہیں۔ ایک میرے بھائی سلیم احمد اور دوسرے میرے بزرگ دوست جنھیں میں محبت سے بڑا بھائی کہتا تھا، ابو الفضل صدیقی۔ اب دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں اور میں ان دونوں کو ضیا جالندھری میں دیکھ کر خفاوشی سے یاد کر لیتا ہوں۔ ضیا جالندھری کو عزیز رکھنے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ وہ میرا سچی کے عاشق ہیں۔ میرا سچی نے جن لوگوں کی ادبی طور پر نگہداشت کی ان میں قیوم نظر، یوسف ظفر، الطاف گلبرہ اور مختار صدیقی کے علاوہ ضیا جالندھری بھی شامل تھے۔ ضیا جالندھری میرا سچی کی باتیں تفصیل اور جزئیات کے ساتھ اس طرح سناتے ہیں کہ اس دور کی تصویریتوں کے سامنے آجاتی ہے۔ باتیں ایسے کرتے ہیں کہ آدمی مستار ہے۔ ان میں رس بھی ہوتا ہے اور نطفِ زیست بھی۔ یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ شاعر نثر لکھنے سے بھاگتا ہے۔ ضیا جالندھری نے زندگی میں جو کچھ دیکھا جن لوگوں سے

سلے اور جو باتیں اور ملاقاتوں کی کہانیاں ان کے حافظے میں محفوظ ہیں اگر لکھ نہیں سکتے تو بول کر دیکھا دیکھا دیں تو گزشتہ چالیس سال کا ادبی دور محفوظ ہو جائے گا۔

”خواب سراپ“ جب میں نے پڑھا تو یوں محسوس ہوا کہ ”سرشام“ اور ”تارما“ کے خالق ضیا جانندہری تخلیقی سطح پر آج بھی اسی طرح تازہ دم ہیں جیسے پہلے تھے۔ اب ان کی شاعری میں وہ گہرائی اور ان کے اظہار میں وہ توانائی آگئی ہے جو پڑھنے والے کی روح میں اتر کر اُسے شاد کام کر دیتی ہے۔ اس مجموعے میں مجھے ایک بنیادی تبدیلی تو یہ محسوس ہوئی کہ اب وہ زندگی کے باطن میں اتر کر اس کے تجربوں کو بیان کر رہے ہیں اور اس بیان میں زندگی کا گہرا شعور، فلسفہ و فکر کے روپ میں ابھرتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ خاندن اور باطن کے تجربوں کی اسیمیشن کے انھوں نے ایک نئی شاعرانہ بصیرت حاصل کر لی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنے پورے سیاسی و معاشرتی شعور کے باوجود ان کا لہجہ بہت کشادہ ہے۔ اس مجموعہ کلام کی شاعری سے امکانات کے نئے در واپہوتے ہیں۔

شاعری کے تیسرے مجموعے میں جو چالیس سال شاعری کرنے کے بعد شائع ہوا ہوا ہے انھوں نے شاعری کے نئے امکان کو دریافت کر لیا ہے۔ یہ مجموعہ ضیا جانندہری کی شاعری کے نئے مستقبل کی نوید دے رہا ہے۔

اپنی شاعری کے آغاز ہی سے وہ فطرت کے گونا گوں عوامل کو علامت کے طور پر استعمال کرتے اور انسانی جذبات کے ابلاغ کے لیے نئے نئے پیکر تراشتے رہے ہیں، اسی لیے ان کی شاعری توجہ چاہتی ہے۔ وہ توجہ جس سے شاعری کا ظلم اور اس کی تہیں کھلتی ہیں اور شاعری سے وہ حقیقی نطفہ میسر آتا ہے جو ہاذوق قاری کا اصل سرمایہ ہے۔ ”خواب سراپ“ تک پہنچتے پہنچتے جب وہ باطن میں اتر کر انسانی زندگی اور حیات و کائنات کو دیکھتے ہیں تو اعتبار پر اعتبار نہیں آتا۔ ابدی سچائی میں بہارا اور خزاں ساتھ نظر آتی ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ بے اعتباری ہی اعتبار کی منزل ہے۔ برہنہ تہی درست شائیں سیاہ ہو کر نئی کلیوں کی شمعیں روشن کر کے بہاروں کا پیغام دیتی ہیں یہ ایک ابدی سچائی ہے مگر سچائی کا اعتبار کے باوجود :

بارہا ہم نے دیکھا

بہاروں کے آنے سے پہلے

بہاریں اُجاڑی گئیں

اب کے پھر آرہی ہے بہار

پھر اشارت سے ڈرتا ہے دل

غنیچے انکھول آنکھ رنگ رنگ کے کھول

کھول پے آہستہ آہستہ کھل (اشارت)

یہ وہ نظر ہے جو خطبہا جانندھری کے ہاں ایک نئے لمحے کو جنم دیتی ہے۔ یہی شربت نگاہی اُن کی نظموں — معزول، بڑا شہزادہ باہیل میں نظر آتی ہے۔ اب وہ تجربے کو ساری زندگی کی اہدی سچائیوں پر پھیلا کر دیکھتے ہیں۔ باہیل میں اس تجربے کی صورت یہ بنتی ہے :

اور قابیل سے ارشاد کیا تھا اُو نے

خون باہیل کی ان ذروں سے بُو آتی ہے

پہیل کراب دی بُد سارے جہاں پر ہے محیط

کیا یہ بُوتا بہ ابد میرا مُقتدر ہوگی

کیا ترسے اذن سے قابیل کی خرقا تم ہے

کیا یہ بُوتا بہ ابد میرا مُقتدر ہوگی (باہیل)

یہ لمحہ موجود کو اہدی سچائیوں تک پھیلانے کا وہ تخلیقی عمل ہے جو صوفیا کا شیوہ رہا ہے :

واکرو دیے ہیں شوق نے سند نقابِ حُسن

غیر از سنگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

”معزول“ اور ”بڑا شہزادہ“ میں بھی لمحہ موجود کے اسی تجربے کو حیات و کائنات پر پھیلا کر

دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی صورت ہمیں اُن کی طویل نظم ”گولے“ میں ملتی ہے۔

اس انداز کی طویل نظموں کو خطبہا جانندھری ہی نے اردو میں متعارف کرایا ہے۔

ان کے پہلے نمونوں میں پانچ طویل نظمیں شائع ہو چکی ہیں پہلی نظم ”زمستان کی شام“ جب

۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی تو کچھ نقادوں نے کہا کہ یہ ایک نہیں بلکہ پانچ نظمیں ہیں جن کو یکجا کر کے ایک عنوان دے دیا گیا ہے مگر ذرا توجہ سے پڑھنے سے اس کے اندرونی رشتے واضح ہو جاتے ہیں۔ ان طویل نظموں میں حنیف جالندھری فطرت کی علامتوں کے ذریعے یا تو ایک ہی حقیقت پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں جس سے اس حقیقت کی کئی کہیں نہیں سامنے آتی ہیں یا پھر وہ تضاد کے اندر آخر کار اصلیت کی تلاش کرتے ہیں۔ یہ نظمیں عمل، روعیل اور امتزاج کی منزلوں سے گذرتی ہیں اور یقیناً اردو شاعری میں منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔

اس مجموعے میں طویل نظم ”گولے“ بھی اس کی مثال ہے۔ اس نظم میں حنیف جالندھری نے چار بنیادی عناصر — آگ، پانی، ہوا اور مٹی کو علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہاں آگ سورج کے روپ میں آتی ہے۔ یہ نظم ۱۹۶۶ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایوب خاں کا مارشل لا ختم ہوا تھا اور کبھی خاں کے مارشل لا کا آغاز ہوا تھا۔ مارشل لا کے بعد مارشل لا قوم کے لیے ایک مایوس کن مرحلہ تھا۔ یہی مایوسی اس نظم کا موضوع ہے۔ سورج یہاں امر کی علامت بن گیا ہے جو اپنے جبر سے دشت و صحرا ہی کو نہیں شہر و بستی کو بھی تباہ کر رہا ہے۔ اس کے مسلسل ظلم سے تنگ آکر مٹی یعنی پسے والے لوگ اور جبر کے شکار عوام بغاوت کر دیتے ہیں اور اس بغاوت کو ہوا جذبہ کی علامت سے تقویت ملتی ہے۔ ہر چند یہ بغاوت کامیاب ہو جاتی ہے لیکن پانی (محبت، شعور، انہماق، خیال کی آزادی) نہ ہونے کی وجہ سے پھر ناکامی کا منہ دیکھتی ہے اور خاک جو آخر خاک تھی، دوبارہ جبر کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس مرحلہ پر شاعر پھر ”پانی“ (شعور اور انہماق کی آزادی) کے خواب دیکھنے لگتا ہے، جسے وہ محبت کے ہی زیادہ اہم سمجھتا ہے۔ اس نظم کے ایک طرح سے میرا ذاتی تعلق ہی ہے۔ یہ نظم دوسرے مارشل لا کے زمانے میں پہلی بار ”سماہی“ ”نیا دور“ میں شائع ہوئی تھی۔ بات اگرچہ علامتوں کے ذریعے کہی گئی تھی مگر علامات بہت واضح تھیں۔ میرے نزدیک اس نظم کو شائع کرنے کا حوالہ یہ تھا کہ یہ علامات کسی ایک وقت یا ایک عہد کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ یہ تو ہمیشہ سے

ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا کہ انسان اُمیدیں باندھتے ہیں کوشش اور جدوجہد کرتے ہیں اور پھر ناکامیوں کا منہ دیکھتے ہیں۔ تاریخ کا یہ عمل خود ضیا جانندھری کی شاعری کا خاص موضوع ہے :

دل کہ ہے اسرار کا محرم یہ کہتا ہے
کہ بے آواز ٹی حوت وہ بیان
موجِ محبت بھی مراب

میرے خواب
بادلوں میں بھیگتی رساقوں کے خواب

میرے خواب
پیارے پُر آب آنکھوں
مدد بھری راتوں، ملاقاتوں کے خواب

میرے خواب
خواب کے دُروں کے ہونٹوں پر
نڈر ہاتھوں کے خواب (گولے)

گولے کے علاوہ جن نظموں نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا وہ ”سرد موسموں کا سورج“،
”بشارت“ اور ”بڑا شہر“ ہیں اور یقیناً منقود شاعری کی متاثر مثال ہیں۔ میں نے یہاں ضیا جانندھری
کی غزلوں کی بات نہیں کی ہے۔ وہ پھر ہیں۔

قمر جمیل کے بارے میں

قمر احمد فاروقی انھیں دنیائے ادب قمر جمیل کے نام سے جانتی ہے، ایک بڑے خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو دنیوی امتیازات کے ساتھ ساتھ تصوف کا بھی اہم گھرانہ رہا ہے۔ دائرۂ شاہ اجمل کے نام سے ہم سب ہی واقف ہیں۔ قمر جمیل اسی خاندان کے فرد ہیں۔ اس اعتبار سے ان کا خاص تعلق ایک طرف حضرت آسی غازی پوری سے ہے اور دوسری طرف ان کا تعلق مسلم سیاست کے اہم رکن مولانا شاہد فاخری سے ہے۔ قمر جمیل نے الہ آباد یونیورسٹی میں تعلیم پائی جہاں ان کا شمار یونیورسٹی کے ذہین اور باصلاحیت طلبہ میں ہوتا تھا۔ قمر جمیل نے پاکستان آکر سنٹرل سپر سروسز میں کام کیا۔ اس میں کامیاب بھی ہوئے لیکن پھر کیا ہوا اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ریڈیو پاکستان کی ملازمت اختیار کر لی اور دورانِ ملازمت ایک طویل غیر حاضری کے بعد پھر اس سے وابستہ ہو گئے اور کچھ تک ریڈیو پاکستان ہی سے وابستہ رہے۔

قمر جمیل اپنے طالب علم ساتھیوں میں اس اعتبار سے بھی منفرد تھے کہ وہ ابتداء ہی سے شاعری کا جوہر رکھتے تھے۔ حساس اور ایک بے چین و مضطرب شخصیت کے مالک۔ ان کے مزاج میں ان ہی خصوصیات کی وجہ سے ہمیشہ تلون رہا ہے۔ وہ کبھی ایک جگہ نہیں رُکے اور ذہنی ارتقاء کے ساتھ ان کی شاعری کے نوسم بھی بدلتے رہے۔ وہ عزل اور نظم دونوں میں یکساں تخلیقی صلاحیت کے مالک ہیں۔ نثر بھی لکھتے ہیں اور تنقید بھی۔ تنقید میں بھی ان کا اسلوب ان کی شاعرانہ شخصیت کے زیر اثر رہتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں۔ ان کی شخصیت اور ذہنی فضا کو پہلو دیتی ہے۔ اس فضا میں متصادم

عناصر کا کردار نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ بیک وقت ایک حساس شاعر اور روحانی حسیات کے مالک ہیں۔ وہ صوفی نہیں ہیں لیکن صوفیوں کی وار و است قلب سے آشنا ہیں۔ یہ سب عناصر ان کی شاعری اور نثر میں واضح طور پر نظر آتے ہیں لیکن ان کی ذات میں پوری طرح جذب ہو کر ایک اکائی نہیں بن سکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت متضاد و متضاد عناصر کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔

یہ سب باتیں میں نے اس لیے بیان کی ہیں تاکہ اس بات کا پتا چل سکے کہ قمر جیل نے مختلف ادوار میں مختلف ماسایب کیوں اختیار کیے؟ ان کا ابتدائی کلام ایک بیانیہ انداز بلکہ خطیبانہ لہجہ رکھتا ہے۔ اس میں ایک جوش، ایک اندرونی اضطراب اور دوسروں سے براہ راست مخاطب ہونے کی تڑپ ملتی ہے۔ وہ انسانی تاریخ کے بعض اہم لمحوں، قبائلی زندگی کے پُر جوش اور توانا جذلوں، قدیم تہذیبوں کے خوب صورت رنگوں کو اپنے اس انداز و لہجہ میں سمو کر ایک مخصوص اثر پیدا کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ ان کا دوسرا رنگ ان نظموں میں نظر آتا ہے جہاں وہ قدرت سے ہم کلامی اور اس سے اپنی ذات کو ایستہ کرنے کا ایک خاص اہتمام کرتے ہیں۔ یہاں فطرت سے ان کا تعلق گہرا اور بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔ ان کا تیسرا رنگ ان نظموں میں نظر آتا ہے جہاں وہ نرم لہجہ اور گہرا کیفیات کو نئی شاعری کے بعض تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ ان کی اس نوع کی نظموں میں گہری تاثیر اور جذبے کی صداقت موجود ہے۔

قمر جیل نے بعض شعری تجربے بھی کیے ہیں مثلاً تین تین مصرعوں کی نظم کا تجربہ یا نثری نظموں کا تجربہ۔ تین تین مصرعوں کی نظم کے وہ اولین معمار اور اردو میں نثری نظم کی تحریک کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ”چہار خواب“ اور ”دریائے نیل کے سیلاب“ سے لے کر نثری نظم تک قمر جیل کا شعری سفر ایک خاص مطالعہ چاہتا ہے جو اس وقت ممکن نہیں ہے۔ میں تو یہاں قمر جیل کی شاعری و شخصیت کے چند مختلف پہلوؤں کو سامنے لا کر ان کی حقیقی تخلیقی صلاحیتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں تاکہ جب آپ ”چہار خواب“ کا مطالعہ کریں تو اس سے پوری طرح نطفہ اندوز ہو سکیں۔ یہ ہمارے دور کے ایک اہم شاعر

کا ایک اہم اور قابل ذکر نمونہ کلام ہے۔

قرمیل کی نظموں میں قدیم خواب، اساطیر، تاریخ اور انسانی ارتقا کی جھلکیوں کے ساتھ موجودہ عہد کی بے چین فکر اور مضطرب حیات انسانی ایک عجیب تناظر کو سامنے لاتی ہیں۔ گزشتہ دس سال کی شاعری میں قرمیل نے موجودہ عہد اور موجودہ انسان کے مسائل کو جس خوبصورتی اور فن کارانہ چابک دستی سے گرفت میں لیا ہے وہ اُن کی پختی شاعرانہ صلاحیتوں کی دلیل ہے۔ اسی لیے وہ ایک اہم جدید شاعر ہیں۔

قرمیل نے نظموں کے ساتھ غزلوں پر بھی پوری توجہ دی ہے۔ ابتداء میں ان کی غزلوں میں فطرت نگاری اور انسانی فکر کے چند ایسے پہلوؤں کی آمیزش ملتی ہے جو ان کی غزلوں کو ہماری مدداتی غزل یا غزل کے خاص اسلوب سے مختلف بنادیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نام کاظمی کے بعد سب سے زیادہ مسلسل غزل کہی ہے۔ قرمیل نے ادھر جو غزلیں لکھی ہیں ان میں بعض غزلیں بڑی موثر اور غزل کے خاص اور نئے عناصر پر مشتمل ہیں۔ بیشتر غزلوں میں انھوں نے اپنے ذہنی و فکری تجربات کو اس طرح شامل کر دیا ہے کہ ہم ان کو نثری نظم کی مانند ایک طرح کی نثری غزلیں کہہ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیے:

خواب میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اس کا دکھانا مشکل ہے
آئینے میں پھول کھلا ہے ہاتھ لگانا مشکل ہے
اس کے قدم سے پھول کھلتے ہیں میں نے سنا ہے ہمارے وطن

ویسے اس ویران سرا میں پھول کھلانا مشکل ہے

غزل نے ہر دور میں اپنی تخلیقی وسعت اور امکانات کا ثبوت دیا ہے مگر اس کے لیے شاعری کا جو ہر ضروری ہے۔ قرمیل نے بعض غزلوں میں جدید حیثیت اور جن تجربات کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے ان سے ایک نیا امکان اور ایک نیا راستہ کھل رہا ہے۔ ان غزلوں میں نیا پن اتنا اہم نہیں ہے جتنا بعض تجربات اور جدید حیثیت کے غزل کے خاص مزاج کا حقہ بتانے کی کوشش قابل توجہ ہے۔ یہ ہم سب جانتے ہیں کہ چند ہی غزلیں ایک ایسا نیا راستہ دکھا دیتی ہیں جس سے کہنے والی غزل اپنی توانائی حاصل کرتی ہے۔ ”چار خواب کی الجھا غزلیں

جدید شاعروں کو یقیناً دعوت مل رہی ہے :

شہر میں سب کی بیٹیاں مجلسوں میں نواگری
 پھر بھی مرے لہو میں ہے ایک عجب قلندری
 چاند میں جیسے فاختہ شاخ پہ جیسے چشمِ نم
 غم ہے عجیب کھوکھلا رات عجیب مسخری
 رات بہشت میں مجھے اپنا خدا بھی مل گیا
 میں نے اسی کو سوئپ دی اپنی کلاہ کستری
 اس کی نگلی سے کئے ہیں لوگ یہ سوچتے ہوئے
 آنکھ میں ہفت آسمان ہاتھ میں اک کیبوتری

چلے گئے بات کرنے وہ سیاست جہاں پر
 کہ سمندروں میں جیسے کوئی پھینکتا ہو پتھر

ترے دل کے سائیاں میں گراں میں عجاپاک
 کوئی لگ گزیدہ جیسے گرے اپنے گھر میں آکر

اپنے گھر کے آگن میں جب بہار آتی ہے
 لڑکیاں نکلتی ہیں سائیاں سے آگے

آگے میری کھڑکی میں لامکاں ٹھہرتا ہے
 عشقِ رقص کرتا ہے ہر گمان سے آگے

قرمیل نے "غوابِ نما" سے لے کر "چہار خوب تک جو شعری سفر کیا ہے وہ

اپنے تمام تضادات کے باوجود انشا متون اور ہمہ رنگ ہے کہ ہمیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ قمر جمیل
 ہمیں اس عہد کے بنیادی تصادم، تضاد اور تقاضوں کو طرح طرح کے اسالیب میں بیان کر چکا
 جو ہر موجود ہے "چہار خواب" دراصل ان کے شعری سفر کا ایک انتخاب ہے جس میں انھوں
 نے ہر رنگ کے بہترین کلام کو شامل کر لیا ہے لیکن "چہار خواب" میں ان کی موجودہ نظمیں سب
 سے زیادہ نمایاں ہیں جن میں قمر جمیل نے اس عہد کے خوابوں کو مقید کرنے کی بھرپور اور
 کامیاب کوشش کی ہے اور اسی وجہ سے "چہار خواب" ہماری جدید شاعری کا ایک اہم مجموعہ ہے۔
 جہاں تک قمر جمیل کی شاعرانہ حیثیت کا تعلق ہے وہ اس عہد کے اُن گمنے چنے شاعر ہیں
 میں سے ایک ہیں جنھوں نے ایک طویل تخلیقی سفر کیا ہے اور اس سفر میں انھوں نے متنوع
 اسالیب اور اصناف کو وسیلہٴ اظہار بنایا ہے اور ان کا ہر وسیلہٴ اظہار اپنا اعتبار رکھتا ہے۔
 اسی کے ساتھ انھوں نے جدید تجربات کو جس طرح شاعری میں سمویا ہے اور اس سے جو
 تنوع پیدا ہوا ہے وہ کسی ایک نئے شاعر کے ہاں مشکل سے نظر آتا ہے۔ ان کا نازہ کلام
 دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کا فطری شاعرانہی ٹھکانا نہیں ہے اور میں ان کے مزید شعری کارناموں
 کا انتظار کرنا چاہیے کیونکہ ایک تخلیقی شاعر آخری لمحہ تک تخلیقی شاعر رہتا ہے اور اس کا سفر کبھی
 ختم نہیں ہوتا۔ میں اپنی بات کو قمر جمیل کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

ابھی تو مٹی پہ چل رہے ہو

ستارہ بن کر نکل نہ سبانا

(سہ ماہی، اگست ۱۹۸۹ء)

صدانصاری کی غزل

کڑا ہوں کی تعارفی تقریب کا مقصد عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ کم فرصتی کے شکار اہل بلاغ عامہ کے اس دور پر شعور میں، جب ہر شخص صرف اپنی روزی کمانے میں مگن ہے اور مشہور زمانہ نقار خانے میں روایتی طوطی کی صدا سننے کو آمادہ نہیں ہے، تعارفی تقریب کی وجہ سے کچھ اچھے لوگ بغیر نفسِ نفیس جلسے میں شریک ہو کر کتاب کے بارے میں کلماتِ خیر سن سکتے ہیں اور بہت سے دوسرے اخباروں میں تقریب کی خبر پڑھ کر یا ریڈیو سے اس کی روشنی دیکھ کر مصنف و کتاب کے نام سے متعارف ہو جاتے ہیں اور یہ کتاب اگر کہیں اتفاق سے انہیں نظر آجائے تو اس تقریب کی بھولی پسری یاد انہیں اس کتاب کو خریدنے کی ترغیب دیتی ہے حالانکہ میرا خیال ہے کہ ایسا شاید کم کم ہوتا ہے۔ ایسی تقریبوں کا ایک فائدہ اور بھی ہے۔ ہمارے زمانے میں جب لوگ عام طور پر صرف اپنے معیار زندگی کو خوب سے خوب تر کرنے میں مصروف ہیں اور کسی کے پاس وقت ہے اور نہ دل ہے کہ اپنی اور اپنے دور کی روح کا مطالعہ کرے جو صرف ادب و شعر میں ظاہر ہوتی ہے تو ایسی صورت میں تعارفی تقریب سے لکھنے والے کی اتنی حوصلہ افزائی محسوس ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے بارے میں کلماتِ خیر سن کر تازہ دم ہو جائے اور ادب کے کام کو کاربے کاران سمجھ کر خیر باد کہے۔ اس طرح ادب کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ ایسی تقریبوں کا یہ وہ مثبت پہلو ہے کہ میں ذاتی طور پر ان تقریبوں کا بآغہ ہوں۔

صدانصاری صاحب جن کے نئے اور تیسرے مجموعہ کلام "توسین" کی تقریب رونمائی کے سلسلے میں آج جمع ہوئے ہیں، ادب و شعر کے سچے عاشق ہیں۔ سائنس کی اعلیٰ

تعلیم پانے کے باوجود ادب کی دنیا میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ آئے ہیں۔ شاعری ان کا میڈیم ہے اور صنف غزل ان کا ذریعہ اظہار ہے۔ سائنس کی تعلیم اور فنی تربیت کی وجہ سے ان کا ذہن جن خطوط پر سوچتا ہے، وہ اس ذہن سے بہت مختلف ہے جو آج غزل کی شاعری میں اپنا خون جگر صرف کر رہا ہے۔ قصید انصاری کا کلام پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ غزل کی روایتی علامات و رمزیات کو ایک نئی وسعت دے رہے ہیں اور خدا، کائنات اور انسان کو اس نظر سے دیکھ رہے ہیں جہاں لامتناہیوں میں مسلسل ترقی پیدائی کائنات ہر دم بدل رہی ہے۔ آج جب سائنس انسان کا ذہن اس کی سوچ اور اس تصور بدل رہی ہے اور ہم نسب پیچھے چلانے اور اوپر ملانے کے باوجود رفتہ رفتہ اس کے آؤٹنٹکسٹن میں آ رہے ہیں، قصید انصاری کی شاعری ہمیں اس تبدیلی کا شعور عطا کر کے ہمارے ذہن کے بند درکوں کو کھول رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے ان کا یہ مجموعہ کلام پڑھا تو مجھے تازہ ہوا کے جھوکے نے تازہ دم کر دیا۔ قصید انصاری نے اس تبدیلی کو محسوس کیا اور غزل جیسی ظالم روایتی صنف کے ذریعے سائنسی فکر کو جذب و احساس بنا کر شاعری کا روپ دے دیا۔ تبدیلی کائنات کا بنیادی عمل ہے اور اسی لیے زندگی پل پل بدل رہی ہے۔

دل رہی ہیں شب و روز صورتیں کیا کیا

دوام کو بھی نہ حاصل کبھی دوام ہوا

وہ لوگ جنہوں نے قصید انصاری کا دوسرا مجموعہ کلام، جو ”ہفت“ کے نام سے ۱۹۸۱ء شائع ہوا تھا، پڑھا ہے چلنے نہیں کہ اس مجموعے میں انہوں نے اسی سمت میں اپنا سفر تخلیق اختیار کیا تھا۔ یہی سفر ان کے تیسرے مجموعہ کلام ”توسین“ میں جاری ہے۔ فکر کی اسی مخصوص سمت کی وجہ سے قصید انصاری کی غزل، آج کی غزل سے خیالات احساسات اور لہجہ و آہنگ کے اعتبار سے مختلف ہے۔ ان کا کلام پڑھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذہن مروجہ سچائیوں اور خیالات سے ہار ہار ٹکرا رہا ہے۔ اسی آؤٹریش سے ان کی شاعری کی چنگاری روشنی دیتی ہے۔ وہ شعور کو وجدان پر فوقیت دیتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ عقل کے فتور کو بھی دیکھتے ہیں۔ اسی عمل سے زندگی آگے بڑھتی ہے اور سویا ہوا منہ روشن

بیدار ہو سکتا ہے۔ یہی بیداری بنی آدم کا شرف اور اس کا جوہر ذات ہے۔

جواز مجھ سے ملا ہے تری بلندی کو

ترے کمال میں میرے قصور کتنے ہیں

جیسا کہ قسید انصاری نے اس کتاب کے "انتساب" میں بتایا ہے کہ شرف بنی آدم

اس مجموعہ کلام کا بنیادی موضوع ہے لیکن مجھے ان سے اتفاق نہیں ہے اور میرا خیال ہے

کہ آپ بھی قسید انصاری صاحب کے بتائے ہوئے راستے پر آنکھ میچ کر نہ چلیں بلکہ یہ دیکھیں

کہ وہ کیا روپ ہے جو ان کی غزل میں سامنے آیا ہے۔ شرف بنی آدم کا موضوع اس مجموعے کی

غزلوں میں آیا ہے اور خوب آیا ہے لیکن ان کی غزلوں میں اس موضوع کے علاوہ بھی وہ تنوع

اور رنگارنگی ہے جو ہمارے دامن دل کو حضرت زلیخا کی طرح اپنی طرف کھینچتی ہے۔ شرف

بنی آدم کی طرف اپنے قاری کی ساری توجہ مبذول کر کے انھوں نے "توسین" کے ساتھ

خود انصاف نہیں کیا ہے۔ نظم ایک موضوع تک محدود ہو سکتی ہے۔ مسلسل غزل میں بھی ایک موضوع ایک

فضا یا رنگ کو نبھایا جاسکتا ہے لیکن کوئی سارے مجموعہ غزلیات کو صرف ایک موضوع کا پابند کرنا بھی چاہیے تو

نہیں کر سکتا۔ یہی تو غزل کی ادا ہے۔ یہی اپنی بات و وضاحت کے لیے آپ کے سامنے ادھر ادھر سے چند شوقیہ مثالیں

بس گینا جسم میں آخر درو دیوار کا صبی

لوگ گھبرا کے بہت شام کو گھر سے نکلے

شاید کہ خوشگوار ہوں قربت کی تلخیان ان فاصلوں کو آؤ ذرا اور کم کریں

ایسے گھروں میں کون بے گنا جہاں حمید

دیوار و در کے ساتھ لب و گوش بھی ہوئے

ہے مرے گھر تک مرے گھر کی اذان میری مسجد ہے مری محراب تک

طلم لٹ گیا آرزو کے موسم کا۔ کوئی خیال نہ آیا ترے خیال کے بعد

لچک جاتی ہے شاخ بے ثمر بھی ہے قامت منحصر حسن ادا پر

گوئج ہے کس کے بدن کی مری دیواروں میں
گھر مرے کون ہے گلیوں کی ہوا کیا جانے

کون کاٹے گا مرے پاؤں کی ذخیرہ کس کے ہمراہ سرازاد سفر جائے گا

شباب ہتھوں سے عیاں فکر و فنی نہیں ہوتے
ہیں سانپ ایسے بہت جن کے کچھ نہیں ہوتے

قدم کی چاپ میں رہتی ہیں رہ گزاریں بھی
سوادِ عمر میں عہدِ شباب شامل ہے

اپنے بدن کا بوجھ اٹھانا پڑے گا خود
اس شہر میں تو اب کوئی مسزود بھی نہیں

قدم قدم پہ لڑے ہیں نئی شکستوں سے
وہ لوگ جن کو فقط ایک مات کا فی حق

انگو چراغ پرانے اُتر گئے ہوتے حرم کے طاق ستاروں سے بھر گئے ہوتے

دستِ دعا اٹھتے ہیں کبھی آسمان کی سمت
نکلے تھے جو زمیں سے وہ انہار کیا ہوئے

کس کا بدن اٹھائے امانتِ درجہ کی بندہ خدا کا ملکِ خدا سے نکل گیا

جس کے لیے رگوں میں اُتار گیا ہو وہ روشنی بدن کی سیاہی کے ساتھ ہے

فریبِ سنگ میں اصنام یہی کہتے تھے نئے بدن کی کبھی جستجو نہیں جاتی

کچھ جانتے ہیں سونے بھی اندھیروں کے سفر میں

مغرب سے کبھی دن کو نکلتے نہیں دیکھا

یہ اشعار کپ نے سُنے اور یہ وہ اشعار ہیں جو "قوسین" میں شامل ہیں۔ ان میں وہ تنوع ہے جو غزل کی دین ہے، جن میں ایک جدید ذہن زندگی کو اپنے رُخ الہیے زاویے سے دیکھ رہا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ شرفِ بنی آدم کے موضوع پر، جیسا کہ میں نے ابھی کہا، اس مجموعے میں بہت سے اشعار موجود ہیں لیکن سارا مجموعہ صرف اسی ایک موضوع تک محدود نہیں ہے بلکہ اس مجموعے میں ایک ایسی رنگارنگی ہے کہ میں اس مجموعے کو پڑھ کر صمد انصاری کا قائل ہو گیا۔ یقیناً اس دور کا ایک منفرد مجموعہ ہے۔

رسوا سر بازارِ غزل کر گیا مجھ کو

نقا خوف بہت جس کو مری پردہ دری کا

آخر میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ صمد انصاری صاحب نے بہت غزلیں کہیں اور اشعار اللہ اور کہیں گئے لیکن اگر وہ ساتھ ساتھ "نظم" کی طرف بھی توجہ دیا تو پھر دیکھیے کہ پُر وہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے!! میرے کہنے سے وہ ذرا یہ بھی کر دیکھیں۔

پرتوروسیلہ اور اُن کی شاعری

یہ آج سے ۲۱-۲۲ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک گہر و جہان مجھ سے ملنے آیا۔ دراز قد، نشیل آنکھیں، ورق سے ہونٹ، دہنی مسکراہٹ لیے، کھڑی ناک، خاندان کا پتہ دیتی ہوئی، گورا چٹانگ، رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں، چہرے پر بھولین، جیسے صبح ہو رہی ہو۔ سر پر قرآنی ٹوپی، کتھی رنگ کا کوٹ، خوش پوش بھی اور خوش گفتار بھی۔ کھنڈر ابھی اور سنجیدہ بھی۔ قہقہے لگاتا تو رات جاگ جاتی۔ خاموش ہوتا تو دن سونے لگتا۔ تعارف کرایا تو مختار علی خان نام بتلایا اور کھلے تو پتہ چلا کہ شاعر ہیں، پرتو متخلص کرتے ہیں اور لفظ رومیلہ خاندان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ حافظ رحمت خان کی اولاد ہیں۔ وہی حافظ رحمت خان جنہوں نے اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کے ایک حصے کو داد و شجاعت دے کر فتح کیا اور رومیلہ کھنڈ نام رکھ کر اپنی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ پاکستان وجود میں آیا تو حافظ رحمت خان کے خاندان کا یہ حصہ اپنے وطن لوٹ آیا۔ مختار علی خان یہیں آباد ہو گئے اور شادی بیاہ کر کے رہیں کے ہو رہے۔ بیوی صوابی کے ممتاز خاندان کی چشم و چراغ۔ آغوش واکر کے مختار علی خان کو ایسا اپنا یا کر من و تو ایک ہو گئے۔ ایک جان دو قالب۔ یہی وہ حقیقی یک جہتی تھی پاکستان کو جس کی ضرورت تھی اور جس کا عملی اظہار مختار علی خان نے کیا۔ پاکستان محبت کے اسی رشتے کی تلاش کے لیے وجود میں آیا تھا اور محبت کا یہی رشتہ آج بھی ہماری ضرورت ہے۔

مختار علی خان پرتوروسیلہ نے اس علاقے کی روح کو قومی روح میں جذب کرنے

کے لیے پشتو ٹپے کو اردو میں منتقل کر کے قومی کچھر کے دریا کو پاٹ دار بنانے کا وہ عمل کیا جو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ پاکستان مختار ملی خان کا خواب تھا جس کی تعبیر آج بھی ان کی حسرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وطن پرستی اور حب وطن ان کی شاعری کا محبوب موضوع ہے اور ان کی شاعری کے خمیر میں اس طرح شامل ہے جس طرح روح جسم میں شامل ہو کر زندگی کا پیغام دیتی ہے۔ پر تور وہیل کے اب تک ”پنپنے کے علاوہ تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مجموعہ غزلوں کا ”پر تور شب“ کے نام سے دوسرا مجموعہ دو ہوں کا ”رہین اجیارا“ کے نام سے اور تیسرا مجموعہ نظموں، غزلوں کا ”نوائے شب“ کے نام سے۔ ان سب مجموعوں میں آپ کو ایک ارتقاء کا احساس ہو گا اور آپ محسوس کریں گے کہ پر تور وہیل کے ہاں اب تک خود کو دہرانے کا عمل شروع نہیں ہوا ہے بلکہ وہ تخلیقی سطح پر مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔ اتفاق سے ان کے پہلے دو مجموعوں پر پیش لفظ میرے لکھے ہوئے ہیں۔ جب ”پر تور شب“ شائع ہوا تو میں نے اس کے پیش لفظ میں لکھا تھا اور یہ بات ۱۹۷۴ء کی ہے کہ اگر پر تور وہیل اپنے اس مجموعے کو آج سے دس سال پہلے شائع کر دیتے تو اہل ذوق کو معلوم ہوتا کہ یہ شاعر اپنے رنگ سخن کے اعتبار سے اپنے دور کے شاعروں سے کتنا آگے تھا۔ ۱۹۶۶ء کی غزل کا یہ شعر دیکھیے۔

کبھی جو ماضی کے پیر میں، میں نے یاد کی انگلی پہ لڑا لے
تو تنگی رشتی تہوں میں محلوں کی خوشبو سی ملی ہے

یا یہ شعر سنئے!

رات بھر دوست یہ احساس رہا کوئی مرنے کھڑا ہو جیسے

یہ وہ رنگ سخن ہے جو روایت سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی اس سے الگ ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ پر تور وہیل نے نئے رنگ اور نئی خوشبو سے اردو شاعری کے صحن کو معمور کر دیا ہے۔ ”پر تور شب“ میں مجھے ایک بات یہ بھی شدت سے محسوس ہوئی تھی کہ پر تور وہیل کی غزل میں ہیئت تو غزل کی ہے لیکن مزاج اور لفظیات پر وہ ہے کا رنگ غالب ہے اور میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر وہ دوبارے کی طرف توجہ کریں تو نیا جنم کیا کرنے کا

پورا امکان موجود ہے۔ یہ تو نے ”دو ہے“ کی طرف پوری توجہ کی اور ان کا دوسرا مجموعہ کلام ”رین آبیار“ صرف دو ہوں پر مشتمل تھا۔ اہل ذوق جانتے ہیں کہ یہ تو نے دو ہے کہہ کر اردو شاعری کی جدید تاریخ میں اپنا مقام بنالیا ہے اور بہت آگے نکل گئے ہیں۔ دو ہوں میں انھوں نے اپنے چاروں طرف بکھرے ہوئے تہذیبی پسندوں اور مثالوں کو عام زندگی کے لئے کر شاعری کے بار میں عجیب کیفیت کے ساتھ گوندھ دیا ہے۔ یہ وہ تخلیقی و تہذیبی عمل ہے کہ اس سطح پر کوئی ان کو نہیں پہنچتا۔ اُن کی شاعری کو دیکھ کر جوش ملیح آبادی نے کہا تھا کہ

”ان کی آواز دھیمی، رسیلی اور شبی ہے جس کے سایہ میں سورناج

رہے ہیں۔ بلوں میں ہندی کا لوح اور سنگھٹ کی گراہیوں کی ناچتی ہٹی

بھیر دیاں ہیں۔“

ایک دوہا اس موقع پر آپ بھی سن لیجیے :

ساگر سے جب کوئی اچھا گن بوند الگ ہو جائے

سورج ماسے بھاپ بنے، پھر برے ’تبدیل پائے

یہی زندگی کا تخلیقی و تہذیبی عمل ہے۔ یہی توحید ہے۔ یہی یک جہتی ہے۔ یہی فضل

سے ہٹ کر فضل کا راستہ ہے۔ یعنی دوپنے سے ایک پننے کی طرف۔ جس نے کچھا ایک ہو گیا۔

جس نے نہ سمجھا مٹ گیا۔

”لوائے شب“ اسی شاعر کا مجموعہ کلام ہے جو ایک لمبا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچا

ہے۔ جس نے تضاد میں ہم آہنگی پیدا کر کے ایک نئے رنگ سخن کی داغ بیل ڈالی ہے۔

یہاں قومی مسائل کو وہ جس تخلیقی شان کے ساتھ سامنے لاتا ہے وہ نئی شاعری کے لیے

ایک کھلا راستہ ہے۔ میں یہاں ان کی دو نظموں ”دار سنگی“ اور ”پہن کُشن“ کا حوالہ دوں گا جن

میں معاشرتی مسائل حب وطن کے ساتھ مل کر ایک نئے اقتراح کی طرف اشارہ کر رہے

ہیں۔ نظم ”دار سنگی“ میں آپ کو بھی سنا چاہتا ہوں ناگزیر شاعری کا نیا رنگ جس میں انہی

اور حال مل کر مستقبل کے سامنے نئے سوالوں کو جنم دے رہے ہیں آپ کے سامنے آجائے :

وِاسْتِگی

یہ بس ایک میدان تھا جس میں سرِ شام ہم خوش نصیبوں کا ٹوٹا ہوا
قافلہ آکے اُترا

کوئی جسم ایسا نہ تھا جس پر زخموں نے تحریر چھوڑی نہ ہو
مگر پھر بھی ہر شخص خوش تھا کر کھویا ہوا راستہ مل گیا ہے
ہمیں پر ہمارے قبیلے کے سردار نے یہ کہا تھا

یہ میدان تمہارا ہے

تم اس کے حق دار ہو

اس میں تجھے لگاؤ

کھلا آسماں اب تمہارا ہے

چسکتی ہوئی دھوپ کا اب تمہارے سوا کوئی مالک نہیں

تو وہ ہی اُٹا قافلہ اپنے گھاؤ بھلا کرنے عزم سے کھل اٹھا تھا

مگر آج شیعوں کے چاروں طرف کوہ آسا نصیلوں نے جب

دھوپ بھی روک دی ہے

ہواؤں کو بھی کوئی رستہ نہیں ہے

تو میرا جواں ہوتا بیٹا عجب طنز سے پوچھتا ہے

بتاؤ تو بابا

تمہارے قبیلے کے سردار نے کیا کہا تھا

پرتو دمیلہ کی شاعری ماضی کے ٹٹھاتے چراغ، احساس کے صحرا، شکست، خواب،

ماہی مسائل کے شعور اور حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی شاعری ہے جس نے ان کی

شاعری میں غم کی لے کو اس طور پر جنم دیا ہے کہ وہ ان کی شاعری میں بھلی کی رو کی طرح بہہ رہی ہے لیکن غم کی یہ لے ڈھاویئے والی لے نہیں ہے بلکہ قلب میں نرمی اور گد اخستگی پیدا کر کے شعر کو نثری اثر بنا دیتی ہے۔ مجھے یقین ہے ان کا تخلیقی سفر اسی طرح جاری رہے گا اور وہ جدید شاعری پر اپنا گہرا نقش چھوڑیں گے جس کے سارے امکانات ان کی شاعری کے ان تینوں مجموعوں میں موجود ہیں اور یہ بات جیسا کہ آپ جانتے ہیں سب شاعروں کے بارے میں نہیں کہی جاسکتی :

دل کی اندھی دھڑکنوں کو کب ملے گی روشنی
میرے نابینا خیالوں پر جلا کب کئے گی

(۳ مارچ ۱۹۸۸ء)

راشد مفتی کی شاعری

سب سے پہلے تو میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ جن معدودے چند شاعروں کی تخلیقیت سے مجھے گہری دلچسپی ہے ان میں راشد مفتی کا نام شامل ہے۔ آج سے سترہ اٹھارہ سال پہلے سکھر کے ایک نوجوان شاعر کا کلام 'نیا دور' میں اشاعت کے لیے آیا۔ صاف ستھرا مسودہ خوش خط لکھا ہوا۔ سلیقے سے تہ کیا ہوا۔ میں نے کھولا اور پڑھا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ راشد مفتی کا وہ کلام جو اب تک نیا دور میں شائع ہوا اس میں سے پانچ سات غزلیں ان کے اس پہلے مجموعہ کلام میں بھی شامل ہیں؟ واسوخت، کی پہلی غزل بھی وہی ہے جو تیرہ بدوہ سال پہلے نیا دور میں شائع ہوئی تھی اور جس میں راشد مفتی نے خود کو اردو غزل کی روایت سے وابستہ کرتے ہوئے اپنی انفرادیت کا اظہار کیا تھا۔ شاعری راشد مفتی کے لیے وہ باطنی مجبوری ہے جس کا اظہار ضروری ہے۔ یہ احساس و شعور کا وہ قرض ہے جس کا ادا کرنا فرض ہے۔ اندھیل اور بہروں کے اس معاشرے میں آج کا دانشور آج کا شاعر اس لیے تنہا رہ گیا ہے کہ اس کی بات کوئی تو جیسے نہیں سنتے۔ اسی معاشرتی صورت حال کے پیش نظر راشد مفتی نے اپنے اس مجموعے کی پہلی غزل میں اپنی شاعری 'اپنے لائحہ عمل اور اپنے رویوں کا اعلان کر دیا ہے :

جو قرض مجھ پہ ہے وہ بوجھ آتا رہا جاؤں
کوئی نئے نہ نئے میں پکارتا جاؤں
نہ جانے میرے تعاقب میں کون کون آئے
میں اپنے نقش کش کتب پا اکبھارتا جاؤں

راشد مفتی کا زیرِ نظر مجموعہ کلام "واسوخت" قرضِ آمار نے اور وقت کی ریت پر اپنے نقشِ کعبہ پا
 ابھارنے کا تخلیقی عمل ہے۔ یہاں ہیں ایک سوالِ کپ کے سامنے اور اٹھانا چاہتا ہوں کہ آخر
 راشد مفتی نے اپنے مجموعہ کلام کا نام "واسوخت" کیوں رکھا ہے۔ واسوخت تو ایک صفتِ سخن
 ہے جس میں شاعر اپنے محبوب کی بے وفائیوں سے تنگ آکر اسے علی ٹوٹا سنا ہے اور اُسے چھوڑ
 کر کسی اور سے دل لگانے کا اظہار کرتا ہے۔ اس اعتبار سے راشد مفتی نے "واسوخت" کی صفت
 کو توثیقِ استعمال نہیں کیا لیکن واسوخت کے مزاج کو اپنی غزل میں جذب کر کے اسے ایک
 نیارنگ دیا ہے۔ یہاں ان کا ایک محبوب معاشرتی شعور اور اجتماعی احساس ہے یہی تخلیقی عمل
 ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ سلیم احمد مرحوم نے اپنی غزل میں ابھارا تھا۔ سلیم احمد کی غزل کے مزاج
 پر ابجو کارنگ غالب تھا۔ یہ غزل کا ایک نیا لہجہ تھا جس کے امکانات سب سے پہلے
 انشاء اللہ خان انشا کی غزل میں ابھرے تھے اور جو آج تک اپنے امکانات کی تکمیل کے
 لیے کسی بڑے شاعر کا منتظر ہے۔ بہر حال راشد مفتی کی غزل کا لہجہ اسی لیے نیا ہے کہ انہوں نے
 واسوخت کے مزاج کو غزل میں جذب کر کے اسے ایک نئی صورت دی ہے جس میں معاشرتی
 مزاج اور روحِ عصر نے ایک نیارنگ گھولا ہے۔ راشد مفتی کی شاعری اجتماعی مسائل
 اور معاشرتی صورتِ حال سے وابستہ ہے اور اس کے ردِ عمل سے ان کا وہ لہجہ جنم لیتا
 ہے جس میں شائستہ انداز میں جلی کٹی سنانے کا غم و غصہ والا لہجہ شامل ہے :

بھیلے ہیں اپنی جان پر ہم نے وہ حادثے
 دل مانتا نہیں کہ قیامت بھی آئے گی

خود کو کہتے ہیں جو فرزندِ زمیں

۲۹ - تمہ ڈالیں گے وہ کب مٹی میں

غزل کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ غزل اپنے اسلوب و ہیئت کے لحاظ سے تو
 بالکل نئی نہیں ہو سکتی اور نہ اس میں انفرادیت مکمل انقلابی انداز یا مسلسل ردِ بیت دشمنی

سے پیدا کی جاسکتی ہے بلکہ اس میں ایک ایسا سلیقہ درکار ہے جس سے روحِ عنصر کی ترجمانی کے ذریعے اسے اپنے عہد کا آئینہ بنایا جاسکتا ہے۔ راشد مفتی کی شاعری میں یہ سلیقہ ملتا ہے اسی لیے ان کی غزل میں انفرادیت کے خدو خال نمایاں ہیں۔ یہ چند شعر سنئیے :

اب تو سارے چھلے زمین سے ہیں
آگے شاکی تھے آسمان سے لوگ

صل کے جاذب کا جب کسی طرف کو میں
تو بڑے کے چیر گیا دشمنوں کی صف کو میں

یہی کہ قید ہوئے اپنی اپنی خلوت میں
نہیں کہو کہ ہمیں کیا ملا محبت میں

راشد مفتی کی شاعری میں بعض اہم واقعات سے اشارے بھی ملتے ہیں جن میں جذبہ کی شدت نمایاں ہے لیکن انھوں نے اپنی شاعری میں روزمرہ زندگی، عمومی تجربات اور معاشرتی صورت حال کو بیان کرنے کی سلسل کو شش کی ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری انفرادی سہانی اور واقعیت کا روپ دھارتی ہے مثلاً یہ شعر دیکھیے۔

گھر میں کون سا سکھ ہے راشد
دل گرفتہ جو میں دفتر میں رہوں

درو دیوار پہ تحریر نظر آتی ہے
اطلاعات جو اخبار نہیں دے سکتا

جب بھی مقتل میں پھکارا جاؤں

گھر کی دہلیز پہ مارا جاؤں

ہر شاعر اپنے معامروں کے اثرات قبول بھی کرتا ہے اور ان کو متاثر بھی کرتا ہے۔
راشد مفتی کی شاعری میں اس عہد کے قابل ذکر شعرا کے اثرات گھٹے ملے نظر آتے ہیں جن
میں فیض، ہاجر کاظمی، سلیم احمد اور میر نیازی کا ذکر کیا جاسکتا ہے لیکن ان سب میں سلیم احمد کا
اثر سب سے زیادہ ہے اور اس کی وجہ وہی ہے جس کا ذکر میں نے ابھی آپ کے سامنے
کیا تھا کہ سلیم احمد نے بھی اپنی غزل کا نیا ہجو اور واسوخت کے مزاج کو غزل میں جذب
کمر کے بنایا تھا اور یہی عمل راشد مفتی نے بھی کیا ہے۔ عمومی تجربات اور معاشرتی حوالے دونوں
کی شاعری کا مزاج ہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ اثر سے یہ مراد نہیں ہے کہ ایک شاعر دوسرے
شاعر کی نقالی کر رہا ہے۔ اثر سے میری مراد یہ ہے کہ راشد مفتی نے سلیم احمد کے لہجے سے
اپنا مخصوص ہجو بنانے میں اثر قبول کیا ہے۔ ابھی سلیم احمد کی آواز فضا میں گونج رہی ہے۔
اس آواز کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب آپ راشد مفتی کے یہ چند شعر لے لیں:

بخشمش میں ملی تھیں چند کلیاں

تادان میں باغ دے رہا ہوں

اسی انبوہ سے نسبت رکھوں

اسی بارے ہوئے لشکر میں رہوں

اب تو دیوارِ گمرانی ہوگی

میرے قامت سے یہ در چھوٹا ہے

چاہتے ہیں جو مجھ سے قربانی

کبھی خود بھی کریں کوئی ایثار

بھلا ہوا کہ بہت دن یہ سلسلہ نہ رہا
میں خود کو بھول چلا کھاتری محبت میں

یہ کوئی مقالہ نہیں جس میں تفصیل کے ساتھ میں راشد مفتی کی شاعری کا تجزیہ
کروں۔ اس وقت تو اتنا ہی کافی ہے کہ میں یہ بتاؤں کہ راشد مفتی اس دور کے قابلِ ذکر
اور ممتاز شاعروں میں شامل ہیں جنہوں نے غزل میں اپنے مخصوص ہیجے کو نمایاں کر کے اپنی
حیثیت منوائی ہے۔ اب ان کا پہلا مجموعہ کلام شائع ہو گیا ہے اور اس کی اشاعت سے
ان کی شہرت اور ان کے تخلیقی سفر کا ایک نیا باب شروع ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ اپنے
دوسرے مجموعہ کلام کی بھی جلد دنیا دہائیں گے تاکہ وقت کی ریت پر اپنے نقش کف پا
ابھارنے کا عمل جاری رہ سکے۔ کچھ کے نقار خانے میں طوطی کی صدا کوئی سُنے نہ سُنے
لیکن اسے بلند رکھنا سب سے اہم کام ہے۔ راشد مفتی نے یہ اعلان اپنے مجموعے و اسوخت
کے پہلے شعر میں ہی کر دیا ہے۔ ع

کوئی سُنے نہ سُنے میں پکارتا جاؤں

۔ یہی اس دور کا المیہ ہے اور یہی مردانِ حق کا رویہ ہونا چاہیے۔

صادق نسیم کی غزل

میں صادق نسیم صاحب کو ذاتی طور پر نہیں جانتا لیکن ان کی شاعری کے واسطے سے انھیں پہچانتا ہوں۔ شاعری اگر شخصیت کا اظہار ہے تو آپ شاعر کو ذاتی طور پر جاننے بغیر بھی بخوبی جان سکتے ہیں، اس کے باطن کی گہرائیوں میں جھانک سکتے ہیں، اس کے مزاج کی تہ لے سکتے ہیں اور جب وہ آپ سے ملے تو یوں معلوم ہو کہ آپ تو اس شخص سے پوری طرح واقف ہیں۔ لیکن یہ عمل اسی وقت ہو سکتا ہے جب شاعر نے محض روایتی شاعری نہ کی ہو بلکہ زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں چلتے ہوئے جھنڈے تجڑوں کو اپنی شخصیت کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہو۔ صادق نسیم کی شاعری میں ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کتنی شاعری ہے اور اس میں حقیقی تجڑوں نے زندگی کا رنگ و نور بھرا ہے۔ ان کے اشعار اسی لیے ہمارے دامن دل کو کھینچے ہیں۔

”رنگِ رواں“ کسی نو عمر پائے شاعر کا کلام نہیں۔ یہ ایک ایسے پختہ ذہن شاعر کا کلام ہے جو برسوں سے شعر کہہ رہا ہے، جس نے شعر و ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے، جسے زبان و بیان ہر قدرت حاصل ہے اور حوالے تجڑوں کو موزوں ترین لفظوں میں ڈھالنے کا سلیقہ رکھتا ہے۔ صادق نسیم غزل کے شاعر ہیں اور غزل کی روایت بڑی ظالم چیز ہے۔ کوئی غزل گو شاعر اس سے دامن بچا کر نہیں گذر سکتا لیکن اگر وہ روایت کے چنگل میں پھنس گیا تو پھر انھیں باتوں کو دہرانے لگے گا جو اس سے بہتر طریقے پر پرانی نسل کے شعراء کہہ چکے ہیں۔ ہمارے سامنے ایسے لاتعداد شعراء ہیں جو مسلسل غزل کہہ رہے ہیں لیکن ان کی غزل سن کر پا پڑے کہ نہ صرف طبیعت سکندر ہو جاتی ہے بلکہ

غزل کے باسی پن سے کفن و کا فونک پڑا آتی ہے۔ برخلاف اس کے وہ غزل گو جو روایت کا شعور حاصل کر کے اُسے اپنے چاروں طرف کھلی ہوئی زندگی کے تجربات سے ہم کنار کر دیتے ہیں ان کی غزل کی جاذبیت سننے والوں کو پُر کیف کر دیتی ہے۔ صادق نسیم اسی قسم کے غزل گو ہیں، ریگ رواں کا مطالعہ کرتے ہوئے اسی لیے دو باتیں ہمیں خاص طور پر متاثر کرتی ہیں : ایک یہ کہ صادق نسیم کو غزل کی روایت کا گہرا شعور ہے اور وہ اس روایت میں بدلتی زندگی کے نئے طرز احساس کو شامل کر کے اُردو غزل کی روایت کا حصہ بنانے کی قدرت رکھتے ہیں، دوسرے یہ کہ اُن کی شاعری میں دل اور دماغ دونوں شریک ہیں۔ اُردو غزل کی کبھی وہ روایت ہے جسے غالب نے دوام بخشا تھا۔ صادق نسیم کے ہاں دل کی ہستی پوری گہما گہمی کے ساتھ آباد ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ باہر کی دنیا سے بھی اس کا رشتہ قائم ہے۔ اسی لیے اُن کی غزل میں ایک انبساط، ایک سرخوشی اور کیف و نشاط کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے ہاں غم گمن بن کر نہیں چلتا بلکہ نشتر بن کر ایک نیا حوصلہ دیتا ہے۔ یہاں غم درد تو ہے ہی لیکن ساتھ ساتھ دوام بھی ہے۔ تیرگی اُن کے ہاں مشعلیں جلاتی ہے اور درمیان کے فاصلے مٹا دیتی ہے۔ غم عشق اور غم زمانہ دونوں بیک وقت زندگی کا حصہ بن کر سامنے آتے ہیں اور بحیثیت مجموعی زندگی کی ترہائی کرتے ہیں۔ اُن کی تنہائی میں اہل محفل شامل ہیں لیکن محفل پر تنہائی کا احساس بھی موجود ہے۔ زندگی کا یہ حقیقی تضاد ایک نئے آہنگ کے ساتھ ان کی شاعری میں ابھر رہا ہے اور اسی لیے اُن کی شاعری میں سکوت کی بجائے کلام، تجدد کی بجائے حرکت اور قیام کے بھلے سفر کا احساس ابھرتا ہے۔ سفر صادق نسیم کی شاعری میں زندگی کا استعارہ ہے اور بار بار اسی طرح کے خواہمیر درد کی طرح اُن کی شاعری میں آتا ہے۔ ریگ رواں ابھی اسی سفر کا اشارہ ہے :

نہ جانے کیسے سفر کی ہے آرزو دل میں
میں اپنے گھر میں ہوں صادق مسافروں کی طرح

تمام دن کی مسافت گزار کر ہر شب
لگے جو آنکھ تو خواہوں میں بھی سفر دیکھوں

گرداب ہوں گردش مری تقدیر ہے عادی
میں گھر میں بھی ہوتا ہوں تو رہتا ہوں سفر میں

ہر قدم پر یہی ہوا محسوس _____ زندگی بھر سفر کیا جیسے

موج در موج سفر ہے اپنا _____ اور تاحہ نظر دریا ہے

اسی سفر نے صادق نسیم کی شاعری میں تخیل کا کیمیا اور رنگارنگی پیدا کر کے ان کی شاعری کو یکہ نصرت کی لڑائی اور شکست سے بچا لیا ہے۔ اس احساس سفر نے ان کے تجزیوں کو وسعت دی ہے، ان کے احساس کو پھیلا دیا ہے، ان کے جذبات میں نئے نئے رنگ بھرے ہیں، ان کے شعور کو وہ حوصلہ دیا ہے جہاں ہر چھوٹی بڑی بات یا معنی نظر آنے لگتی ہے۔ ان کی غزل کی تازگی کا یہی راز ہے۔

صادق نسیم کے ان ایک بات اور بھی قابلِ توجہ ہے۔ وہ اپنے جذبہ و احساس کو نہ گہرا منظر سے ملکا کر اس طور پر بیان کر دیتے ہیں کہ یہ منظر اس مخصوص احساس یا جذبے کا حصہ بن کر اثر کا جادو جگاتا رہتا ہے۔ یہ تخلیقی عمل ان کے اظہار کا اہم وسیلہ ہے:

ہر روز ڈھونڈتا ہوں تیری یاد کا اُفق
میں آفتابِ شام کی صورت تھکا ہوا

وہ تو ہے تیرے سایہ مڑگاں میں خیمہ زن
گو یا جلو میں شام کے منظر سحر کا ہے

یہ خواب خواب سا منظر یہ کھوئی کھوئی انصاف
کہ جیسے کوئی فساد سُنا رہی ہو ہوا

رقصاں ہے غنچہ غنچہ رنگِ شاخ شاخ میں
مینا میں جیسے موجِ صہبا دکھائی دے

صادق نسیم اپنے احساس و جذبہ کو خارجی منظر کے حوالے سے اس طور پر بیان کرتے ہیں کہ یہ احساس و جذبہ پڑھنے یا سننے والے تک پہنچ جاتا ہے۔ یہی وہ فنی غریب ہے جسے ٹی۔ ایس ایلیٹ "معروضی تلازمات" کا نام دیتا ہے۔ ابلاغ صادق نسیم کے ہاں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک باشعور شاعر ہمیشہ سے کرتا آیا ہے۔ ان کے معروضوں کی سجاوٹ، لفظوں کا انتخاب اور جملہ بات کو پورے طور پر بیان کرنے کی کوشش نے ان کی شاعری میں وہ قوت پیدا کر دی ہے کہ وہ پڑاثر ہو گئی ہے۔ ان کے لہجے میں گھلاوٹ ہے اور خوش آہنگی بھی۔ ان کے اظہار میں رس ہے اور توانائی بھی اور ساتھ ساتھ وہ ایسا صاف ستھرا، واضح لہجہ ہے جسے ہم صادق نسیم کی شاعری سے واقف ہو کر آسانی سے پہچان سکتے ہیں اور یہ ایسی بات ہے کہ ہم اس دور کے بہت کم غزل گوؤں کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، اسی لیے میں صادق نسیم کو جدید اردو غزل کا ممتاز شاعر اور "ریگب رداں کو ایک قابلِ قدر مجموعہ سمجھتا ہوں۔"

جیسے میرے اسلاف تھے ویسا تو نہیں میں

مجھ سا بھی مگر کوئی یہاں کون رہا ہے

صادق نسیم کی غزل میں اور بھی کئی باتیں قابلِ ذکر ہیں جنہیں ان کے اشعار کے حوالے سے واضح کیا جاسکتا ہے مثلاً ان کی غزل کے مزاج اور لہجے میں فراق گورکھپوری کی آواز بول رہی ہے جسے اپنا ناہم اشعار کے بس کا لوگ نہیں ہے۔ پھر انھوں نے روایتی علامتوں کے ذریعے نئے مضامین باندھے ہیں اور اپنے دور کے کرب کو بھی سمویا ہے۔

کیسے رہ سکتی ہیں جنت کی فضا میں شفا

حاکم آڈانے کو ہیں لوگ دہاں بھی ہوں گے

جس شخص کو بھی دیکھیے طالبِ شکر کا ہے

ایسا بھی کوئی ہے کہ جسے غم شجر کا ہے

تھا تیر ہی کا دور غنیت کہ اُن دنوں
دستار ہی کا ڈر تھا مگر اب تو سر کا ہے

یا وہ گھرے احساس کو سامنے کے لفظوں میں یوں آسانی سے بیان کر دیتے ہیں :

دیکھتے ہی مجھے محسوس ہوا جیسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے

دیکھتے . دیکھتے ہر اک چہرہ تیرے چہرے میں بدل جاتا ہے

جب بھی تری قوت کے کچھ اسکاں نظر آئے

ہم خوش ہوئے اتنے کر پریشاں نظر آئے

یہ اور کئی ایسی باتوں کا اور بھی ذکر کیا جاسکتا ہے لیکن میں تو اُن کی شاعری کو آپ سے

صرف متعارف کرارہا ہوں اسی لیے میں نے یہاں صرف چند بنیادی باتوں کی طرف

اشارہ کر دیا ہے اور اسی لیے میں نے اُن کے اچھے اشعار کا انتخاب بھی یہاں جان بوجھ کر

نہیں دیا ہے۔

(۵۱ جنوری ۱۹۷۹ء)

افسردہ پوری کی غزل

میں نے افسردہ پوری کو پہلی بار ڈھاکہ میں دیکھا تھا۔ یہ کوئی بیس سال پہلے کی بات ہوگی۔ یہی وضع قطع تھی جو آج ہے۔ فرق اتنا تھا کہ پہلے وہ بہت چاق و چوبند تھے اب قدرے کم ہیں۔ ادب کے رسما اس وقت بھی تھے اور آج اس سے بھی زیادہ ہیں۔ پہلے ہوائے مخالفت میں چراغ جلاتے تھے اور اب ہوائے موافق میں دل جلاتے ہیں۔ چلنے اور چلانے کا مشغلہ پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے۔ یہی شاید ادیب اشاعر اور دانشور کا مقدر ہے۔ اُن سے چلے تو ان کے خلوص کی خوشبو اور فکر و فن کی چاندنی دل کو موہ لیتی ہے۔ بے نیازی میں سلیقہ اور نیا زمندی میں رکھ رکھاؤ ایسا کہ جو ملے گرویدہ ہو جائے۔ ادب اور اختیار میں شاید اللہ واسطے کا بیڑ ہے۔ صاحب اختیار کبھی نہیں تھے لیکن صاحب ادب پہلے بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ یہی ان کی شناخت اور یہی ان کا امتیاز ہے۔ میں نے ان کے مضامین بھی پڑھے ہیں اور شاعری بھی۔ اپنے مضامین میں انہوں نے مشرقی پاکستان کی تہذیبی روح کو اردو کچر میں منتقل کیا۔ قاضی نذر الاسلام کی ۲۵ اسلامی نظموں کے منظوم تراجم کیے۔ اردو ادب کو ہنگالی ادب سے اور ہنگالی ادب کو اردو ادب سے روشناس کرایا۔ یہ عمل بغیر سیاست کے انصاف کے ساتھ اگر معاشرتی و معاشی سطح پر جاری رہتا تو آج بھی دونوں ایک ہوتے۔ نا انصافیاں شب و صبح کو شام فصل میں بدل رہی ہیں۔ یہ سن نہ مہ نے اُس وقت سیکھا تھا اور نہ آج اُسے سیکھ رہے ہیں۔ تاریخ ہمارا علم رہا ہے۔ دنیا زمانے نے ہم سے سیکھا تھا لیکن ہم گزشتہ کئی سو سال سے تاریخ سے کچھ نہیں سیکھتے۔ روشنی ہو جائے تو اللہ کی دین ہے۔ اندھیرا چھا جائے تو رخصائے الہی ہے۔

نہ کچھ کرتے ہیں۔ نہ کرنے دیتے ہیں۔ یہی ہمارا حال ہے۔ ماضی کبھی شاندار تھا۔ مستقبل اللہ بہتر کرے تاکہ ہماری آنے والی نسلیں پو توں پھلیں اور سدا آباد رہیں۔

جناب افسر ماہ پوری شاعر بھی ہیں اور نقاد و افسانہ نگار بھی۔ ادب ان کا مقصد حیات ہے۔ ساری عمر اسی میں لگادی۔ ہماری نسل کا یہ دستور تھا کہ ساری عمر تخلیق ادب کے کام میں لگی رہتی تھی۔ شہرت برسوں کے ریاضے کے بعد آہستہ آہستہ پہنچتی تھی۔ شہرت کام سے تھی۔ کام پہلے مشہور ہوتا تھا اور نام کی باری اس کے بعد آتی تھی۔ آج صورت حال ذرا دوسری ہے۔ کام پیچھے اور نام آگے۔ اسی لیے کام کوئی نہیں کرتا نام کو شب و روز مانگتے رہتے ہیں۔ جلت پھرت، ارٹھتے نالتے، ٹی دی، ریڈیو، اخبار، جلتے یہی تخلیق ادب کا راستہ ہیں اور یہی منزل۔ کسی سے پیچھے اخبار ٹی دی کی بات کرے گا۔ کتاب کی بات اب کوئی نہیں کرتا۔ کون سی نئی کتاب آئی۔ کون سی آنے والی ہے۔ اب شاید یہ ہمارا مسئلہ ہی نہیں رہا۔ تا شا با حارہ گیا ہے۔ یہ ماشاء اللہ خوب بک رہا ہے۔

جناب افسر ماہ پوری نے آج سے چالیس بیالیس سال پہلے لکھنا شروع کیا تھا اور اب ۱۹۸۶ء کے اواخر میں ان کی پہلی کتاب یعنی شاعری کا پہلا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ یہ کام اگر پہلے ہو جاتا تو اچھا ہوتا لیکن دیر آید درست آید کے مصداق آج بھی فہیمت ہے۔ ان کا مجموعہ کلام ”غبارِ ماہ“ پڑھ کر یوں محسوس ہوا کہ مجلسِ ادب نے والی گرمی میں تازہ ہوا کے جھونکے نے تازہ دم کر دیا ہے۔ سلیقے سے جڑے ہوئے الفاظ اور ان میں احساس و جذبات کی خوشبو بہت سے شعروں میں اتر گئے۔ چند شعر آپ ہی سن لیجیے:

ہیں کبھی تو نظر آئے گا ترا چہرہ
اسی خیال سے پنجر کو صاف کرتے ہیں

اسیرانِ قفس کو کیا خبر ہوگی بہاراں کی
نسیم صبح اب غلشن میں ہی مشکل سے آتی ہے

ہم تو دنیا بھی کر کے خطاوار ہی رہے
تم خود بتاؤ کوئی طریقہ نسیا کا

بھیلی ہوتی ہے بزم میں ایسی بھی داستاں
ہم نے ابھی کبھی نہیں، تم نے ابھی سنی نہیں

ان اشعار میں روحِ عصر بھی ہے۔ وہ روحِ عصر جس میں آپ بیتی جگمگاتی بن جاتی ہے اور وہ سلیقہٴ اظہار بھی جس میں لہجے کا دھیملا پن سادگی بن کر دل میں اتر جاتا ہے۔ مزہ شدت، فلو کہ جذبات کے پر نالے پہنے لگیں اور مزہ اختلاطِ جذبات کہ اظہارِ الجھ کر رہ جاتے اور شاعر کی بات قاری تک نہ پہنچے۔ ان کے اشعار میں جذبہٴ آئینہ کی طرح شفاف اور احساسِ چاندنی کی طرح دلفریب ہے۔ اسی تخلیقی عمل سے ان کا لہجہ بنتا ہے جو شعر کو پُر اثر بنا دیتا ہے :

یاد آتے ہیں کبھی وہ تو پتا چلتا ہے

بیت جاتے ہیں گھڑی بھر میں زمانے کتنے

دیکھنا یہ ہے کہ محفل میں محبت کے دیئے

کتنے انساں نے سمجھائے ہیں ہوائے کتنے

میں انسترامہ پوری کی شاعری کے بارے میں کچھ اور باتیں بھی کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ تو وہ ہیں جو آپ پہلے ہی سن چکے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو "غبارِ ماہ" میں آپ پڑھ چکے ہیں اس لیے ان کو دہرانے کا جزم میں نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ ایک بات یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اس مجموعہٴ کلام کو خود بھی پڑھیے آپ کی داستانِ حیات اس میں رقص کی گئی ہے۔ وہ داستانِ حیات

جو آپ کی ضرورت ہے لیکن ہم سب کا مشترک ورثہ ہے اور اس کے داستان گو حضرت
افسر ماہ پوری ہیں :

دیکھ کے مجھ کو یہ اندازہ لگا لو افسر
رنج کتنا ہے زمانے میں خوشی ہے کتنی

(۴ جون ۱۹۸۷ء)

جمیل عظیم آبادی کی غزل

کتاب کی تعارفی تقریب کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ حاضرین کے دل میں نئی کتاب پڑھنے کا جذبہ بیدار کیا جائے اور مصنف کی اتنی حوصلہ افزائی ضرور کی جائے کہ وہ اس دور پر آشوب میں لکھنے پڑھنے کے کام کو جاری رکھ سکے۔ ایک ایسے معاشرے میں جو زر پرستی کی وہابی بیماری میں شدت سے مبتلا ہے اور ذہنی و تخلیقی سطح پر ایک حق و رق صحرا بن کر رہ گیا ہے پوری آواز سے اذان دینا کارِ ثواب بھی ہے اور تقاضائے وقت بھی۔ کتاب کی تعارفی تقریب دراصل انہوں اور بہروں کی بستی میں زور زور سے بولنے کی ایک ایک کوشش ہے تاکہ بات ان تک پہنچ جائے جو دیکھنے سے گریز اور سننے سے احتراز کر رہے ہیں۔ اسی لیے جمیل عظیم آبادی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے وقت کی تیز رفتاریوں میں تخلیق کا دیار روشن رکھا اور شاعری سے نہ صرف اپنا تزکیہ نفس کیا بلکہ معاشرے کے جذبات و احساسات کی بھی ترجمانی کی۔ جمیل عظیم آبادی کا کلام پڑھتے ہوئے اکثر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ میرے دل کی بات اپنی زبان سے کہہ رہے ہیں۔ اسی لیے ان کے شعر دل پر اثر کرتے ہیں۔ وہ ایک دل درد مند رکھتے ہیں۔ انہیں اپنی ذات سے پیار ہے لیکن اس سے زیادہ ان لوگوں سے پیار ہے جو ان کے ارد گرد چل پھر رہے ہیں۔ جن کی زندگی مسائل کا شکار ہوتے ہوئے بھی ایک جیت رکھتی ہے۔ وہ پیارے لوگ جو آفت زدگی میں بھی اپنے عقائد اور اپنے وطن کا پرچم بلند رکھتے ہیں۔ جن کی زبانیں بند ہیں لیکن جو آنکھ سے وہ سب کچھ کہہ رہے ہیں جو زبان سے کہا جاتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو جمیل عظیم آبادی کے منقلب ہیں اور اسی وجہ سے وہ اپنی بات ایسے صاف ستھرے سادہ

اور واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ ان کی بات کسان سے ابلاغ کرتی ہے۔ یہی ان کا فن ہے اور اسی میں ان کی شاعری کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔

جمیل عظیم آبادی کی شاعری کا تعلق براہ راست زندگی سے قائم ہے۔ وہ اسی زندگی سے اچھے وہ بے سر کر رہے ہیں، تجربوں کے جگنو شاعری کے رومال میں اکپڑتے ہیں اور پھر ان سے فضا کو روشن کر دیتے ہیں۔ زندہ تجربوں کے یہی جگنو ان کی شاعری کو شبنم عطا کرتے ہیں۔ انھیں کو روشن کرتے ہیں اور لہجے کو پھوار کی سی نرمی عطا کرتے ہیں جمیل عظیم آبادی سچائی کے شاعر ہیں۔ وہ سچائی جس کی قسم تو سب کھلتے ہیں لیکن بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اسی لیے ہمیں ایک جہت ملتی ہے۔ وہ جہت جو منزل کا راستہ دکھاتی ہے۔ جذبہ و احساس کو نکھارتی ہے اور انسان کو کٹھن بنانے میں مدد کرتی ہے جمیل عظیم آبادی کی شاعری میں ہمیں وہ معاشرتی شعور بھی ملتا ہے جس سے شاعری ہا معنی ہو جاتی ہے اور تخلیق بے مقصدیت سے نکلا کر جذبول کی قسطیں اور تہذیب کا کام انجام دیتی ہے۔

دوہری ہجرت کا آشوب جمیل عظیم آبادی کی شاعری کی روح میں رنگ کی مانند گھٹا ہوا ہے۔ یہ تجربہ ان کا انفرادی تجربہ ہی ہے اور اجتماعی تجربہ بھی۔ ایسا تجربہ جس کا گہرا اثر ان کی شاعری میں موجود ہے۔

شریب شہریوں، یارب کہیں امان تو دے
جو دی ہے دھوپ تو پھر سر پہ سائبان تو دے

راس آئی نہ فصل بہاراں ہمیں
تم وہاں کھو گئے، میں یہاں کھو گیا

سب کچھ لٹا کے راہ و فامیں ہیں مطمئن
ہم اہل دل کا جذبہ ایثار دیکھنا

ہنستا ہوا یہ شہر سرشام سو گیا
سیلِ بلا کے ہوں نہ یہ آثار دیکھنا

صحرا کے خار و خس کو بھی ایک زندگی ملی
جب رنگ و بو کے قافلے گلزار سے چلے

دوہری ہجرت کا یہ خمرِ عہدِ عظیم آبادی کی شاعری کا بنیادی تجربہ ہے اور اسی
لیے ”دل کی کتاب“ پڑھنے والے کے دل پر اثر کرتی ہے۔

(۲۷ اکتوبر ۱۹۸۵ء)

غنی دہلوی کی غزل

آج ہم جس کتاب کی تقریب رونمائی میں جمع ہوئے ہیں وہ ایک ایسے شاعر کا مجموعہ کلام ہے جس نے اپنی ساری عمر ادب و شعر کی خدمت میں بسر کی ہے۔ جناب طغی دہلوی ہم میں سے اکثر سے عمر میں بڑے ہیں۔ بعض تو ان سے اتنے چھوٹے ہیں کہ ان کی شعر گوئی کی عمر بھی ان سے بڑی ہے۔ جناب غنی دہلوی نے شاعری کو ایک ایسی سنجیدہ تخلیقی سرگرمی کے طور پر اپنایا ہے کہ اپنی ساری عمر اس کے فروغ کے لیے وقف کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قادر الکلام پرگو شاعر ہیں۔ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں لکھنے کی ہے۔ غزلیں بھی کہی ہیں اور رباعیاں بھی انگیت بھی کہے ہیں اور دوہے بھی لیکن ان کا کلام ابھی تک شائع ہو کر لوگوں تک نہیں پہنچا۔ یہ ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو شاخساز کے نام سے شائع ہوا ہے اور اس میں بھی وہ ساری غزلیں شامل نہیں ہیں جو وہ کہ چکے ہیں۔ وہ دولت مند آدمی نہیں ہیں اور ہمارے معاشرے کو زبردستی کی دوڑ میں اتنی فرصت نہیں کہ وہ اپنے شاعروں کا خیال کرے، ان کی حوصلہ افزائی کرے، ان کی سرپرستی کرے اور ان کے کلام کو منظر عام پر لائے تاکہ معاشرہ اپنی دھڑکنوں کی صدا سن سکے۔ ہمارے معاشرے میں جو جھٹکن ہے، مسموم فضا ہے جو وہ مزاجیاء ہے بے سکونی اور بے مہی کی کیفیت میں جو وہ مبتلا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ معاشرے نے شعرے لطف لینے اور اپنے دل کی کیفیات و جذبات کو شعر کی زبان میں سننے کا عمل بند کر دیا ہے۔ اب سے دس سال پہلے تک گھر گھر مشاعرے ہوتے تھے، شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور جو کچھ معاشرے میں ہوتا تھا اس کے تاثرات کو شعر کی زبان میں سن کر ہم اپنی بے لطفی کے معنی اور بے مہی کی کیفیات کو غسل دے لیتے تھے اور پھول کی طرح ہلکے ہو کر اپنا خزانہ کر لیتے

تھے۔ یہ میرا تجربہ ہے اور آپ بھی یہ تجربہ کر کے دیکھئے کہ جو کچھ آپ کے چاروں طرف ہوتا ہے یا پورا ہے شاعر اس کیفیت کو اپنے شعر میں اس طور پر کودتا ہے کہ اس میں تاثیر کارنگ جاگ اٹھتا ہے۔ آج بھی کسی مشاعرے میں چلئے تو لوگ ان اشعار پر داد دیں گے جن میں معاشرے میں چلنے والی ہواؤں کا جاہ و جاگ رہا ہے۔ آپ سامعین کی داد سے اسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آج معاشرہ کیا سوچ رہا ہے اس کے دل میں کن چیزوں نے گھر کر دکھا ہے اور اب آنے والے زمانوں میں ہوا کیا رخ اختیار کرے گی۔

وہ معاشرے برف کی طرح ٹھنڈے اور منجمد ہونے لگتے ہیں جو شعر سے بے نیاز ہو جاتے ہیں جن کی زندگی پر شاعری اثر انداز ہونا بند ہو جاتی ہے۔ آپ شعر سنئے شعر پڑھیے، محفل شعر و سخن منعقد کیجیے شاعروں کو اہمیت دیجیے ان کی سرپرستی کیجیے تو آپ خود اس تبدیلی کو محسوس کریں گے جو نتیجے کے طور پر ظہور میں آئے گی۔ یہ سفاکی، یہ بھیمیت، یہ درندگی جو اس وقت ہم اپنے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے جذبات میں بھرے ہوئے ہیں اور تزکیے جذبات کا عمل جو شعر کے ذریعے یا دوسرے فنون لطیفہ کے ذریعے ہوتا ہے، بند ہو گیا ہے۔

ہماری صحت مند زندگی کے لیے شعر ویسا ہی ضروری ہے جیسے صاف ہوا جسم انسانی کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ حضرت غنی دہلوی نے ایسے ہی شعر کہہ کر ہمارے جذبات کی تطہیر اور تزکیہ کا بندوبست کیا ہے۔ آپ ان کے شعر سنئے یا پڑھیے تو آپ محسوس کریں گے کہ وہ ہمارے دل کی بات اپنی صاف ستھری اکثر توسنیم سے داخلی زبان میں اس طور پر کہہ رہے ہیں کہ ان کے شعر ہماری زبان پر چڑھ کر ہمارے جذبات اور ہماری دلی کیفیات کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ آپ اس مجموعہ کلام کو آپس سے پڑھ لیجیے غنی دہلوی آپ کے دل سے دل کی بات کرتے سنائی دیں گے۔ یہ کہہ کر جب میں ان کا مجموعہ کلام کھولتا ہوں تو یہ شعر سامنے آتے ہیں۔ دیکھیے یہ ہم سے کیا کہہ رہے ہیں:

رفتہ رفتہ لٹ گیا شمع فروزاں کا سہاگ

صرف پروازوں کے دم تک تھی بہارِ انجمن

دیکھیے یہ ہاتھ کس کا ہے گلوں کے شوق میں

رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے جانبہ شاعر حسن

لے غنی اب تم کرو صحرائیں کی تلاش

ایسے لوگوں سے ملو جن کا نہ ہو کوئی وطن

ان اشعار میں رموز و کنایات وہی ہیں جو اردو غزل میں عام طور پر استعمال ہو۔

رہے ہیں۔ لیکن غنی دہلوی کے ہاں یہ کنائے ہمارے دور کا اشارہ بن کر ہمارے دلوں کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ پختہ کلام، موزوں لفظوں کے موتی شاعری کی مانگ میں سلیپتے جڑے ہوئے۔ یہ غنی دہلوی کا کلام ہے۔

غنی دہلوی نے ہجرت کا دکھ اٹھایا ہے ۱۹۴۷ء میں اپنے سارے خاندان کے افراد کے ہمراہ قتل کے سانحے سے دوچار ہوئے۔ میں۔ اگر وہ شاعری ذکر کرتے تو یقیناً پاگل ہوجاتے یا کلچر پھاڑ کر مرنے لگتے۔ انھوں نے یہ پہاڑ جیسا غم اور اس کے تھمروں کی صفائی کو شاعری کے وسیلے ہی سے برداشت کیا ہے۔ ان کی شاعری میں تجربے کے بے شمار پہلو سامنے آکر ان کے دل کی اور ہمارے جذبات کی تصویر بن گئے ہیں:

اس شہر جنوں میں کس کس کو مفہوم خرد بچھاؤ گے

ہر شخص یہاں دیوار ہے زنجیر کے پہناؤ گے

وہ ایک شعر اور سنتے چلیے :

جو تھے غم کے کل بج تھے دشت و جبل

وہ مے گھر کے دیوار و در ہو گئے

محسوس یہ ہوتا ہے روشام و سحر میں

میں ٹھہر گیا ہوں مری منزل ہے سفر میں

وہ ایک سانس جسے میں نے زندگی سمجھا

وہ ایک سانس بھی سینہ نکا رگزداری ہے

حرم ہوا شہر نگاراں ہوا، میکہ کہ چین

کہاں کہاں سے تری رہ گزار گزری ہے

غزل کا لہجہ، غزل کا چھب آتے بدل گیا ہے لیکن غزل کا قدیم لہجہ آج بھی لطافت دیتا

ہے اور ہمارے گوش میں اتر جاتا ہے۔ غزل دہلوی اس لہجے کے محافظ اسی انداز کے داعی اور

اسی چھب کے شہدائی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ دو جلد از جلد اپنے بقیہ کلام کو بھی اشاعت

سے ہم کنار کر دیں۔ ورنہ میں روز بروز سان میں معلوم نہیں سیلاب بنا پھر کہاں جا کے ادا
کس طرح جائے۔

صابر ظفر کی غزل

کتابوں کی رونمائی ویسے تو اب ایک عام سی بات ہو گئی ہے لیکن اچھی کتاب جب بھی رونما ہوتی ہے تو میرا خیال ہے کہ یہ قوم کی ذہنی و فکری دنیا میں ایک اہم واقعہ کی نوید ہوتی ہے۔ اس نوید میں کوئی سنسنی تو ہرگز نہیں ہوتی لیکن اچھی کتاب اپنے سے پہلے بھی جاننے والی کتابوں کی موجودہ ترتیب کو بدل کر خود اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ دھواں اور پھول صابر ظفر کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اور جس میں چار پانچ شعریں ۸ غزلیں اور ۱۶ مسترق اشعار شامل ہیں لیکن شاعری کے اعتبار سے یہ ایک ایسا مجموعہ ہے کہ بہت جلد دورِ حاضر میں موجود مجموعہ بنائے کلام میں اپنا مقام پیدا کر لے گا۔ یہ بات میں نے اس لیے کہی کہ اس دور میں جب شعری مجموعے کثرت سے شائع ہو رہے ہیں، بہت کم مجموعے ایسے ہیں جو شاعری اشعار نہ لہجے اور احساس کی لطافت و نازکی کے اعتبار سے صابر ظفر کے اس مجموعے کو پہنچے ہیں۔ اس مجموعے کو پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ لمبی دیری تو صابر ظفر مہربان نہیں ہے لیکن سرسوتی صابر ظفر پر یقیناً مہربان ہے اور اس وقت سے مہربان ہے جب ۱۹۶۷ء میں صابر ظفر نے اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ نیا دور کی ٹراک میں جب جی کسی معروف لکھنے والے کی کوئی تحریر آتی تو میں اسے الگ کر لیتا اور جلدی سے پڑھ کر اس کے بارے میں فیصلہ کر لیتا لیکن غیر معروف اور نئے لکھنے والوں کی چیزیں ایک فائل میں رکھ دیتا کہ پہلی فرصت میں انہیں توجہ سے پڑھوں گا۔ پھر یہ پہلی فرصت اتنی دیر سے میسر آتی کہ اکثر نئے لکھنے والوں کی تحریریں ہامی ہو جاتیں۔ ایک دن میں ایسے ہی لکھنے والوں کا کلام دیکھ رہا تھا کہ سینکڑوں غزلوں کے انبار میں ایک غزل سامنے آئی کہ شاعر کا نام صابر

ظفر والی "نقا" یہ نام میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا اور پھر مدبر کے ساتھ ظفر والی کی ترکیب کچھ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے مدبرانہ دیانت کے پیش نظر پوری غزل پڑھی اور غزل پڑھ کر روح تازہ ہو گئی۔ مطلع تھا:

مد سے کوئی شخص اگر بڑھا ہے
ماحول نے قید کر لیا ہے

میں نے غزل پڑھی اور اسے نیا دور کے لیے منتخب کر لیا جو نیا دور کے شمارہ ۵۵/۵۶ میں شائع ہو گئی۔ اس کے بعد صابر ظفر والی نے اور غزلیں بھی بھیجیں جو "نیا دور" میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئیں لیکن میں نے ان کے نام میں ان کی اجازت کے بغیر اور اپنی پسند کے عین مطابق بہ ترمیم و تفسیح کر دی کہ ان کے نام سے والی کا لفظ نکال دیا اور صرت صابر ظفر شاعر کا نام رکھ دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام خود شاعر کو بھی پسند آیا اور اس نے اسے صرت قبول کر لیا بلکہ صابر مخلص کے بجائے ظفر مخلص اختیار کر لیا۔ اس طرح صابر ظفر والی صابر ظفر بن گئے اور "دحوال اور پھول" میں اب ہر قطع میں انھوں نے ظفر مخلص ہی استعمال کیا ہے۔

صابر کو میں اسی وقت سے جانتا ہوں۔ میں ان کی زندگی کے نشیب و فراز سے واقف ہوں جس کی انگ داستان ہے جو میں اس وقت لکھوں گا جب صابر ظفر اردو زبان کا ممتاز ترین شاعر بن چکے گا۔ اس نے اب تک جو سفر کیا ہے وہ صرت خدا داد شاعرانہ جوہر کی سواری پر کیا ہے۔ اس کے پاس مذہب و ملت ہے۔ نہ گھر در ہے کہ کسی کو بلے۔ نہ سماجی مرتبہ ہے۔ نہ تعلقات عامہ کی گاڑی ہے۔ میں نے دے کر شاعری ہی اس کی زندگی ہے۔ یہی اس کی پُرکھی ہے۔ لیکن اس دور میں جب پیسہ خدا بن گیا ہے، شاعر یا شاعری کو کون پوچھتا ہے؟ پھر صابر ظفر کلو کار شاعر بھی نہیں ہے کہ مشاعروں سے پیٹ کو روٹی فراہم کر سکے۔ اس صورت حال میں جب وہ ۳۶ سال کا ہو گیا ہے۔ دس بچوں کا باپ ہے۔ ۳ فوٹ ہو گئے ہیں اور ۶ ماہ دادا شد بقیہ حیات ہیں۔ اس پر کیا گندمی ہوگی اور وہ کس طرح اپنے شب و روز بسر کرتا ہوگا آج تک اس مسفاک معاشرے نے کبھی نہیں سوچا اور

اس سفاک معاشرے میں من اتفاق سے آپ بھی شامل ہیں اور میں بھی۔

برہنگی کا یہ درماں ہے حیرگی میں جنیں

چسوارغ ہو تو جدائیں ، لباس ہو تو نہیں

اپنے ہونہار سپوتوں کو یہ معاشرہ یہی دیتا ہے اور شاید یہی دے سکتا ہے۔ صابر ظفر کے یہ چار شعر صنیعے اور دیکھے کہ ان میں ذات اور زمانے کا کرب کتنی تازگی اور کتنی شدت کے ساتھ ہم سے کس منفرد لہجے میں مخاطب ہے۔

چاہیے اب تولے خدا، اور ہی مہرباں مجھے

غیر تو خیر غیر ہیں بھول گئی ہے ماں مجھے

بے خبری یہاں خبر ہے ہنری یہاں ہنر

تو نے بہ ابی شعور فن بھیج دیا کہاں مجھے

اس نے مرے نصیب میں لکھ دیا انگڑاں کا کرب

بخش کے شہر انگ میں قطعہ جاں مجھے

دھوپ میں اس کا روپ تریا د نہیں رہا نگر

اہ کی ٹکڑیاں ظفر گنتی تھیں چھتریاں مجھے

اس موقع پر میں جو صابر ظفر کی شاعری کو پسند کرتا ہوں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں

کہ آپ بھی اس شاعر کے کلام کو ذرا توجہ سے پڑھیے اور دیکھیے کہ وہ کس سلیقے سے شاعری کر رہا

ہے اور کس سادہ سی زبان میں کیسے منفرد لہجے کو تنم دے رہا ہے۔ میں کج کی محفل میں اس کی

شاعرانہ خصوصیات اور اس کی انفرادیت کو بیان کرنا نہیں چاہتا لیکن اس کی شاعری کی

طرف آپ سب کی توجہ خاص طور پر مبذول کرنا چاہتا ہوں۔

آتش کبر نکلتی ہی نہ تھی دل سے ظفر

جو بد منبر کو جھلایا تو یہ کافر نکلی

گزارتا ہوں جو شب عشق ہے معاش کے ساتھ

تو صبح اشک مرے ناشتے پہ گرتے ہیں

”بے جواز“ کے حوالے سے

ہر تقریب میں صدر جلسہ کے ساتھ شکل یہ اپڑتی ہے کہ کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں جو کچھ کہا جاسکتا تھا وہ کہا جا چکا ہوتا ہے اور صدر جلسہ کو رسم صدارت کی لاج رکھنے کے لیے اس بات سے بے نیاز ہو کر لوگ کتنی توجہ سے سن رہے ہیں یا نہیں سن رہے ہیں۔ کلمات صدر بہر طور ادا کرنے پڑتے ہیں۔ میں بھی فی الحال رسم ہو شرابا کی اسی منزل میں ہوں۔ اس لمحہ موجود میں آپ اور میں یعنی ہم دونوں مجبور ہیں۔ یہاں میں ”جبر“ کے ساتھ ”استغصال“ کا لفظ عذر اس لیے استعمال نہیں کر رہا ہوں کہ صدیوں سے ہم اس کے غلامی ہو چکے ہیں کہ اس کے بغیر عوام بے چارے پر سکون زندگی گزار سکتے ہیں اور نہ خواص چین کی نیند سو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظام حیات خوش اسلوبی سے چل رہا ہے۔ بارش ہو جاتی ہے تو فصلیں تیار ہو جاتی ہیں اور بارش نہیں ہوتی تو فصلیں سوکھ جاتی ہیں اور خدا بھلا کرے ترقی یافتہ ممالک کلاہم حسب ضرورت، المذہب درآمد کر لیتے ہیں اور زندگی اسی طرح کہ جیسی تھی، آرام سے گذر جاتی ہے۔ اس عمل سے شاعر اور اس کے معراج کی تردید بھی ہو جاتی ہے جس نے کہا تھا :

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں

آرام خواص کے حصے میں آتا ہے اور جہانِ خراب عوام کے حصے میں اور عوام میں ہمارے ملک کے دانشور ادیب، مفکر اور شاعر سب ہی شامل ہیں اور اسی مثال توازن کی وجہ سے ہمارا معاشرہ اور اس کے آسیب، شاید یعنی کے طہر پر گواہی دیں گے کہ کھرالوں سے پاک کتنے آرام کے سفر حیات طے کر رہا ہے۔ اس آرام میں دوسو چنے کی ضرورت پڑتی ہے

اور نہ مسئلے مسائل پر غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ زبردستی جیسا کہ ہمارے ہاں مل ہوئے ہیں سارے مسائل خود حل کر دیتی ہے۔ یہی منزل ہے اور یہی مقصد حیات ہے شعر و شاعری، ادب و فلسفہ، تفکر و تدبیر، علوم و فنون کا رہے کاراں ہیں جس کے معنی وہ اخراجا میں جن سے نہ کار خریدی جاسکتی ہے اور نہ پیٹ پالا جاسکتا ہے۔ ہمارے معاشرے نے یہ بات برسوں ہوئے طے کر دی تھی اور ایسے طے کر دی تھی گویا اب یہ ہمارا مقدر ہے۔ ایسے میں جب ادب و شعر کی یا فلسفہ و فکر کی کوئی کتاب چھپ کر منظر عام پر آتی ہے تو ہمیں اس ادیب یا شاعر، فلسفی یا مفکر کو صدقہ دل سے داد دینا اور دیتا ہوں جس نے اس دور پر ناپرساں میں یہ کار بے کاراں کیا ہے اور ادب و فن کو سرخرو کیا ہے۔ اسی وجہ سے آج میں اس بھری محفل میں حضرت حامد سروسش کو دلی مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے اس زبردست معاشرے میں زبردستی پر ٹٹ بج کر شاعری کی دیوی کو تازہ پھولوں کے گھر سے پہنائے ہیں اور دو دعائیں بھی کی ہیں۔ ایک یہ :

لڑے سکوت قصہ مہر و وفا چلے
دم گھٹ رہا ہے دوستوں ٹھنڈی ہوا چلے

اور دوسری یہ :

کب سے میں جاننا زب اس انتظار میں
مقبول ہوں و غائب تو مسجد سے ادا کر میں

۔ یہی وہ دعائیں اور آرزوئیں ہیں جن کے خواب شاعر دیکھتا ہے تاکہ دھوپ کی ٹھنڈ رہنے والی گرمی سے نجات ملے۔ اسی لیے دھوپ اور سایہ وہ دو بنیادی اشارے ہیں جن کے حوالے سے حامد سروسش نے اپنے کتبے کر ب۔ اپنے دکھوں اور نا انصافیوں کی داستان سنائی ہے۔ آگ اور پیڑ کی علامتیں بھی یہی تخلیقی عمل کرتی ہیں۔ آگ دھوپ ہے اور سایہ پیڑ ہے۔ سایہ اردو شاعری کی روایت کا حصہ ہے لیکن اس روایت میں حامد سروسش نے یہ تبدیلی کی کہ اسے دیوار کے سائے سے ہٹا کر پیڑ کے سائے میں لاکھڑا کیا۔ اب وہ میری طرح :

ظہر ہو گا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میر

یا شہرت بھاری کی طرح :

ظہر سورج کا اثر سایہ دلدار کرے ہے

نہیں کہتے بلکہ خواجہ حیدر علی آتش کے شجر سایہ دار کی روایت کو ملا کر ایک کر دیتے ہیں اور اسے یہ صورت عطا کرتے ہیں :

چھنی تھی دھوپ پتوں سے چھنی تھیں کے جسم میں

سایہ ملا تو وہ بھی سُکلتا ہوا ملا

دھوپ ہو تم کہی ، کبھی چھاؤں

کہنے بے گمانے ، کس قدر اپنے

جو دن کی تیز دھوپ سے نکال کر نکال گئے

جب خفیل شب کے سائے میں پہنچے تو راکھ تھے

دھوپ اور چھاؤں ، سایہ اور دھوپ ، ایڑا اور سورج کے گناہوں کو حامد سروس نے بار بار استعمال کیا ہے لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہر بار اس طور پر استعمال کیا ہے کہ ان اشاروں میں تنوع اور زندگی کے تجربات و مشاہدات کا پھیلاؤ ہوتا رہتا ہے اور ساتھ ساتھ چنبیلی اور چمپا کے پھولوں کی تازگی ، اپنی خوشبوؤں کے ساتھ ان کے کلام میں محسوس ہوتی ہے ۔ یہی تنوع اور تازگی ان کی شاعری کی جان ہے ۔ میں اس بات کا یہاں خاص طور پر اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ حامد سروس کے ہاٹن میں ایک سچا اور بڑا شاعر چھپا ہوا موجود ہے جس کا پہلا اظہار انھوں نے ”بے حجاز“ میں کیا ہے اور جس کا مزید بھرپور اظہار وہ یقیناً اپنے دوسرے مجموعے میں کریں گے ۔ گذشتہ پانچ سال میں متعدد مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں اور حامد سروس کا مجموعہ ”بے حجاز“ ان مجموعوں میں ایک قابل توجہ مجموعہ ہے اور یہی اس مجموعے کی اشاعت کا طوس جواز ہے جس نقاد نے یہ کہا تھا یقیناً صحیح نہیں کہا تھا کہ تیز

غالب اور فیض کے بعد کسی شاعر اور کسی شاعری کے مجھ سے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ معلوم نہیں وہ صاحب نقد کون تھے ورنہ بات صرف اتنی سی ہے کہ جب ہزاروں شاعر کسی دور میں شاعری کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا کر شعر کہتے ہیں تو پھر رنگس کے اس کھیت میں برسوں میں جا کر ایک شاعر پیدا ہوتا ہے جسے آپ دیدہ ور کہتے ہیں۔ وہ دیدہ ور کون ہو گا اس کا فیصلہ ذرا دیر سے ہوتا ہے۔ جب آپ سب نوجوان شعر کہیں گے اور کہتے رہیں گے اور اپنے معاشرے کی روح کو اپنے تجربات کی تحقیق میں پکا کر شعر کے روپ میں کندن بنائیں گے تو پھر ایک شاعر ان کے درمیان سے ایسا پیدا ہو گا جسے کبھی آپ حلقہ کہیں گے، کبھی سعدی کہیں گے اور کبھی خیر، غالب یا اقبال کہیں گے۔ ہمیں اس وقت شکایت اپنے اس سفاک معاشرے سے ہے جو کھنے والوں کا نہ احترام کرتا ہے نہ انھیں عزت دیتا ہے اور نہ ان کے تخلیقی کاموں کو اہمیت دیتا ہے۔ جب معاشرے تخلیقی عمل کو اہمیت دینے لگتے ہیں تو وہ نہ صرف خود زندہ ہو جاتے ہیں بلکہ اس کے شاعر، اس کے ادیب، اس کے مفکر اسے دنیا میں سرخرو اور قابل ذکر بنا دیتے ہیں!

وہ پیر کاٹکے، لکڑی کو بچ کر خوش تھا
پھر اس کے بعد کڑی دوپہر میں جلتا تھا

(۸ جنوری ۱۹۸۸ء)

بات سے بات : نصر اللہ خاں

جب مجھے یہ بتایا گیا کہ حضرت قبلہ محترم نصر اللہ خاں صاحب کی سالگرہ جلسہ عام میں منائی جا رہی ہے اور اس جلسہ سالگرہ کی صدارت اس حقیر فقیر نے تصدیق کو کرنی ہے تو مجھے خیال آیا کہ میں نصر اللہ خاں صاحب کی تسبیح عمر کا دانہ دانہ شمار کروں لیکن پھر خیال آیا کہ ماضی کو شمار کرنا تو اب لا حاصل ہے اس لیے گزشتہ انچ گزشتہ پر عمل کرنا چاہیے۔ ہاں اتفاقاً دہشتندی یہ ہے کہ مستقبل کا حساب رکھنا ضرور چاہیے کہ یہی حاصل کائنات ہے۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں ہے کہ آپ نصر اللہ خاں صاحب کی کون سی سالگرہ منانے میں ہیں لیکن میری اتنی خواہش ضرور ہے کہ آپ بغیر کسی حساب کتاب کے ہر سال اسی طرح ان کی سالگرہ مناتے رہیں۔ حساب دو دستانہ درود کے آپ بھی قائل ہیں اور میں تو سدا سے اسی پر عمل پیرا ہوں۔ اس میں خود غرضی کا پہلو یہ ہے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ نصر اللہ خاں اسی طرح برسوں ہاتوں کے پھول بکھیرتے رہیں اور ان کے پڑھنے والے اپنی زندگی کی آوازیں کوان کی تحریروں کو پڑھ کر ہمیشہ مسرتوں سے بدلتے رہیں۔

میں نصر اللہ خاں صاحب کو اُس وقت سے جانتا ہوں جب وہ واقعی بوڑھے تھے۔ پیٹ میں کنت، اہٹ منہ میں دانت۔ حسن اتفاق سے جو دو چار دانت رہ گئے تھے وہ بھی شغل افشانی گفتار کے جھکڑے جھکڑے برابر ہو گئے تھے لیکن ایک بات جو اس وقت تھی وہ آج بھی بھلا اللہ بخوں کی توں باقی ہے۔ اس وقت بھی وہ بہت دل چسپ باتیں کرتے تھے اور بہت کرتے تھے اور آج بھی ان کا صدقہ بہاریہ کا یہ دریا اسی طرح موجزن ہے۔ جب وہ بات چیت شروع کرتے تو بس اسٹاپ پر کھڑے کھڑے گھنٹوں گزر جاتے اور پھر جب شام کے

سائے طویل ہونے لگتے تو پتا چلتا کہ خدا کے فضل و کرم سے بڑا وقت گزر گیا ہے۔ ان ہی باتوں سے ان کی زندگی عبارت تھی اور سب باتیں ان کا مقصد حیات تھیں۔ تیز حرکت کا منزل، مادہ و نیست۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں دنیا میں اور کوئی کام ہی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ یہ محض باتیں کرنے کے لیے دنیا میں بھیجے گئے ہیں۔ بات سے بات پیدا کرتا اور قیامت کا ذکر چھپر کر میری اور آپ کی جواتی تک بات کو پہنچا دینا ان کے ہاتھیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار وہ تقریباً دو گھنٹے پر دفیسر حسن عسکری کو موضوع گفتگو بنا کر کل افشانیوں کرتے رہے تھے اور طرح طرح کے واقعات اور دلائل سے یہ جتا رہے تھے کہ اے ایم قریشی نے حسن عسکری کو پوشر لکھنے پر مقرر کر دیا ہے۔ یہ سب باتیں اپنے مخصوص انداز میں وہ کچھ اس طور پر میرے ذہن میں اُنڈیل رہے تھے کہ میں حالت نشہ میں اگر ان پر ایمان بھی لے آیا تھا، نصر اللہ خان صاحب ایسی خوب صورتی سے بھوٹ بولنے کے سچ معلوم ہوتا۔ ایسے واقعات تخلیق کرتے جن کا وجود فریض تا عرض کہیں نہ ہوتا اور ایسے لطیفے ٹھونکنے کہ سب وحی سے ایک ہی درجہ کم معلوم ہوتے۔ ایک دن شاہد احمد دہلوی مرحوم سے ان کا ذکر آیا تو مجھے سمجھانے بچانے کے سے انداز میں کہنے لگے: ”سایا ابھی نوجوان ہو۔ ان کے چکر میں نہ گئے تو کہیں کے نہ رہ گئے۔“ میں سوچ میں پڑ گیا، یا اللہ! نصر اللہ خان تو بہت اچھے آدمی ہیں۔ کیسی پُر از معلومات باتیں کرتے ہیں۔ کیسے کیسے واقعات بیان کرتے ہیں۔ ادب کی عظیم شخصیتوں کے بارے میں کیسے کیسے لطیفے سُنتے ہیں۔ کیا یہ سب باتیں ہی باتیں ہوتی ہیں؟ اس وقت میں طالب علم تھا اور ادیبوں سے ملنے اور ادب کی دنیا میں داخل ہونے کے جوش اور دلولے سے دل و دماغ متور تھا۔ ایک دن نصر اللہ خان صاحب پھر مل گئے اور ایک رسالے کے مدیر اعلیٰ کے بارے میں چند ایسے واقعات سُنائے کہ میں ششدر رہ گیا۔ ان مدیر اعلیٰ صاحب کی شخصیت کا یہ ایک ایسا رخ تھا جس سے میں اب تک بالکل ناواقف تھا۔ کچھ عرصہ بعد جب ان مدیر اعلیٰ سے میری ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے دریافت کیا تو ان کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور غصے سے کم و بیش لال پیلے ہو گئے۔ فوراً کہنے

لگے کہ نصر اللہ خان ہوں گے۔ یہ شرارت وہی کر سکتے ہیں۔ جب نصر اللہ خان صاحب سے ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے دریافت کیا تو کمال بے نیازی اور انتہائی معصومیت کے ساتھ فرماتے لگے: ”بھائی! یہ تو پر سوں کی باتیں تھیں۔ رات گئی۔ بات گئی۔ آج کی تازہ باتیں الگ ہیں۔“ میں کچھ دیر حیرت سے ان کا منہ نگھٹاتا اور اس عرصے میں یہ بسم اللہ کہے بغیر شروع ہو گئے اور ایسے شروع ہوئے کہ ہارٹ میں وہ بھی بیٹھتے رہے اور میں بھی لیکن باتوں کا سلسلہ اسی شد و مد کے ساتھ جاری رہا کہ باتیں یہاں نہ ہے اور اسی فن کی مناسبت سے انھوں نے اپنی دو شیئہ کتاب کا نام بھی ”بات سے بات“ رکھا ہے۔

روزنامہ ”حریت“ کی اشاعت کے وقت جب مجھے معلوم ہوا کہ نصر اللہ خان صاحب اب اس میں فکاہیہ کالم لکھا کریں گے تو مجھے اس لیے بھی زیادہ خوشی ہوئی کہ اب ان کی زبانی جمع خرقہ والی باتیں صرف ہوا میں تحلیل نہیں ہوں گی اور ان کی ذہانت کا دکھتا ہوا کوندہ باتوں کی تیز ہوا سے صوف راکھ نہیں ہے گا بلکہ اب ان کی گل افشانی گفتار محفوظ بھی ہو جائے گی۔ باتیں کرنا، باتیں لکھنا اور بات سے بات لکھنا یہی نصر اللہ خان صاحب کا فن ہے اور اس فن میں اردو صحافت میں ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔ ابن انشاء نے ایک راہ نکالی تھی اور گلابی اردو کو جدید اسلوب میں ڈھال کر اپنا ایک انداز تحریر بنایا تھا۔ ابن انشاء کی تحریروں کی خوبی یہ تھی کہ آپ اُسے شروع کریں گے تو ختم کیے بغیر نہیں گئے اور آخر میں جب ختم کریں گے تو صوف مزے کا احساس باقی رہ جائے گا۔ نصر اللہ خان کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ آپ اسے شروع کریں گے تو ختم کیے بغیر نہیں رہیں گے لیکن آخر میں مزے کا احساس کے علاوہ چند فقرے اور باتوں کے چند نئے پہلو بھی آپ کے ذہن میں محفوظ رہ جائیں گے۔ اس سطح پر نصر اللہ خان ابن انشاء سے آگے ہیں۔ ان کے انداز بیان میں اردو زبان کی روایت بولتی ہے، ان کے اظہار میں بات چیت کا عام لہجہ پورے زور کے ساتھ ہم کلاہی پڑتا ہے۔ وہ ہم بڑی سے بڑی بات کو ان کے مخصوص شگفتہ و مزاحیہ انداز میں سن کر ایسے سبب۔ ان کے ہاں زور زور سے جبکہ چہک کر باتیں کرنے کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی تحریر میں خاموشی نہیں بلکہ خود اور قہر لکھنے کا پتا چلتا ہے۔ وہ پڑھنے والے

کو سونے نہیں دیتے بلکہ اپنی ہنسی سے اپنی اونچی آواز سے اپنے برہستہ فقروں سے اسے جگائے رکھتے ہیں۔ پھر لطف بات یہ ہے کہ ان کے ہاں ذاتیات بالکل نہیں ہوتی بلکہ کسی کی ذات اگر ان کے قلم کی زد میں آتی ہے تو ذات کو بات میں پسٹ کر اس طور پر چھپا لیتے ہیں کہ بات بھی کہہ جاتے ہیں اور زیر قلم ذات بھی زخمی نہیں ہوتی۔ ان کے کالم خالص مزاح کی خوب صورت مثال ہیں۔

پھر ایک بات اور وہ روز کالم لکھتے ہیں لیکن کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ان کا قلم تھک گیا ہے یا وہ بالآخر کھڑے ہیں۔ پہلے دن سے لے کر آج تک ان کے قلم سے ویسے ہی پھول جھڑے جے جیا ان کے کالموں میں معیار کی ایسی یکسانیت ہے کہ بہت کم کالم نویسوں کے ہاں ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نصر اللہ خان صاحب اپنے مخصوص انداز کی کالم نویسی میں آج ملک کے سب سے بڑے کالم نویس ہیں۔ وہ جو میں نے شروع میں کہا تھا کہ نصر اللہ خان صاحب باتوں کے بادشاہ ہیں اور بات سے بات ایسے نکالتے ہیں جیسے ہم آپ مکھن سے بال نکالتے ہیں یا دودھ میں سے مکئی نکالتے ہیں تو اس کی مثال میں ان کے متعدد کالم پیش کیے جا سکتے ہیں۔ یہ نکل کر میں یو نہی کتاب کھوں ہوں اور میری نظر دیکھ کر اچھی اور موسم کے عنوان پر جاتی ہے۔ دیکھیے اب بات شروع ہوتی ہے۔

”موسمات کے ماہرین سے اب تک یہ نہ ہوا کہ جو موسم یہ چاہتے وہ ملک میں رائج کر دیتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو یو لیس کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ بڑا کہیں لاکھلی چلتی اور نہ کہیں آنسو گیس اور گولیوں کی ضرورت پڑتی۔ ایسے موقعوں پر مختلف موسمیات پس یہ اعلان کر دیتا کہ جیسے جلوسوں اور مظاہرین نہیں ہوں گی۔ اگر کوئی سیاسی پارٹی ایسا کرے گی تو ہم اولے برسا دیں گے، تو چلا دیں گے یا سٹر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آندھی چھوڑ دیں گے۔ ایسی صورت میں اخباروں میں کچھ اس طرح کی خبریں شائع ہوا کریں گی۔

آج حزب اختلاف اور سرکاری پارٹی میں نشر پارک میں بڑی زور کی جھڑپ ہوئی۔ سرکاری پارٹی کے کچھ عناصر نے حزب اختلاف کے اجلاس پر اگلے برسائے تو جماعت اسلامی نے سخت گرمی دکھائی۔ جمعیت علمائے پاکستان نے ٹو چیلر دی۔ پیپلز کارڈ سیلاب لے آئے۔ سردار شوکت حیات خان کی پارٹی نے جھکڑ چھوڑا۔ پولیس نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے بذریعہ آلاتِ تنبیہ غلام پر قابو پا لیا۔ حکومت نے اعلان کیا ہے کہ جو قحطاشائی سیلاب سے تباہ ہوئے ہیں یا جنہیں سیاسی ٹوٹگی ہے یا جو سردار شوکت حیات کے جھکڑ کی نذر ہو گئے ہیں ان سب کو حوصا۔ انسانی کے ضمن میں (رشاشی) انعامات یعنی کنسولیشن پرائز دیئے جائیں گے۔

یہ شونی، یہ پھل، یہ مزاج، یہ بے باکی، ان کے کالموں کا ایسا وصف ہے کہ پڑھنے والا ان کے ظلم میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ نصر اللہ خان صاحب کے قلم کی سیما ہی نے، فقرہ کی گرمی نے، زبان و بیان کے خُن نے مزاج کی شگفتگی نے طنز کی حدت نے یقیناً عام آدمی کے شعور میں اضافہ کیا ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے ہم نصر اللہ خان صاحب کو مبارک باد دیئے بغیر پوٹھی سرسری طور سے گذر جائیں۔ ان کی تحریر میں ایک ایسی ادبیت ہے جو ان کے کالموں کو زندہ رکھے گی۔ زبان و بیان پر جیسی قدرت نصر اللہ خان صاحب کو حاصل ہے وہ اس رنگ کے کسی صحافی کو حاصل نہیں ہے۔ وہ لفظوں سے نئی نئی وضع اور نئے نئے ڈالنے کی روٹیاں کالم کے تنور میں پکا کر اپنے پڑھنے والوں کی ضیافتِ طبع کے لیے ہر روز دسترخوان پر سجاتے ہیں۔

آخر میں میں نصر اللہ خان صاحب کو مسلسل اچھے کالم لکھنے پر دلی مبارکباد

پیش کرتا ہوں۔ اسی کے ساتھ ساتھ جلسہ سالگرہ کے منتظلیں سے میری یہ گذارش ہے کہ وہ سالگرہ تو اسی طرح ضرور مناتے رہیں لیکن یہ ہرگز نہ پوچھیں اور نہ بتائیں کہ ان کی کون سی سالگرہ ہے۔ جب آدمی بچپاس سے آگے بڑھتا ہے تو پھر عمر کا حساب بے حسی ہو جاتا ہے اور انسان پھر ساری عمر کے لیے ۲۴ سال کا ہو جاتا ہے اور خواتین و حضرات ہمارے نصیر اللہ خان صاحب بھی اب ماشاء اللہ مستقل طور پر چوبیس سال کے ہو گئے ہیں۔ معلوم نہیں اس عمر پر بیمار میں وہ اب کیا کیا محسوس کھلائیں گے۔ خدا ان کو وہ عمر دے اور اعطا فرمائے جس کے ہر برس میں بچپاس ہزار دن ہوتے ہیں۔

تاریخ ادب انگریزی: احسن فاروقی

پروفیسر ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نہ صرف اردو ادب کے بڑے نقاد، بڑے افسانہ نگار اور بڑے ناول نگار تھے بلکہ بزرگ عظیم پاک و ہند میں انگریزی ادب کے ایک ایسے استاد بھی تھے جو اپنے وسعت علم، کثرت مطالعہ اور دل نشیں انداز درس و تدریس کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔ اتنے بڑے نکلے لوگ ہمارے دور میں اتنے کم ہیں کہ انہیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی اردو، انگریزی، فارسی، عربی کے علاوہ فرانسیسی، جرمن، اطالینی و لبنانی زبانوں سے بھی واقف تھے۔ میں نے انہیں ہمیشہ پڑھتے لکھتے اور بحثوں میں الجھتے دیکھا۔ وہ پاکستان میں دانشوری کی روایت کے صحیح معنی میں منفرد نمائندہ تھے۔ انھوں نے ساری عمر درس و تدریس اور علم و ادب کی خدمت میں گزار دی اور کراچی کے کونٹر جاتے ہوئے فروری ۱۹۷۸ء میں دل کا دورہ پڑنے سے وفات پائی۔

ڈاکٹر احسن فاروقی کی بہت سی تحریروں، کتابوں، غیر مطبوعہ جہاں ان کے سینکڑوں مضامین، افسانے اور انشائیے مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔ "تاریخ ادب انگریزی" کا غیر مطبوعہ مسودہ بھی میرے پاس محفوظ تھا جسے شعبہ تصنیف و تالیف ترجمہ شدہ کہہ سکتے ہیں۔

گذشتہ دو سو سال سے انگریزی زبان را ادب بزرگ عظیم پاک و ہند کی دیں نگاہوں میں

پڑھائے جا رہے ہیں لیکن اب تک اردو زبان میں انگریزی ادب کی کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی جسے مستند کہا جاسکے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر احسن فاروقی کی زیر نظر کتاب 'تاریخ ادب انگریزی' پہلی تاریخ ہے جسے انگریزی ادب کے ایک رازدان نے اردو زبان میں لکھا ہے۔ اس کتاب میں جو مواد اور ذرائع نظر پیش کیا گیا ہے وہ فاروقی صاحب کے پچاس سال کے گہرے مطالعے اور درس و تدریس کے وسیع تجربے کا پتہ چلتا ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ انگریزی زبان 'ادب اور کچھ' نے ہمارے زبان و ادب اور تہذیبی سانچوں کو شدت سے متاثر کر کے انھیں تبدیل کیا ہے۔ اردو کا جدید سرمایہ ادب جس کی روایت سرسید و حلی سے شروع ہوتی ہے 'انگریزی ادب اور انگریزی زبان کے ذریعے مغربی ادبیات سے متاثر ہوا ہے۔ جدید اردو ادب نظم و نثر کی مختلف اصناف اور تخلیقی عوامل سے لے کر تنقید اور اصولی تنقید تک مغرب کے گہرے اثرات کا غماز ہے۔ نثر میں ناول، انشائیہ، ناولٹ، طویل مختصر کہانی، رپورٹاژ، سوانح نگاری، خاکہ نگاری، ادبی و فکری تنقید اور شاعری میں جدید موضوعات و اسالیب کی نظموں سے لے کر نظم آزاد، نظم معری، نثری نظم وغیرہ تک جس طور پر اردو میں برتنے گئے ہیں، اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ انگریزی و مغربی ادب کی مختلف تحریکوں نے جس طرح اردو ادب کو متاثر کیا ہے، وہ بھی سب ہمارے سامنے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو انھیں اثرات کے تحت سرسید سے پہلے اور بعد کا اردو ادب، طرز احساس اور اصناف ادب، دونوں کے اعتبار سے بالکل بدل چکا ہے۔ اس پہلو سے دیکھیں تو تعجب ہوتا ہے کہ اب تک انگریزی ادب کی تاریخ اردو زبان میں کیوں نہیں لکھی گئی؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انگریزی ادب کی تدریس چونکہ انگریزی زبان کے ذریعے ہوئی اور طلبہ و اساتذہ نے اسی زبان میں پڑھ کر اپنا مقصد پورا کر لیا اس لیے اہل علم کو اردو زبان میں انگریزی ادب کی تاریخ لکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ دنیا کے سب متمدن ممالک میں ان کی اپنی زبانیں درس و تدریس کا ذریعہ ہیں۔ انگریز اگر فرانسیسی، جرمن یا روسی زبان سیکھتا ہے تو اپنی زبان انگریزی ہی کے ذریعے سیکھتا ہے۔ اگر اردو زبان سیکھتا ہے تو وہ بھی انگریزی زبان ہی کے ذریعے سیکھتا ہے۔

ان کی اپنی زبان میں دجرو میں کتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں صورت حال یہ ہے کہ ہم ہر علم انگریزی زبان کے ذریعے سیکھتے ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ ہماری تخلیقی صلاحیتیں اور اخلاقی قوتیں کم زور ہو کر کم و بیش ہمارے ہوجاتی ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر احسن فاروقی مرحوم کے اس قومی احساس کی وجہ سے انگریزی ادب کی تاریخ اور زبان میں اٹھی جاسکی۔ یہ "تاریخ" یقیناً ایک ایسا کارنامہ ہے جس سے طلبہ و اساتذہ سے لے کر عام قاری تک سب مستفید ہوں گے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی کی یہ تصنیف اردو ادب کے طلبہ، اساتذہ اور قارئین کے لیے اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے مطالعے سے جدید اردو ادب کا پس منظر نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ وہ ادب جو مغرب سے استفادہ کر کے سرسبز سے لے کر اب تک لکھا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کا ارتقاء اور رفتار اور بنیادی پس منظر بھی مربوط انداز میں پڑھنے والے پر واضح ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کو لکھتے ہوئے ڈاکٹر فاروقی نے اختصار لیکن جامعیت سے کام لیا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو اپنی افادیت اور زاویہ نظر کے باعث مقبول ہوگی۔ -

(رہبرِ پریس + ۱۹۸۰ء)

عمر گزشتہ کی کتاب

میں آج اس بات کا انکشاف کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اگر وہ بہت پسند ہے اور اسی لیے مرزا ظفر الحسن صاحب بھی بہت پسند ہیں۔ لیکن ہے یہ بات سن کر آپ کے ذہن کے دریچے سے ”ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ“ کی کہادت جھانکنے لگی ہو لیکن میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ یہ بات اتنی اہل ہے جوڑ نہیں ہے جتنی بظاہر نظر آتی ہے۔ اس لیے آپ کی آنکھ میں مزید اضافہ کیے بغیر پہلے یہ بتا دوں کہ مجھے اگر وہ کیوں پسند ہے۔ اگر وہ کی پسندیدگی کی ایک وجہ تو وہی ہے جسے آپ بھی جانتے ہیں اور جس کا اظہار اگر نہ بھی کیا جائے تو بات آپ تک یقیناً پہنچ چکی ہوگی لیکن اگر وہ کی پسندیدگی کی اصل وجہ یہ ہے کہ مجھے اگر وہ والدیاں بہت پسند ہیں۔ اُن کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ جب بولتی ہیں تو پھول جڑتے ہیں۔ لمبے میں ایسی گھلاوٹ آواز میں ایسی میٹھی تیزی بیان میں ایسی رچاوت کہ آدمی دیکھتا رہے، سُنتا رہے۔ اگر وہ والدیوں کی یہی خصوصیت چونکہ مرزا ظفر الحسن صاحب میں بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اسی لیے میں انھیں بھی دل سے چاہتا ہوں۔ بات کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ تیز دھار کی قینچی کھواب کو کاٹتی چلی جا رہی ہے اور جب لکھتے ہیں تو یہی خصوصیت ان کی تحریر میں رنگ بھرتی ہے۔ ”ذکر بار چلے“ میں تو ان کے قلم کی تیزی ایسی چلی ہے کہ کپڑا پچھ رہا گیا اور قینچی آگے نکل گئی۔ مرزا ظفر الحسن صاحب سے مل کر وہ بھران کی تحریر میں پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کا ظاہر و باطن یکساں ہے۔ وہ

ویسے ہی ہیں جیسے وہ نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے اس بھری محفل میں ایک خاتون ایسی بھی ہوں جو مجھ سے اختلاف کریں لیکن خواتین و حضرات! ایک خاتون کی ذاتی رائے رائے عامہ کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ بہر حال مرزا صاحب کی زبان نے زبانی بھی اور قلم سے بھی سارے ملک کے طول و عرض میں ایک کہرام مچا دیا ہے اور پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں تو انھوں نے ایک ایسا ادارہ قائم کر دیا ہے جو اس شہر کے نام کے ساتھ ویسے ہی ذہن میں آتا ہے جیسے ہندو روڈ اور گیمارسی ذہن میں آتے ہیں۔ یہ مرزا صاحب کا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں کیا بلکہ بے لوثی کے ساتھ اولاد و انکار غالب کو جنم دے کر ایک ایسا لائق کام کیا ہے جو اس شہر کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گا اور اسی کے ساتھ مرزا ظفر الحسن کا نام نامی بھی۔ اس دور میں جب ساری قوم صرف پیسے کمانے کی مہلک بیماری میں مبتلا ہے، جب ساری قوم کا خدا اور اس کا رسول پیسہ علیہ السلام ہی کر رہ گیا ہے جس کے باعث قوم نوح اور قوم عاد و ثمود کی ساری برائیاں ہم میں سراپت کر گئی ہیں، ابھی قدریں ٹوٹ پھوٹ کر ڈھیر ہو گئی ہیں اور ہم اندھے بہرے ہو کر گھرے گڑھے کی طرف ٹھہر رہے ہیں، مرزا صاحب کی یہ بے لوث خدمت، یقیناً ایسی ہے جس کا ہمیں بار بار اعتراف کرنا چاہیے اور گرج سیم بھری محفل میں مرزا صاحب کو اس بے لوث خدمت پر سلام کرتا ہوں۔

میں یہاں تک پہنچا تو خیال آیا کہ مجھے تو ”مرگزشتہ“ کی کتاب کی تعارفی تقریب میں کتاب کے بارے میں کچھ کہنا تھا لیکن مرزا صاحب کا ذکر میں نے اس لیے پہلے کیا کہ کتاب تو خود مصنف کی ذات اور صفات کا مظہر ہوتی ہے۔ اس لیے اگر کتاب سے پہلے صاحب کتاب کا ذکر نہ جائے تو کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ لیکن مرزا صاحب سے معذرت کے ساتھ، میں کتاب کا ذکر اختلافات سے شروع کروں گا۔ اس کتاب میں مرزا صاحب نے فیض احمد فیض اور مخدوم محی الدین کو موضوع بنایا ہے اور ان کی زندگی و تخلیقات کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے جس کی وجہ سے دونوں کی تصویریں پورے طور پر چاگر نہیں ہو سکی ہیں۔ اگر اس کتاب کے دو حصے الگ الگ ہو جاتے۔ ایک فیض پر ایک مخدوم پر تو میرا

خیال ہے کہ مرزا صاحب زیادہ بہتر طریقے سے اپنے تعلقات اور اپنی محبتوں کا قرض ادا کر سکتے تھے۔ فیض اور مخدوم دونوں مختلف شخصیتیں ہیں اور دونوں الگ الگ مطالعہ کی متقاضی تھیں۔ خیر یہ تو میری ذاتی رائے تھی۔ ضروری نہیں ہے کہ مرزا صاحب اس وقت جب کتاب چھپ کر بازار میں آگئی ہے اس بات کو کوئی اہمیت دیں۔ لیکن ایک اختلاف اس سلسلے میں "بین الاقوامی" نوعیت کا ہے۔ مرزا صاحب نے صفحہ ۴۲-۴۵ پر لکھ لے کہ "اگر فیض کی شادی ایلس کے بھائے اس برصغیر کی کسی خاتون سے ہوئی تو میرا ایقان ہے کہ فیض بحیثیت شاعر اور انسان آج سے بالکل مختلف ہوتے۔" ایلس کی صلاحیت اور سمجھ داری کی داو برصغیر کی عورت کی تحقیر کیے بغیر بھی دی جاسکتی تھی لیکن کہتے بنا کہ برصغیر کی عورت کو جس کا ہتہ ورتا ہونا دنیا زمانے میں مشہور ہے، اس طرح رد کرنا مرزا صاحب جیسے انصاف پسند شریف انفس انسان کو یقیناً زیب نہیں دیتا۔ اسی صفحہ پر آگے چل کر مرزا صاحب خود مخدوم محی الدین کی بیوی کے بارے میں نصرت محی الدین کے حوالے سے یہ لکھتے ہیں کہ

"امی کے ایثار اور ان کی قربانیوں کا وہ (مخدوم) اکثر ذکر کرتے اور ہم سے کہتے اس خاتون کی جتنی عزت کر سکتے ہو کرو کیونکہ اس نے میرے اور تمہارے لیے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔"

(ص ۶۵)

واضح رہے کہ یہ خاتون برصغیر کی خاتون تھیں۔ اس کے برخلاف مرزا صاحب نے ایک واقعہ لکھا ہے جس میں بتایا ہے کہ فیض صاحب ایک بار بغیر اطلاع دئے مرزا صاحب کو لاہور سے اپنے گھر اسلام آباد لے گئے۔ مرزا صاحب کے الفاظ میں اس واقعہ کی تفصیل دیکھئے :

"ایلس نے مجھے دیکھ کر فیض سے شکایت کی کہ میرے لائے جانے کی اطلاع لاہور سے کیوں نہیں بھیجی۔ فیض نے پوچھا اگر تمہیں اطلاع کر دیتا تو تم کیا کرتیں؟ ایلس نے جواب دیا خوشی میں کہ اگر

ایک دُنبہ تو ذبح کرتی اور پہلے سے ان کا کمرہ ٹھیک کرتی اور شاید ان کے گھلے میں پھولوں کا بار ڈال کر استقبال کرتی :

(ص ۷۳)

پھر ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ
"فیض اپنے گھر میں مہمان کی طرح رہتے ہیں اور ہر مہمان ان کے گھر میں میزبان کی طرح نہ رہے تو اس کا بور ہو تا
یقینی ہے : (ص ۷۵)

بہر حال برصغیر کی عورت کے بارے میں مرزا صاحب نے جو حکایت بنایا ہے وہ چونکہ صحیح نہیں ہے اس لیے مجھے اختلاف ہے۔ لیکن مجھے ان سے ایک اور بات پر بھی اختلاف ہے۔ فیض صاحب کی محبت میں ایک آدمہ جگہ انھوں نے ایسی متضاد باتیں بیان کی ہیں جن کو ذہن قبول نہیں کرتا مثلاً ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ فیض کو :

"ہی بی سی لندن اور آل انڈیا ریڈیو سے ملازمت کی پیش کش ملی۔ انگریزوں کی نوکری ناپسند تھی۔ قبول نہیں کی۔"
(ص ۹۳)

لیکن صرف چار سطروں کے بعد یہ جملے ملتے ہیں :
"دلی میں فوجی ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے تو ٹریڈ یونین کا کوئی کام نہیں کیا۔ جنگ کے بے پناہ کام کے علاوہ دورے کرنے پڑتے تھے اور اس وقت وہ جنگی کام ٹریڈ یونین کی اعانت سے زیادہ اہم تھے : (ص ۹۳)

اگر ہی بی سی لندن اور آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت انگریز کی ملازمت تھی تو فوجی ملازمت بھی تو کسی قومی حکومت کی ملازمت نہیں تھی ؟
بہر حال اب اختلاف بہت ہو چکا رہا تو چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ قسبی چلتے ہوئے بعض

اوقات کپڑا غلط بھی کٹ جاتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی ”عمر گذشتہ کی کتاب“ ایک اچھی دلچسپ اور قابل ذکر کتاب ہے جس سے فیض اور محمد کے بارے میں ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو کہیں اور نہیں ملتیں مثلاً اس کتاب کو پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ فیض احمد فیض کا نام فیض احمد خان ہے۔ ان کے نانا کا نام عدالت خان اور دادا کا نام صاحبزادہ خان اور پردادا کا نام سر بلند خان تھا۔ والد کا نام میں نے اس لیے نہیں لیا کہ ان کے نام سے میں پہلے سے واقف تھا۔ پھر یہ بھی میرے لیے بالکل نئی بات تھی کہ ڈاکٹر تاثیر کا نکاح علامہ اقبال نے پڑھایا تھا اور ان کی شادی کے عہد نامہ کا مسودہ بھی علامہ ہی نے مرتب کیا تھا اور یہی عہد نامہ فیض اور ایلنس کے درمیان طے پایا تھا۔ یہ بات بھی میرے لیے نئی تھی کہ فیض کا نکاح شیخ عبد اللہ نے پڑھایا تھا۔ پانچ ہزار مہر تھا اور شادی کے اخراجات کے لیے میاں افتخار الدین نے تین سو روپے دیئے تھے اور براتیوں میں جو ش ملیح آبادی اور مجاز مرحوم شامل تھے۔ یہ باتیں پڑھ کر میں علامہ اقبال اور شیخ عبد اللہ کی صلاحیت نکاح خوانی کا بھی قائل ہو گیا اور میرے ذہن میں برجستہ یہ جملہ آیا کہ قاضی ہوں تو ایسے مولے در نہ ہوں۔ غالباً فیض اور ڈاکٹر تاثیر کی کامیاب ازدواجی زندگی میں علامہ کی روحانیت اور شیخ عبد اللہ کی بصیرت کو بڑا دخل ہے۔

پاکستان کی شخصیات

ایک زمانہ تھا جب ادب اور سیاست کا چمکی دامن کا ساتھ تھا۔ ادب سائنس کی ذہنی تربیت کا ایک حصہ تھا جس میں علوم مروجہ کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر قدرت شامل تھی۔ وہ کچھ بھی سیکھتا تھا اور تقریر بھی کر سکتا تھا۔ اُسے اپنے خیالات کے اظہار میں کسی قسم کی زحمت نہیں ہوتی تھی اسی لیے الفاظ غلط فہمی پیدا نہیں کرتے تھے اور سیاست دان کے منہ سے ایسے جملے نہیں نکلتے تھے جن سے سُنے والے منفذ ہوں اور موصوف اپنی صفائی پیش کرتے پھریں۔ جس نے سیاست میں قدم رکھا، علم و ادب کے راستے سے رکھا۔ دو رکیوں جائیے۔ سرسید کو لیجیے۔ مولانا محمد علی، شوکت علی، علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں، حسرت موہانی، بہادر یار جنگ کو لیجیے، یہ سب علم و ادب کے راستے سے میدان سیاست میں داخل ہوئے اور اپنی اسی صلاحیت و تربیت سے ایسے گہرے اثرات مرتب کیے کہ ان کے نام ہماری جدید تاریخ کا حصہ ہیں۔ نواز الصباح، یگیم جنوں نے پچاس ساٹھ سال پہلے کے رواجِ زمانہ کے مطابق کسی اسکول کا لیچ یا یونیورسٹی میں تعلیم نہیں پائی بلکہ گھر پر ہی اردو فارسی پڑھی اور مطالعے سے اپنی صلاحیتوں کے جوہر نکھارے،

اسی روایت سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ قلم اور زبان دونوں سے اپنے خیالات کا اظہار سیکھ رہے اور سلیقے سے کر سکتی ہیں اور ہماری نئی نسلوں کے لیے مشعل راہ بن سکتی ہیں۔ ان کی حتمی چیزیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں مشرقی عورت کی وہ ساری اخلاقی خصوصیات نمودار ہیں جن کی وجہ سے مشرقی عورت ایک بچی ماں، ایک اچھی بیوی، ایک اچھی انسان اور ایک اچھی راہبر بنتی تھی۔ وہ گھر میں رہی تو اس نے گھر کو جنت بنا دیا، بیٹوں کی ایسی تربیت کی کہ وہ زندگی میں ممتاز ہوئے۔ شوہر کے ساتھ ایسا اچھا سلوک کیا کہ اس کے چھپے ہوئے جو برظاہر ہو گئے۔ گھر میں رہتے ہوئے بھی مشرقی عورت کا ایک مقصد حیات ہوتا تھا۔ زندگی کا ایک مشن ہوتا تھا۔ اس کے لیے دولت، عیش و آرام، بلنگہ کو بھی کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اگر یہ چیزیں میسر ہوں تو ٹھیک ہے۔ نہیں ہیں تو ان کے حصول کے لیے شرافت و اخلاق کی دیواریں پھلانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نورا الصباح بیگم نے برقعہ پہن کر پردے میں رہتے ہوئے، ساری عمر تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کے لیے جس حوصلے، جس کردار اور جس جوش مقصد کی ضرورت تھی وہ ان میں موجود تھا۔ اس عمر میں وہ کم و بیش ان تمام راہنماؤں سے ملیں جن کا نام ہمارے لیے عزت و محبت کی علامت ہے۔ اس اعتبار سے بھی نورا الصباح بیگم اب ان چند خواتین میں سے ایک ہیں جنہیں قائد اعظم محمد علی جناح، شہید ملت، لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشترو، اب محمد یحیٰی خان وغیرہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔

”پاکستان کی مشہور شخصیتیں میری نظر میں“ جس کی تقریب رونمائی میں شرکت کے لیے آپ برسات کے موسم میں یہاں تشریف لائے ہیں، نورا الصباح بیگم نے ۶۵ مشہور اور معروف سیاسی اور ۲۶ ادبی شخصیتوں کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر جیسا کہ انھوں نے خود بتایا ہے، یہ ہے کہ ”مشہور مرد حضرات کے متعلق ایک خاتون کے خیالات کیا ہیں؟ اس اعتبار سے یہ کتاب ایک انفرادی نظر کی حامل ہے۔“ قائد اعظم کے بارے میں جو تاثرات نورا الصباح بیگم نے پیش کیے ہیں ان میں اتنا خلوص اور عقیدت ہے کہ اس خوب صورت مضمون کو اسکول کی نصابی کتابوں میں شامل کیا جانا

چاہیئے۔

نورالصبح بیگم ۱۹۵۸ء میں مسلم لیگ پر پابندی کے بعد سیاست سے کنارہ کش ہو گئی تھیں اور اب ۱۹۷۷ء میں جیسا کہ اخبارات سے پتا چلا کہ وہ بیس سال بعد پھر تحریک استقلال میں شامل ہو گئی ہیں۔ "پاکستان کی مشہور شخصیتیں" ان کی گیارہویں کتاب ہے اور یہ اس وقت تک گیارہویں کتاب ہے گی جب تک وہ میدان سیاست میں سپاہی بنی دشمنوں کو شکست فاش دینے میں لگی رہیں گی۔ ان کی اس کتاب کے بارے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ یہ انہی دلچسپ کتاب ہے کہ آپ اسے ایک نشست میں پڑھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کتاب میں نورالصبح بیگم نے، جیسا کہ میں نے عرض کیا، مختلف سیاسی وادبی شخصیتوں کے بارے میں سیدھے سادے رواں اسلوب میں اپنے تاثرات بے ہاکی و جزأت و خلوص کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ یہ تاثرات چونکہ دل سے نکلے ہیں اسی لیے پڑھنے والے کے دل پر اثر کرتے ہیں۔ یہاں آپ کو کسی قسم کی بناوٹ یا "بناوٹ" نہیں ملے گی۔ سیدھی بات، سیدھے سادے ہٹھائی انداز میں لکھ دی گئی ہے۔ ان تاثرات میں اکثر ایسے چہلے سامنے آتے ہیں جن سے اس شخصیت کا سارا مزاج اور اس کی روح کی تصویر اُٹھ اُگر ہو جاتی ہے۔ یہ وہ شخصیتیں ہیں جن کے آپ نے نام کئے ہیں جن کے بارے میں آپ پہلے سے کچھ نہ کچھ جانتے ہیں لیکن اس طور پر یقیناً نہیں جس طور پر نورالصبح بیگم نے دیکھا اور آپ کو دکھایا ہے۔ نورالصبح بیگم نے چودھری خلیق الزماں مرحوم سے پوچھا کہ آپ بھارت سے یہاں کیوں آ گئے۔ جواب دیا "ہم گاندھی جی سے بڑے وعدے کر کے آئے تھے کہ جنرل سے تمام باتیں منوالیں گے مگر یہاں انھوں نے ہماری ایک بات بھی نہ مانی تو ہم واپس جا کر ان کو کیا منہ دکھاتے؟" اس کے بعد مصنفہ نے لکھا ہے کہ "یہ نہیں معلوم کہ وہ کون سی باتیں تھیں؟"

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ "میں نے فوراً محمد علی بوگرہ کو فون کیا۔ وہ بولے وقت بہت کم ہے۔ فوراً میرے گھر آجائیے۔ میں ساتھ لے چلوں گا۔ وہاں چودھری خلیق الزماں صدارت کی کرسی پر بیٹھے نظر آئے۔ میں نے برابر بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے پوچھا کہ صدارت قریب امین خان کو کرنا تھی۔ انھوں نے بتایا کہ رات بھر میں یہ معاملہ طے ہو گیا کہ کنونشن مسلم لیگ کا

سارا کام یامین خان سے کر کر ایوب خان قول سے پھر گئے اور چھ دھری خلیق الزماں صاحب کو تیار کر لیا گیا یہاں پھر چھ دھری صاحب نے یامین خان کو شکست دی۔
 کیجئے اب آپ کو اس دل چسپ کتاب کی چند جھلکیاں دکھاؤں۔ علی محمد راشدی کے بارے میں لکھا ہے کہ ”دوست کے انتہائی دوست اور اگر ذرا بھی شہہ ہو جائے کہ اللہ کے کسی دوست نے ذرا بھی اُن کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہے تو وہ ایسی چال چلنا جانتے ہیں کہ وہ تحت الثریٰ پیدا ہونے والے ہیں۔“

میر رسول بخش تالپور کے بارے میں لکھا ہے کہ ”پھر کراچی میں اردو سندھی کا جھگڑا چل نکلا تو ہمیں اور بھی تکلیف ہوئی کیونکہ میر صاحب تو اردو والوں کے کئی لٹنے ہی دوست تھے جسٹن سندھی والوں کے۔ انھوں نے سلیپ پارٹی کا انتخاب ہی حیدر آباد سے مہاجرین کے ووٹوں سے جیتا تھا۔ آخر انھوں نے گورنری سے استعفا دے دیا۔ بیگم اختر سلیمان کی بیٹی کی شادی میں ملے تو ہم نے کہا۔ ”میر صاحب مجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ کو مبارک باد دیں یا اظہار افسوس کریں۔“ بیگم صاحب مبارک باد دیجیے کہ عزت و اکبر دے لکل آیا۔“

غلام محمد کے بارے میں لکھا ہے کہ ”جیسے ہی قلی نے میر ابتر کھولا وہ ہماری پوچی وضع کی ایک پاؤروٹی کی نازک سی ریشمی نرود (رضائی) کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور اپنے ہاتھ میں لے کر نرم ریشم کو بار بار اپنے گالوں سے لگا کر دیکھا اور بڑے کمال سے کتنی نرم رضائی ہے کتنی ہلکی اور کتنی حسین پھر میری طرف دیکھ کر بولے ”آپ کو تو بڑے مزے کی نیند آتی ہوگی ایسی رضائی اور کچھ کر۔“ ہمیں ہنسی آگئی۔

ایوب خان کے بارے میں یہ واقعہ سُنے۔ ”میں نے کہا آجین تو مل گیا مگر کیا آپ نے انتخابات کے لیے کوئی خاص قوانین بنائے ہیں جن کی وجہ سے ووٹ فروخت نہ ہوں۔ ایوب خان بولے۔ ”اس کی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے کہا ”اشد ضرورت ہے کیونکہ ان لوگوں نے جن کا دولت پر قبضہ ہے انتخاب کی تیاری میں ہزاروں روپے خرچ کرنے کا اعلان کر دیا ہے مگر وہ سب جاہل ہیں تعلیم یافتہ طبقے کے پاس

پیسے نہیں ہیں۔ اگر ووٹ بکے تو وہ ہی کامیاب ہوں گے اور پھر اس آئین کا خدا ہی حافظ ہے۔ ایوب خان نے کہا: ”بگیم صاحبہ ان بیچاروں کو اس بہانے پیسہ مل جائے تو کیا ہرجا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ پیسہ کسی سے لیں اور ووٹ کسی کو دیں۔“

بھٹو صاحب کے بارے میں بھی چند جملے سنئے چلتے: ”وہ صدر ایوب کے دست راست بنے ہوئے تھے اور اب وہ صدر ایوب کی مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل بھی تھے۔ جس قدر صدر ایوب نامقبول ہوتے جا رہے تھے اسی قدر بھٹو صاحب ان کے خاص آدمی بننے جا رہے تھے۔ صدر ایوب کے مقابلے پر محترم فاطمہ جنت کھڑی ہوئیں تو ذوالفقار علی بھٹو نے اب بھی صدر ایوب کا ساتھ دیا اور انتخابات میں کامیاب کر دیا۔ یہ باتیں مجھے ڈکھ دیشا کیونکہ اس انتخاب کی دھاندلیاں سب پر عیاں تھیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ بھارت سے چھڑ گئی۔ کئی لوگوں نے وزیر خارجہ کی حیثیت سے بھٹو پر الزام لگایا کہ وہ ہی اس جنگ کا باعث ہیں۔ جنگ بندی کے بعد معاہدہ تاشقند ہوا اور روس سے واپسی کے کچھ عرصے بعد بھٹو ایوب حکومت سے علیحدہ ہو گئے اور اپنی سیاسی پارٹی بنائی۔ عوامی لیگ کے لیڈر شیخ مجیب الرحمن اگر تلہ سازش کیس میں ملوث ہو کر جیل جا چکے تھے۔ اوہر ایوب خان کی حکومت نہ بان بندی کرتی رہی۔ اوہر یہ جماعتیں فروغ حاصل کرتی رہیں۔ جب ہنگامہ ہوا تو ایوب خان نے گھبرا کر کانفرنس بلوائی۔ سب لیڈروں کے مطالبے پر بھٹو اور مجیب کو جیل سے رہا کر کے کانفرنس میں آنے کی دعوت دی۔ اس دور میں اسرائیل اصغر خان کی تقاریر نے تہلکہ مچا دیا۔ مجیب و بھٹو، اصغر خان کی تقریر و تحریک سے رہا ہو کر کانفرنس میں مدعو کیے گئے تھے۔ اس کانفرنس میں مجیب شریک ہوئے مگر بھٹو نے شرکت سے انکار کر دیا۔ اسی مضمون میں آگے چل کر لکھا ہے کہ وہ اپنے مصاحبین کی رائے پر نہیں چلتے بلکہ ان کے ارد گرد کے لوگوں کو ان ہی کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ بعض اوقات میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ آخر کسی پر تو بھٹو صاحب کو اعتبار ہو گا مگر واقعات بتاتے ہیں کہ ان کو صرف خود پر اعتبار ہے۔ ایک اور جگہ لکھا ہے کہ بھٹو صاحب ممتاز علی بھٹو سے (میرے بچے) ثمنین خان کی قابلیت کی باتیں کرتے رہے کہ

وہ بہت ہی قابل قانون دان ہے۔ تعجب ہے تم اب تک اس سے نہیں ملے۔
چار ماہ بعد ممتاز علی بھٹو کی حکومت نے ثمنین خان کو ڈی پی آر کا الزام لگا کر گرفتار
کر لیا۔"

اب چند اہل قلم کا بھی حال سُنتے چلیے۔ "اس سال مشاعرے کی صدارت کی
درخواست میں نے مولانا قدوسی صاحب سے کی۔ کئی لوگوں کو محض اس وجہ سے
اختلاف تھا کہ وہ لا لوکھیت میں رہتے ہیں۔ میں نے کہا دراصل پڑھے لکھے لوگوں
کا مسکن ہی لا لوکھیت ہے کیونکہ ان کے پاس دولتِ علم ہے، در نہیں ہے۔"
بگیم جوش ملیح آبادی کے بارے میں لکھا "دو ایک بار پھر میں ان کے گھر بھی گئی
محض ان کی بگیم کو دیکھنے کے اتنے عظیم شاعر کی بگیم کیسی ہیں؟ بگیم بے چاری سیدی ملایا
اور بے حد صاف گو لکھنوی طرز کی نکلیں۔ کہنے لگیں میں تو ان کی شاعری سُنتے سُنتے
تنگ آگئی ہوں۔ میں نے کہا "کبھی آپ کو بھی اچھی لگی ان کی شاعری۔ بولیں" شروع
شروع اچھی لگتی تھی اب تو کان پک غلے سُنتے سُنتے اور یہ کہتے کہتے ہمیں ان کی رجوش
صاحب کی (دو نظمیں بتائیں کہ کسی دن آپ اُن سے یہ سُنا بہت ہی مزے کی ہیں۔
حقیقہ جانندھری کے بارے میں لکھا ہے کہ "دوسرے سال مشاعرے کا
دعوت نامہ گیا تو میں نے فون کیا۔ بولے میری توفیس مقرر ہے اور فیس بھی بتادی۔
میں نے کہا میری طاقت ہی کہاں ہے۔ میرے گھر تو شوقیہ مشاعرہ ہوتا ہے بلکٹ
تھوڑی لگتا ہے۔"

جمیل الدین عالی کے بارے میں لکھا کہ "بولے ہارہ آدمیوں کا وفد چن چلے گا۔
میں آپ کو بھیجوں گا مگر بعد کو وفد چلا گیا ہمارا نام ہی نہ آیا۔" دوسرے دن انتخاب
کے بعد غنتی ہوئی تو پتا چلا میرے ہیں دوٹ شوکت صدیقی کے پچیس دوٹ۔ تو یہ
ہوا کہ بعد کو ہیں سوچنا پڑا۔"

حی الہ سید صاحب کے سلسلے میں یہ چند ٹچلے سُنیے۔ "سید صاحب کے گھر
پہنچ کر میری ملاقات شیخ مجیب سے ہوئی جن کو ڈھاکہ سے بلا کر سید صاحب نے

بہت بڑا عرصہ نہ دیا تھا۔ غیر ہماری کوشش سے ون یونٹ ٹوٹ گیا۔ میں تو ابتداء ہی سے ون یونٹ کے خلاف تھی کیونکہ میں نے جب سے سندھ کی سیاست میں حصہ لیا خود کو سندھی سمجھنا شروع کر دیا اور ون یونٹ کو سندھ کے لیے مضر سمجھ کر سخت مخالفت بن گئی۔ اب مرحلہ یہ درپیش تھا کہ کراچی کو سندھ میں شامل کریں کہ الگ رکھیں۔ کراچی کے لیڈران سے گفت و شنید کرنے کے لیے "محاذ" نے ایک کمیٹی مرتب کی جس میں کھوڑو صاحب، آغا غلام نبی، جام صادق علی، قاضی اکبر، میں اور دو اور مہاجر لیڈر تھے۔ تین چار میٹنگز ہوئیں اور ہم لوگوں نے کراچی کے لیڈروں کو اس بات پر متفق کر لیا کہ کراچی کو سندھ میں شامل کیا جائے۔ میرا خیال تھا کہ کراچی کو سندھ سے ملانے سے مہاجر بھی ایک طاقت رہیں گے۔ میرے ساتھی سندھی لیڈر کھوڑو اور قاضی اکبر کے علاوہ باقی، کراچی کو سندھ میں ملانے کے حق میں خود بھی نہیں تھے۔ جب یہ تمام کام سید صاحب کی مرضی کے مطابق ہو گیا تو وہ متعصب سندھی بن گئے اور اب "محاذ" نے جسے سندھ کا نعرہ لگایا یہ دیکھ کر میں حیران رہ گئی اور خود ہی میں نے صحاف سے استعفاء سے دیا۔

ابن انشا کے بارے میں لکھا کہ "انشا صاحب عالی کا ذکر اپنے کالم میں کرتے ہیں اور عالی انشا کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں یقین ہوا کہ ہم یکساں نہیں سب ہی نے یہ بات محسوس کی ہے اور میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ ابن انشا اس بات کو چھوڑ دیں تو ان کا کالم خاص مزاحیہ ہو جائے۔"

نورالصباح بیگم صاحبہ نے ابن انشا کا جو چہرہ لکھا ہے اس میں ان کا رنگ گورا بتایا ہے۔ میں نے ابن انشا کو بہت قریب سے اور بہت غور سے دیکھا ہے۔ اگر ابن انشا کا رنگ گورا ہے تو پھر ظلمت و نور کے لیے نئے الفاظ تلاش کرنے پڑیں گے۔ ابن انشا چونکہ میرے کئی دوست ہیں اور اس وقت پریس میں ہیں اس لیے غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے کتابت کی اس فاحش غلطی کی تصحیح نہایت ضروری ہے۔

یہ میں نے اس کتاب کی چند جھلکیاں آپ کے سامنے پیش کی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے سب کو پڑھنا چاہیے۔ یہ ایک ایسی خاتون کے تاثرات ہیں جس نے غلوں کے ساتھ سیاست میں حصہ لے کر اپنی عمر عزیز کا بڑا حصہ اس میں لگایا ہے۔

(۱۹۷۷ء)

یادوں کا جشن

کچھ لوگ بڑے ہوتے ہیں لیکن شاعر بُرے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ شاعر بڑے ہوتے ہیں لیکن انسان بُرے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں اور جو شاعر ہوتے ہیں کہ شاعر بھی اچھے ہوتے ہیں اور انسان بھی اچھے ہوتے ہیں۔ ایسے شاعر انسان جنہیں دیکھ کر محبت کی دھبہ کٹنے لگتی ہے اور غلوں کی کٹی نسیم سحر سے کھل اٹھتی ہے اور ساری نفاذ تو با چنبیلی اور رات کی رانی کی خوشبو سے چمکنے لگتی ہے۔ برصغیر سے خالے سے اگر ایسے لوگوں کی فہرست بنانی جائے تو میرا خیال ہے کہ فہرست بنانے والے کو خاصی دشواری پیش آئے گی لیکن مجھے یقین ہے کہ اس فہرست میں بلکہ سر فہرست جناب کنور مہندر سنگھ بیدی تحریر کا نام ضرور شامل ہوگا اور نہ صرف شامل ہوگا بلکہ ہر کس و نا کس اس نام پر صدق دل سے اتفاق بھی کرے گا۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی شخصیت میں یقیناً ایک ایسا سحر ہے کہ جو ان سے ملتا ہے وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے اور ساری عمر کے لیے ان کو گلے لگا کر ان سے گلے لگ جاتا ہے۔ بیدی صاحب نے اُن کو بھی ساری عمر نبھایا ہے جو ایک بار گلے لگ کر ان سے گلے پڑ گئے اور ان کو بھی جو نہ کبھی گلے لگے اور نہ گلے پڑے بلکہ صرف انسانی محبت سے رشتے سے انہوں نے اُن کی دل سے مدد کی۔ بیدی صاحب کی شخصیت کا نمونہاں پہلو محبت ہے اور

یہی ان کا پیغام ہے۔ محنت اُن کی زندگی کی سب سے بڑی طاقت ہے اور اسی لیے خواجہ میر درد کی زبان میں محنت غمش دل را بہار است، ان کی زندگی کا راہنما اصول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیدی صاحب مجھے عزیز ہیں۔ ایسے عزیز کہ جن کی شخصیت کا حاد و پہلی ہی ملاقات میں دل کو موہ لیتا ہے۔ "یادوں کا جشن" پر فکھ کر اُن کی شخصیت کے وہ چھپے ہوئے گوشے بھی سامنے آ گئے جن سے میں اب تک ناواقف تھا اور میری محنت کے جذبے میں مزید گہرائی پیدا ہو گئی۔ خدا سحر صاحب کو خوش رکھے اور صحت کے ساتھ بہت لمبی عمر دے تاکہ یہ اپنے جدِ اعلیٰ بابا گرو نانک کے پیغام محبت کو برسوں اسی طرح پھیلانے اور آگے بڑھانے رہیں۔

"یادوں کا جشن" ایک اچھے ناول کی طرح ایک ایسی دلچسپ کتاب ہے کہ جسے آپ شروع کرتے ہیں تو ختم کیے بغیر چھوڑ نہیں سکتے۔ میں نے سفر لاہور کے دوران اس کا مطالعہ شروع کیا اور سفر واپسی تک ۵۴ صفحات کی یہ کتاب ختم ہو گئی۔ میں تیز غور پڑھتا ہوں لیکن اگر کتاب میں کچھ نہ ہو تو اسے پڑھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک سطر دوسری سطر سے مختلف ہے۔ اس میں اختصار بھی ہے اور بیان کی روانی بھی زندگی کی رنگارنگی کی طرح ایک ایسا تنوع ہے کہ اسے آپ ایک دلچسپ داستان کی طرح پڑھ سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کی داستان حیات ہے جس نے کھل کر سچ بولا ہے اور جس نے اپنے آپ کو فرشتہ بنانے کے بجائے پوری طرح انسان رہنے کی کوشش کی ہے۔ وہ شکاری بھی ہیں اور شاعر بھی۔ سرکاری افسر بھی اور بڑے زمیندار بھی۔ وہ گھوڑ سوار بھی ہیں اور بازار و شکاریوں کے رسیا بھی۔ بھرتیوں کے ہمدرد بھی ہیں اور امیروں کے دوست بھی۔ دوسروں کے دکھ درد میں شریک بھی ہوتے ہیں اور دوسروں کو اپنے دکھ درد میں شریک بھی کرتے ہیں۔ وضع داری اور شرافت ان کی زندگی ہے اور دلہا درد مند کی دھڑکن روح حیات ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندو مسلم فسادات نے سارے بڑے بڑے کو پاگل کر دیا تھا ان کا دل تعصب و نفرت کے جہنم سے پاک تھا۔ دہلی میں رہ کر بیدی صاحب نے جو اس شہر کی خدمت کی اور جس طرح مسلمانوں کو اس نفرت کی آگ سے نکالا وہ مجھ تک قصہ کہانی بن کر پہنچا ہے۔ شاہد احمد دہلوی بھی اس کے

گواہ تھے اور خواجہ حسن نظامی بھی۔ ملا واحدی بھی اور مولانا رازا خیر بھی۔ اب کوئی نہیں ہے لیکن بیدی صاحب کی انسان دوستی آج بھی چراغِ نور بنی ہوئی ہے۔ اس موضوع پر بھی انھوں نے ”بادوں کا جشن“ میں لکھا ہے جس سے اس دور کی بربریت کی ایک تصویرِ نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ میں یہاں ان سب واقعات کا اعادہ تو نہیں کر سکتا لیکن ایک آودہ واقعہ کی طرف آپ کی توجہ ضرور دلاؤں گا۔ بیدی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ”ہری پور گلیئر کا گزراہ ضلع میں ایک جاگیردار کا ٹھکانہ ہے۔ وہاں کے ہسپتال میں ایک مسلمان کمپنڈر تھا۔ جب فسادات شروع ہوئے تو اس کے سارے کنبے کو کچل دیا گیا۔ اس کی لڑکی بہت خوب صورت تھی، اس لڑکی پر ان لوگوں کے درمیان ٹکرا ہو گئی۔ لڑکی نے کہا کہ جس سے آپ کہیں میں شادی کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ آپ میرے والدین اور دوسرے کنبے کو حفاظت سے رہو گی۔ کمپ میں پہنچا دیں، یہ شرط منظور کر لی گئی اور اس کمپنڈ کو اس کے ہائی مانڈہ کنبے سمیت رنجوئی کمپ میں پہنچا دیا گیا۔ مگر لڑکی کے بارے میں یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ اس سے کون شادی کرے جب یہ ٹکرا ایک خطرناک جھگڑے کی صورت اختیار کر گئی تو ایک شخص اٹھا اور تلوار سے لڑکی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کہا کہ اب سب ایک ایک ٹکڑا ہانت لو۔“

کنور مہندر سنگھ بیدی سادی عمر ہی بربریت، حیوانیت اور ظلم کے خلاف صفا آواز ہے اور یہ کام دہی شخص کر سکتا ہے جو انسانیت پر یقین رکھتا ہو اور تعصب سے اس کا دل پاک ہو۔ اس کتاب میں بے شمار ایسے واقعات ہیں جن سے انسان اپنی زندگی پر نظر ثانی کر سکتا ہے اور بہتر زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھ سکتا ہے۔ ایک بات جس کا ذکر میں ضرور کرنا چاہوں گا وہ جویش ملیح آبادی مرحوم کے سلسلے میں ہے۔ جویش نہ صرف ایک عظیم شاعر تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ جویش کو یہاں جو کچھ بھی نقصان پہنچا وہ ان کے ان دوستوں سے پہنچا جن کے بارے میں غالب نے کہا تھا ”ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا سالہا کیوں ہو۔“ جویش جب آخری بار ہندوستان گئے تو ان کے خلاف یہاں طرح طرح کی خبریں اخباروں میں چھپیں۔ بیدی صاحب ان سب باتوں کے معنی شاہد ہیں۔ انھوں نے اس واقعہ پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ ”آخری بار جب جویش

ہندوستان آئے تو ان کے ایک شاعر دوست ایسی مہراہ تھے۔ وہ سائے کی طرح جوش صاحب کے ساتھ رہتے اور جہاں بھی مشاعروں میں جوش صاحب جلتے وہاں انھیں بھی مدعو کیا جاتا۔ دہلی میں بھی وہ اگر ہونٹل میں جوش صاحب کے ساتھ مقیم رہے۔ میری جانب سے ہر روز جوش صاحب کے لیے ایک بوتل شراب اور موتی محل سے کھانا پہنچ جاتا تھا۔ لیکن جب جوش صاحب صبح آباد وغیرہ اپنے احباب سے ملنے گئے تو ان کے شاعر دوست دہلی پر بند ہے اور ہر روز شراب کی دوکان سے جوش صاحب کے نام پر ایک بوتل شراب لاکر بازار میں فروخت کرتے رہے۔ جب دوکان دانستہ بل پیش کیا تو اس بات کا پتہ چلا مگر میں نے دیدہ و دانستہ جوش صاحب سے اس کا ذکر نہیں کیا تاکہ دوستوں میں کدورت نہ پیدا ہو جائے۔ اسی دوست نے موقع پا کر بمبئی میں جوش صاحب کی جیب سے چار ہزار روپے نکال لیے۔ اس پر جوش صاحب نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی لیکن جب دہلی واپس آئے تو بسمل سعیدی ٹوٹگی کی منت سماجت کرنے پر اسے معاف کر دیا۔ مگر ستم ظریفی دیکھیے کہ اس دوست نے جوش صاحب کے احسانات کا بدلہ دیا کہ ہارڈی محمود کرنے کے فوراً ہی بعد اسے الگ ہو گیا اور ان کے خلاف حکومت پاکستان سے بے بنیاد اور غلط شکایتیں کیں جن کی بنا پر جوش صاحب کو ملازمت سے الگ کر دیا گیا۔

”جہاں تک مجھے علم ہے جوش صاحب کے خلاف جوشکایہ سب کی گئی تھیں ان میں سے ایک تو یہ تھی کہ انھوں نے بمبئی میں ایک اخباری انٹرویو میں پاکستان کے خلاف زہر افگلا۔ اتفاق سے میں بھی اس وقت موجود تھا اور یہ انٹرویو ظہر انصاری نے سید و بھائی کے گھر پایا تھا۔ اس سارے انٹرویو کے دوران میں جوش صاحب نے ہندوستان سے محبت کا مزور اظہار کیا لیکن پاکستان اور پاکستان کی حکومت کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ (۳۳۶) اس سے ساری صورت حال عیاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

ایک اور واقعہ انھوں نے لکھا ہے کہ ”جب وہ سنگرور کے ٹیپ کسٹر تھے تو جنرل تھماپا کا نڈران چیف وہاں تشریف لائے۔ ضلع والوں نے ان کا شاباناہ استقبال کیا۔ رات کو میرے ہاں کھانا تھا جس میں شمالی ہندوستان کے تمام بڑے فوجی اور سول

افسوس موجود تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتے ہوئے سیاست پر تبصرہ شروع ہو گیا۔ جنرل
تھامیا موڈ میں تھے فرمانے لگے کہ ان سیاست دانوں نے اتنے عظیم ملک کا یہ بڑا غرق کر دیا
ہے۔ جی چاہتا کہ یہاں فوجی حکومت قائم کر کے مارشل لا لگا دیا جائے تاکہ ملک کو سیاستدانوں
کی پیدا کی ہوئی گندگی سے پاک کیا جاسکے اور اگر میں ایسا کرنا چاہوں تو دو گھنٹے میں
کر سکتا ہوں لیکن میں نے آئین کی وفاداری کا حلف لیا ہوا ہے۔ میں ایسا نہیں کرے گا۔
سب الٹکی اس صاف گوئی پر حیران ہوئے۔

اسی طرح بسمل شاہجہان پوری کے بارے میں بھی جنس دل چسپ واقعات
کہے ہیں جو آپ کے لیے دل چسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ بیدی صاحب نے لکھا ہے
کہ "ساحر پوشیار پوری مجھے اور بسمل صاحب کو علی گڑھ مشاعرہ میں شریک ہونا
تھا۔ میں ان دنوں سٹی مجسٹریٹ تھا اور بسمل میرے باڑی گارڈ بھی تھے لیکن گئے ہوئے
تھے لیکن اس مشاعرے میں وہ ایک شاعر کی حیثیت سے شریک ہونے جا رہے تھے۔ یہ
طے ہو کہ سب لوگ میری کوٹھی واقع تیس ہزار پر چار بجے شام پہنچ جائیں۔ وہاں سے
بھگوان سنگھ کیسی ڈراما ٹیور کی کشیش دیگن میں ہم سب علی گڑھ کے لیے روانہ ہوں گے۔
بسمل کے علاوہ سب وقت مقررہ پر میرے اہل پہنچ گئے۔ چونکہ ہم لیٹ ہوتے جا رہے
تھے اس لیے بسمل صاحب کے گھر پہنچے جو باڈ ہندو راؤ میں تھا۔ جب ہم ان کی گلی
کے سامنے پہنچے تو وہ اپنے مکان کے سامنے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ ہم نے فوراً آنے
کے لیے کہا تو راؤ سے اشارہ کر کے گھر میں داخل ہو گئے اور دس بارہ منٹ کے بعد برآمد
ہوئے۔ ہم سب نے لعن طعن کی اور کہا کہ ہم تو پہلے ہی لیٹ ہو چکے تھے آپ نے اور
لیٹ کر دیا تو نہایت سنجیدگی سے فرمانے لگے کہ دراصل معاملہ یہ تھا کہ ہر مسلمان شوہر کا فریضہ
ہے کہ اگر شہر سے کہیں باہر سفر پر جائے تو جانے سے پہلے اپنی بیوی کا "حق زوجیت"
ادا کر کے جائے۔ ہمیں ہنسی تو بہت آئی مگر ضبط کر کے کہا کہ اگر ایسا ہی تھا تو آپ
یہ حق زوجیت پہلے ہی ادا کر دیتے۔ خواہ مخواہ ہمیں لیٹ کر دیا۔ تو فرمانے لگے کہ
میری بیوی دوسرے محلے میں گئی ہوئی تھیں۔ میں نے انھیں وہاں سے خاص طور پر

اسی لیے بلوایا کہ وہ حق زوجیت وصول کر لیں لیکن انھوں نے آنے میں دیر کر دی۔ حق زوجیت ادا کرنے میں تو صرف آدھا منٹ لگا باقی وقت غسل کرنے میں لگ گیا۔ تمام راستہ بسمل صاحب سے حق زوجیت کے مسئلے پر مذاق ہوتا رہا۔ وہ مختلف دلائل سے اپنے اس عمل کو جائز بتاتے رہے۔ علی گڑھ تک کا سفر بڑی آسانی سے کٹ گیا۔

معرض کریہ ایک ایسی دلچسپ کتاب ہے جس سے نہ صرف ہمارے ماضی قریب کے حالات پر گہری روشنی پڑتی ہے بلکہ بعض اہم شخصیات سے لگی ہم اس طرح متعارف ہوتے ہیں جس طرح ہم اس سے پہلے نہیں کرتے۔

(۱۰ مئی ۱۹۸۵ء)

طنز و مزاح کی شاعری

آج ہم حضرت شہباز امر وہوی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ایک خراج عقیدت ہم نے ۱۵ مئی ۱۹۸۳ء کو اس وقت پیش کیا تھا جب ان کی کتاب ”طظ“ کی تقریب اجرا کراچی میں ہوئی تھی اور ایک خراج عقیدت ہم آج پیش کر رہے ہیں۔ جب حضرت شہباز اس دنیا سے لافانی دنیا کے طول طوبی سفر پر چلے گئے ہیں۔ اُس سفر پر جو بدھنگ جاری رہے گا۔ آدمی چلا جاگے لیکن اپنے پیچھے اپنے اخلاق، اپنی شرافت اور اپنی تخلیق قات کا وہ اعمال نامہ چھوڑ جائے جس سے ہم اسے تاحیات یاد کرتے رہتے ہیں۔ فروری ۱۹۸۳ء میں جب میرے بزرگ دوست حضرت افسر صدیقی امر وہوی اہلک وفات پا گئے تھے اور ان کی مہلت میرے گھر سے اٹھی تھی تو میں نے ان کی وفات کی جن لوگوں کو خط کے ذریعے اطلاع دی تھی ان میں شہباز امر وہوی مرحوم مغفور بھی شامل تھے۔ مجھے یاد ہے کہ قریباً امر وہی سے الفا کا خط آیا تھا اور خط میں نہ صرف تین قطععات تاریخ وفات درج تھے بلکہ افسر صاحب کی وفات پر انتہائی پُر اثر الفا میں اظہار غم بھی کیا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ کتاب کی تقریب اجرا کے بعد جب وہ کراچی سے چلے والے تھے تو امرار کو کے میرے گھر گئے تھے۔ محمدی شعیب احمد عباسی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ بہت دیر بیٹھے رہے اور دنیا بھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ چلے گئے اور امید مئی کے سال دو سال میں پھر آئیں گے مگر جون ۱۹۸۵ء میں اب ان کے سفر کا رخ دوسری

سمت مڑ گیا ہے۔ اب ہم منتظر ہی رہیں گے۔ میں بھی اور شعیب احمد عباسی بھی۔ ان کے احباب بھی اور سارے اعزہ بھی۔ خدان کی مغفرت فرمائے۔ بحیثیت انسان وہ شریف النفس، وضع دار اور خوش خلق تھے اور بحیثیت شاعر پر اثر اول چسپ اور منفرد تھے۔ حضرت شہباز کے ساتھ شاعری کا پورا ایک دہستان اٹھ گیا، جس کے وہ ہمارے دور میں ممتاز نمائندے تھے۔ مردم خیز امر وہ کا سہاگ ہیں ان کی وفات سے آج گویا بے اس وقت وہ ان لوگوں میں شامل تھے جو خود امر وہ کی پہچان بن گئے تھے۔ اس موقع پر مجھے ان کا قسط یاد آ رہا ہے :

بالیقین تاریخ دہراتی ہے خود کو بار بار

شک نہیں اس بات میں واقف ہیں اس سے خاص و عا

کل ال آباد میں امروہ و اکبر کا تھا شور

آج امروہا میں ہیں مشہور شہباز اور آرم

ذرا غور کیجئے کہنے لوگ ہیں جو حضرت شہباز امروہوی کی طرح اپنے وطن کی پہچان بنے ہیں۔

شہباز صاحب پیدائشی شاعر اور صاحب علم و فضل تھے۔ ساری عمر درس و تدریس

کے شاہی پیشے سے منسلک رہے۔ ۱۹۲۵ء میں بھارت سے محروم ہوئے تو اپنی شاعری کا

رنگ بدل کر مزاجید رنگ اختیار کر لیا۔ اس تبدیلی میں ایک جہان حنی پوشیدہ تھا۔ بننا نابینا

ہو جانے تو شدید احساس محرومی کا شکار ہو جاتا ہے کمزور اعصاب کا انسان ہوا تو معاشرے

سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ حاسد اور مروتیں ہزار ہو جاتے۔ باشعور ہوا تو زندہ رہنے کا

نیما سلیقہ پیدا کرتا ہے مگر بینائی کے بغیر بھی ہر دل عزیز بن کر سارے معاشرے کی آنکھ کا

تلاش بن جائے۔ اردو کے نامور شاعر شیخ قلندر بخش حیات جب تک سوانحکے غم میزور نہ

اور سودا کے رنگ سخن کے پیرو تھے۔ اندھے ہوئے تو معاملہ بندی کی شاعری کی طرف آگئے

اور اس میں اپنے دور کی کھنوی تہذیب کے مخصوص رنگ میں ایسی شوخی اور چہچہلاہی سمو یا کہ

سارے معاشرے نے انھیں سر پر اٹھالیا اور وہ سب کی آنکھ کا انداز بن گئے۔ شہباز صاحب نے

بھی یہی مثبت رویہ اختیار کیا اور اپنی غریبانہ شاعری سے نہ صرف اپنے شہر کے خاص و عام میں

مقبول ہو گئے بلکہ سادے پر صغیر پاک و ہند کے مشاعروں کی مولف بن گئے۔ ملنے والا ان سے مل کر خوش ہوتا تھا۔ شعر سننا تو دل کی کھل آٹھنی اور وہ محفوظ ہوتا۔

شہباز صاحب کی شاعری میں طنز بھی ہے اور مزاح بھی ہے لیکن بنیادی طور پر وہ مزاح نگار تھے۔ ان کے مزاح میں طنز اس طرح شامل ہے جیسے پھول میں خوشبو۔ طنز میں اگر شدت آجائے تو دل آزاری کا سبب بنتا ہے۔ مزاح میں اگر طنز شامل ہو تو وہ شہد بن جاتا ہے۔ ان کے کلام میں ایسی تازگی و شگفتگی ہے جیسے نور ظہور کے وقت کھلے ہوئے گلاب میں ہوتی ہے۔ ان کی شاعری کا دائرہ محدود نہیں ہے۔ انھوں نے کم و بیش ان تمام معاشرتی مسئلوں پر تبذیری و سماجی مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے جن سے عظیم کا معاشرہ دوچار ہے۔ حضرت شہباز نے زندگی کو ایک مخصوص زاویے سے دیکھا اور اپنی نظریات شاعری میں اسے شگفتگی و مہارت کے ساتھ پیش کر دیا۔ انھیں زبان و بیان پر استادانہ قدرت حاصل تھی۔ فن شاعری پر ان کی گہری نظر تھی۔ صنائع و بدائع کو ایسی خوب صورتی سے برتتے تھے کہ ان کی شاعری پر اثر ہو جاتی تھی۔

آج حضرت شہباز ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کا کلام ہمیں آج کی طرح کئے والے دور میں بھی محفوظ و مسرور کرتا رہے گا۔ یہی انسان کا وہ تخلیقی عمل ہے جو فانی کو لافانی بنا دیتا ہے اور میرا خیال ہے کہ حضرت شہباز آج بھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

ماحول اور شاعری: نظر حیدر آبادی

زندگی کے سفر میں جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو بے شمار مناظر اور بے حساب چہرے، کچھ صاف، کچھ دھندلے دھندلے سے نظر آتے ہیں۔ بہت سے چہرے تو اتنی دور ہیں کہ اب صاف نظر بھی نہیں آتے اور بہت سے مناظر ایسے ہیں جو یادوں کی گہرا لود فضا میں ایسے چھپ گئے ہیں جیسے بادلوں میں چاند چھپ جاتا ہے۔ بس دم دم سی روشنی چھن چھن کر چاند کے دھبہ کا احساس دلاتی ہے۔ زندگی تو مختصر ہے لیکن وقت کی رفتار اتنی تیز ہے کہ جب ذرا ہوش آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وقت گزر گیا اور دم بیکر آگے چلنے کا وقت کہہ بچا۔ اسی لیے کم لوگ ہیں جنہیں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مہلت سفر حیات میں میسر آتی ہے۔ یہ ۱۹۵۰ء ہے۔ کراچی جیل کے قریب جمشید روڈ کے آخری ٹکڑے پر حیدر آباد کالونی نئی نئی آباد ہوئی ہے۔ اونچے کالر کی شیعروائیاں پہنے ہوئے لوگ اس نئی بستی کی رونق بڑھا رہے ہیں۔ نظام دکن کی مملکت ابڑی تو بہ پہلی بستی تھی جو سرزمین پاکستان پر نمودار ہوئی۔ اسی بستی کی گلیوں میں دکن کی عظیم تہذیب کے سپوت اپنی ممتاز اقدار کو جیسے سے لٹکائے اپنے ماضی کی داستان دہرانے میں مصروف ہیں۔ یہ ہیں نوجوان خواجہ معین الدین نظر آرہے ہیں اور عین صمدانی نقوی، حسین احمد اشک، تحسین سرور سی اور نظر حیدر آباد کی نظر آرہے ہیں۔ گاہے گاہے میر لائق علی اور معین نواز جنگ، شاہد حسین رزاقی کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ دیکھیے یہ وحید الدین خان ہرنائی ہیں اور یہ جو قرا زیادہ موٹے تازے

اور سُرخ و سفید سے نوجوان نظر آ رہے ہیں اور زور دار قہقہہ لگا رہے ہیں ضیاء الدین خان بوزنی ہیں۔ یہ جو بید ہاتھ میں لیے آہستہ آہستہ سڑک کی طرف جا رہے ہیں احمد علی خان ہیں اور یہ جو چھڑکاؤ کر کے کرسی پر بیٹھے ہیں ڈاکٹر طہسین زبیری ہیں اور اس طرف جو وہ ہیں وہ پولیس والے فاروقی ہیں اور یہ صاحب جو کتے میں پان دو بائے شیر دانی پہنے بید لیے سیر کو جا رہے ہیں حیدر آباد دکن کے آئی جی قید خانہ جات ہیں اور یہ جو ایک صاحب پو لے پو لے قدموں سے، اونچی ٹرکی ٹوپی پہنے، ادا دھر آ رہے ہیں ریاضی کے استاد اللہ بخش کمالی ہیں۔ یہ کالا کوٹ پہنے جو صاحب جا رہے ہیں عبدالرؤف ایڈووکیٹ ہیں اور عبدالرشید ان کے بھائی ساتھ ہیں۔ یہ جو دائیں طرف کی پہلی گلی میں رہتے ہیں یحییٰ صدیقی ہیں اور یہ جوان کے پاس کھڑے ہیں مہدی علی صدیقی ہیں۔ اور یہ۔ یہ کون ہیں؟ مشکل تو حائی پہچانی ہے۔ کسی نے بتایا کہ جناب یامین زبیری ہو اور یہ جو سہارے سے چل کر گھر کی طرف لوٹ رہے ہیں ع چل خسرو گھر آئے ساتھ بھٹی چند سیس۔ ہر صفیر کے نامور شاعر حضرت اختر حیدر آبادی ہیں۔ کچے کچے مکانات، تین کی چادروں سے ڈھکے ہوئے مگر چیل پیل دربار یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ بستی یہاں برسوں سے موجود تھی۔ نئے نئے کھانے کراچی منہر کی زندگی میں داخل ہو کر مقبول ہو رہے ہیں۔ ناشتے میں تھی کھائی جا رہی ہے۔ بھگائے بیگن کی خوشبو سے گلی مہک رہی ہے۔ دھو توں میں ڈبل کامیٹھا اور خوبانی کامیٹھا بھی ہے اور کچی بریانی بھی۔ طرح طرح کے اچار اور چٹنیاں دسترخوان کی زینت ہیں۔ محلوں میں رہنے والے جب گھلیوں میں آباد ہوتے ہیں تو ان کے وجود سے گھلیاں بھی محل نظر آنے لگتی ہیں۔ مخصوص دکنی لہجے میں سب اُردو بول رہے ہیں۔ اُردو ان سب کا اور بھنا بھونا ہے۔ ان سب نے بھی اسلام اُردو اور پاکستان کی خاطر اپنا سب کچھ گنوا کر یا مقصد ہجرت کی ہے اور کٹھن یہ کہ اس زندگی سے بہت خوش ہیں۔ خوش اس لیے ہیں کہ اب وہ یہاں اپنے خوابوں کی تعبیر پائیں گے اور پاکستان کو جنتِ تعمیر بنائیں گے۔ یہی ان کا مقصد حیات ہے۔

معاف کیجیے میں بہت دُور نکل آیا۔ آج تو ہم سب نظر حیدر آبادی کے
مجموعہ کلام "صفتِ مڑکھان" کی تقریبِ اجراء میں جمع ہوئے ہیں۔ لیکن آج یہ پھول بھی
یادوں کی گلیاں ہی ہیں تو کھلے ہیں اور نظر حیدر آبادی اسی گلیاں کا ایک ایسا پھول ہے جس
کے کلام کی خوشبو سے آج کی محفل مہک رہی ہے۔ نظر حیدر آبادی کا انتقال ۱۹۶۳ء
میں ہوا۔ اس بات کو بھی اب ۲۴ سال ہو گئے ہیں۔ تقریباً ریحِ صدی۔ لیکن اب بھی ان
کا کلام تازگی سے جھک رہا ہے۔ جذبات و احساسات کی سچائی اشعار میں اثر و تاثر
کا رنگ بھر رہا ہے۔

نظر حیدر آبادی کے کلام میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ قطعات بھی ہیں
اور رباعیات بھی۔ وہ غزل بھی اچھی کہتے ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ نظم کے
شاعر ہیں۔ ایسی نظم جس میں وہ انسان کے مسائل اور عوام کے دکھوں کو بیان
کر کے انھیں بیدار کرتے ہیں۔ انھیں نیا شعور دیتے ہیں۔ وہ شعور جس سے سوتا ہوا
معاشرہ جاگ اٹھتا ہے اور نئی دنیا آباد ہونے لگتی ہے۔ اسی لیے میں نظر حیدر آبادی
کی شاعری کو مسائل و بیداری شعور کی شاعری کہتا ہوں۔ نظر حیدر آبادی کے
کلام کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ نظر کو اپنے خیالات، جذبات و احساسات کو
موزوں لفظوں میں بیان کرنے پر قدرت حاصل ہے۔ ان کے کلام میں پختگی ہے،
قدرتِ اظہار ہے، لفظوں کو ہر تے کا سلیقہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام آج
بھی تازہ ہے۔ ان کی شاعری پر اقبال، جوش اور اختر حیدر آبادی کا اثر اس لیے
واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس دور میں، جب نظریں شاعری کا آغاز کیا تھا،
برصغیر کی ساری ادبی فضا میں موجود تھا اور شاعری کو ذریعہ پیغام بنانا اس
زمانے کا مقبول ترین رجحان تھا۔ نظر کی شاعری بھی اسی رجحان کی حامل ہے۔ اپنی نظم
"نئے شاعر" میں بھی وہ یہی پیغام دیتے ہیں :

ساز سکوں کو نظمِ لطفِ خرام نے

خاوشیوں کو ہر آستِ ذوقِ کلام سے

اندھوں کو مل ہی جائے گی چشم بہر شناس
 دُنیا کو ہر مقام سے اپنا پیغام دے
 ایک اور نظم ”فنِ کار“ میں بھی نظر ہی کہتے ہیں:

یہاں کے دلوں میں شرارے نہیں ہیں
 یہاں کی نگاہوں میں پارے نہیں ہیں
 یہاں کی شبوں میں ستارے نہیں ہیں

چراغِ امید سحر کو جلانا

یہی میرا نغمہ یہی میرا گانا

جناب مہدی علی صدیقی نے اپنے ”پیش لفظ“ کے ساتھ نظر حیدر آبادی
 کے کلام کو ”صنفِ مشرکوں“ کے نام سے مرتب کیا ہے اور اسے آپ، آسانی سے
 کلیاتِ نظر حیدر آبادی بھی کہہ سکتے ہیں۔

(۳۲ دھاری ۶۱۹۸۷)

تذکرہ سخنورانِ کاکوری

جب کوئی نئی کتاب وجود میں آتی ہے تو اس سے نکلنے والی شاعروں سے کائنات کا رنگ بدل جاتا ہے جس معاشرے میں جتنی زیادہ کتابیں وجود میں آتی ہیں اسی لحاظ سے وہ معاشرہ کائنات کے رنگ کو تبدیل کرتا جاتا ہے۔ صرف اسی پیمانے سے آپ مختلف معاشروں پر نظر ڈالیے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ جن معاشروں میں کثرت سے کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ ان معاشروں کا رنگ ساری زمین پر غالب آ رہا ہے۔ اس کے تہذیب و تمدن سے دنیا منور ہو رہی ہے اور ساری دریافتوں، انگشتانات اور ایجادات کے مخارج بھی وہی معاشرے ہیں۔ مسلمانوں نے یادش بخیر جب تہذیب کے نقطہ شروع کو چھوا تو کتاب ہی اس کے عروج کا سبب بنی۔ آج مغرب کمال پر ہے تو اس کی بنیاد بھی کتاب پر قائم ہے۔ کسی معاشرے میں کتاب کا نہ لکھا جانا اس بات کی علامت ہے کہ اس معاشرے کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں اور اب یہ درخت ہوا کے تیز ہونکے سے زمین پر آ رہے گا۔ کتاب سے معاشرے کے ذہن و شعور کے دریچے کھلے رہتے ہیں اور فکر و خیال کی تازہ ہوا پہنچتی رہتی ہے۔ اندھے معاشرے کتاب کی اہمیت کو نہیں سمجھتے اسی لیے ایسے معاشرے پتہ نہ لگتے اور پھر بھرے ہو جاتے ہیں۔ جب معاشرہ اندھا، گونگا اور بہرا ہو جائے تو پھر اس کا مستقبل بھی باقی نہیں رہ جاتا ہے جب مجھے کسی کتاب کی اشاعت کی خبر ملتی ہے تو مجھ میں زندگی کا احساس گہرا ہو جاتا ہے۔ خردی نہیں ہے کہ لکھی جانے والی کتاب میری پسند کے مطابق ہو یا وہ ایسی کتاب ہو جس کے موضوع سے بھی مجھے کوئی دلچسپی ہو مقصد تو یہ ہے کہ کتاب کی اشاعت خود اس بات کی علامت ہے کہ وہ معاشرہ جس میں کتاب لکھی جا رہی ہے زندہ ہے۔

حکیم نثار احمد علوی نے جب ازراؤ کرم اپنی تصنیف مجھے دی تو اسے دیکھ کر مجھے دہشت
 مسرت ہوئی۔ ایک تو اس لیے کہ انھوں نے پچیس سال کی محنت شاقہ کے بعد ایک کتب تصنیف
 کی تھی جس میں ماضی، حال اور مستقبل کے سخت دران کا گوری کے حالات و کلام کو جمع کیا تھا۔
 دوسرے اس لیے کہ اس قسم کی کتابوں اور موضوعات سے مجھے بھی دل چسپی ہے۔ میں نے اس کتاب
 کو دل چسپی سے پڑھا اور میں جانتا ہوں کہ اس کے مطالعے سے میرے علم اور میری
 معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ حکیم نثار احمد علوی نے مواد کے بکھرے ہوئے موتیوں کو ایسے سلیقے
 اور خوب صورتی سے پر دیا ہے کہ ایک دیکھنے دکھانے کے قابل بن گیا ہے۔ یہ ایک ایسا مربوط
 تذکرہ ہے جس میں تنوع بھی ہے اور علم و بیان کی دل کشی بھی اس کتاب کو کہیں سے پڑھنے والے
 رابطہ، علم اور حسن بیان پر حصے پر یکساں طور پر نظر کرنے کا اور یہ کوئی ایسی معمولی بات نہیں ہے
 جس کی داد دینے بغیر ہم کو نبی سرسری گزرد جائیں۔ میں اس بھری محفل میں مختصران کا گوری جیسی
 اچھی تصنیف لکھنے پر حکیم نثار علوی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اس کتاب کا اثر ممکن ہے
 آپ اس وقت محسوس نہ کریں لیکن یہ وہ کتاب ہے جس سے اہل علم و ادب، مورخ، تہذیب و
 تمدن کے عالم بار بار استفادہ کریں گے۔

بات یہاں تک پہنچی تو ایک بات کا ذکر اور کرتا چلوں اکثر حضرات یہ کہتے نظر آتے ہیں
 کہ صاحب کلوا مانگ چور سنبھل، اور تنگ آباد کا گوری، امروہہ، جالندھر، بہار، راجستھان
 پٹالہ افغانستان وغیرہ تو سرحد کے اس پار ہیں آخر اب ان کا تذکرہ لکھنے کی کیا ضرورت اور ان کی
 تاریخ مرتب کرنے کا کیا محل ہے۔ یہ بات کہنے والے حضرات تاریخ کے دھارے اور اس کے
 شعور سے خاصی بے خبری کا ثبوت دیتے ہیں۔ ایک فرد یا پھر بہت سے افراد الگ الگ یا
 ایک ساتھ جب ہجرت کرتے ہیں تو وہ اپنا ماضی، اپنی روایات، اپنی ذاتی داستانیں اور اپنی
 علاقائی تاریخ بھی ساتھ لے کر ہجرت کرتے ہیں۔ کوئی فرد ہجرت کرتے وقت اپنے ماضی کو اپنے
 وجود ذہنی سے کاٹ کر نہیں پھینک سکتا۔ یہ ماضی اس کی زندگی کے تسلسل کا نام ہے۔ اس
 کے ذہنی و مادی وجود کی بنیاد ہے اس کے سفر حیات کے وہ اہم نقوش اور سنگ میل
 میل ہیں جس سے اس کے ذہن کی شکل بنی اور اس کا روپ بکھرا ہے۔ اسی لیے جب میں دیکھتا

ہوں کہ جوگ سرود مانگ پور سنجل، کاکوری، بنالہ وغیرہ کی تاریخ اور تذکرے مرتب کر رہے ہیں تو مجھے اس لیے اطمینان ہوتا ہے کہ میری نسل ابھی ذہنی طور پر زندہ ہے اور وہ اپنے ماضی کو سمجھنے، اس کا جائزہ لینے اور اپنے حال میں سمجھ کر آئندہ نسلوں تک اپنے ماضی و حال کے شعور کو پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے تاکہ نئے والی نسلیں ماضی کے بغیر اور حوری اکھو کھلی اور نیم جان نہ رہ جائیں۔ یہ ایک ایسا صحت مندرجہاں ہے جس سے ہمارے معاشرے کی نئی اجتماعی نفسیات جنم لے گی۔

سارا برصغیر امروڑا تو پاکستان آباد ہوا۔ کئی اس ملک میں سارے برصغیر کے مسلمان موجود ہیں جن کا اپنا ماضی اپنی تاریخ، اپنے کارنامے، اپنی کمزوریاں اور اپنی توانائیاں ہیں، اس ملک کی نئی تہذیبی اکائی یا وحدت ملی کو وجود میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ ماضی کی تاریخ کے سارے اوراق مربوط و مربوط ہو کر پاکستان کی کتاب وحدت میں لکھا ہو جائیں جس میں سب رنگ اس طور پر گھل مل کر ایک ہو جائیں کہ ان کے ملنے سے از خود ایک منفرد فطری چمک پیدا ہو جائے۔ یہ کام یقیناً ایک دن میں نہیں ہو سکتا لیکن یہ کام ماضی کو کھنگالنے سے جاری رہ سکتا ہے۔ میرے اور آپ سب کے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ کام بہر حال ہو رہا ہے۔ لیکن اس بات کا ایک پہلو اور ہے اور وہ یہ کہ جب کئے والے کہتے ہیں تو نئی سرزمین اور نئے وطن کو تجسس، حیرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کی تہذیب، تاریخ اور زبان و معاشرت کے بارے میں جلم و لگائی حاصل کرنا چاہتے ہیں یہاں کئے والے یہ کام بھی کر رہے ہیں اور ایسی متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور مسلسل لکھی جا رہی ہیں جن کا تعلق پاکستان کے مختلف علاقوں کی تہذیب و تاریخ سے ہے، یہ کتابیں نئے وطن کے ماضی کو سمجھنے کی جستجو کا نتیجہ ہیں۔ قائم رہنے والی تہذیبوں اور زندہ قوموں نے یہ کام ہمیشہ نہایت شوق اور تہذیب سے کیا ہے، سخنوران کاکوری بھی اسی تہذیبی عمل کی ایک کڑی ہے اور پاکستان میں اس کتاب کے لکھے جانے کی پہلی مناسبت ہے۔

کاکوری کے نام سے ہم سب واقف ہیں لیکن ہماری یہ واقفیت اس لیے ضعیف ہے

کہ اس میں باغات نہایت ہیں یا گندم کی کاشت اچھی ہوتی ہے یا یہاں تر و زہمت بڑے اور بہت سیٹھے ہوتے ہیں بلکہ اس لیے کہ اس سرزمین کے رہنے والوں نے اپنے قابل فخر کارناموں سے اس کے نام کو وہ شرف بخشا ہے کہ خود کا کوری جو مضامین لکھنو کا صرف ایک قصبہ ہے، آج ان کے نام کی وجہ سے دنیا زمelen میں پہچانا جاتا ہے۔ میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ شہر آدمیوں سے پہچانے جاتے ہیں اور آدمی شہر سے پہچانے جاتے ہیں۔ اصغر گروڈہ سے پہچانے جاتے ہیں اور گروڈہ اصغر سے پہچانا جاتا ہے۔ آدمی کا قد جتنا اونچا ہوتا ہے اس لحاظ سے بستی کا قد بھی اونچا ہو جاتا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی بھٹائی بھٹائی کی پہچان ہیں اور بھٹائی خود شاہ عبداللطیف بھٹائی کی پہچان ہے۔ جب شہر اور آدمی کی شخصیت ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہو جاتی ہے تو پھر آنے والے زمانوں میں انھیں الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اب تو خیر سے بین الاقوامیت کا زمانہ ہے اس لیے شہر بھی کھو گئے ہیں اور انسان بھی گم ہو گیا ہے۔ دونوں کے قد گھٹ گئے ہیں اور معاشرہ ایک بڑا سا جنگل بن گیا ہے جس میں کوئی ایک دوسرے کو نہیں پہچانتا اور کوئی ایک دوسرے سے محبت و وفا کے رشتے میں پیوست نہیں ہوتا۔ اس لیے اب شہر لوگوں کے ہموں سے گھٹ گئے ہیں۔ بستیاں کثرت آبادی کے باوجود آج بھڑک رہی ہیں اور بڑے بڑے شہر آبادی کے گھنے جنگل بن کر دریا بن گئے ہیں۔ دریاں اس لیے کہ اب یہاں تہذیب و تمدن، شرافت و شائستگی، علم و ہنر، فنون و ادب پر وان نہیں چڑھتے بلکہ خود غرضیاں، بے وفائیاں اور جنیتیں پھلتی پھولتی ہیں۔ اب جوش و حشمت کے علاج کے لیے جنگل بازار سے لائے جاتے ہیں۔ مومن خان مومن نے شاید اسی لیے کہا تھا:

کر علاج جوش و حشمت چارہ گر

لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

میں یہاں کا کوریوں کے کارناموں کی فہرست بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا ہیں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں کا کوری کو شاہ تراب علی کا کوری کے تعلق سے پہچانتا ہوں۔ میں کا کوری کو ایڈیٹر اور دہلی منشی سجاد حسین کی وجہ سے جانتا ہوں۔ میں کا کوری کو انورہ کورڈ

کے نام سے پہچانتا ہوں۔ میں کاکوری کو ایڈیٹر لانا نظر اور منشی امیر احمد علوی کی وجہ سے پہچانتا ہوں۔ یہ وہ نام ہیں جن سے اردو ادب کی تاریخ کبھی منٹھ نہیں ٹوڑ سکتی۔ یہ وہ نام ہیں جو پاکستان اور ہندوستان میں بھی یکساں طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ وہ نام ہیں جو پاکستان میں ہماری قومی تاریخ کا حصہ ہیں۔ حکیم نثار احمد علوی نے ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ لکھا ہے جنہوں نے اپنے اپنے طور پر اپنے اپنے دائرے میں شعر و ادب کی خدمات انجام دی ہیں۔ اس لیے میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے میری آنکھیں روشن ہو گئی ہیں۔

ان سب باتوں کے علاوہ مجھے کاکوری اس لیے بھی پسند ہے کہ وہاں کے باشندوں کو جن سے میری ملاقات کراچی میں ہوئی میں نے عام طور پر شریف النفس، خوش ذوق، علم پسند، مہذب، نرم خو، وضعدار اور مخلص پایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کا ہر شخص ایک ہی سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ یہی خوبیاں مجھے اپنے بزرگ دوست سراج احمد علوی اور نثار احمد علوی میں نظر آئیں۔ اور یہی خصوصیات پہلی ملاقات ہی میں میں نے حکیم نثار احمد علوی میں بھی محسوس کیں۔ دروغ بر گردن راوی۔ عام طور پر یہ بات اور نگ زیب عالم گیر سے منسوب کی جاتی ہے کہ انہوں نے مضامین لکھنے کے چند قصوں کے خصائص کا گہرا مطالعہ کر کے انہیں عالم گیر کی خطابات سے نوازا تھا اور چونکہ نقل کفر کفر نہ باشد کی بات شرعی اعتبار سے سولہ آنے پاؤ رتی اپنی جگہ درست ہے اس لیے بھی خطابات کو دہرائے میں مضائقہ نہیں سمجھتا۔ اور نگ زیب عالم گیر نے دیوانہ شریف کے باشندوں کو مفسدانہ دیوانے کے خطاب سے نوازا تھا۔ سندیلہ شریف کے لوگوں کو حاسدانہ سندیلہ کا خطاب دیا تھا۔ کرسی شریف کے لوگوں کو احمقانہ کرسی اور کاکوری شریف کے لوگوں کو مُدغیانہ کاکوری کے خطابات عالیہ سے نوازا کہ کرم و عنایات کی بارش کی تھی۔

خواجہ و حضرات اسب قصوں کے لیے شریف کا لفظ میں نے اس لیے عمداً استعمال کیا ہے کہ میرے لیے تو سب ہی شریف ہیں۔ جی تو یہ بھی چاہتا تھا کہ میں خود کو بھی لگے ہاتھ شریف کہوں، لیکن شامل اس لیے ہے کہ شرافت آڑے آتی ہے اور جیسا

کو آپ جانتے ہیں، اپنے منہ میاں مٹھو بیٹا شرافت سے بعید ہے لیکن حسن اتفاق سے چونکہ میں کسی مفسد، حاسد یا احمق کو ذاتی طور پر نہیں جانتا اور میرا واسطہ صرف ان لوگوں کے ہی پڑا ہے اور اس واسطے کہ بھی برسوں ہو گئے، اس لیے مجھے یہ کہنے میں کوئی ہلک نہیں ہے کہ اگر مدت ایسے ہوتے ہیں تو خدا سب کو مدمتغ کر دے۔ پاکستان کا مستقبل انشاء اللہ تعالیٰ محفوظ ہی محفوظ ہے۔ کاکوری کے لوگوں کی شرافت و بے نیازی اچھے دیشے رہنے کی صفت ان کی درویشی اور قلندریت، ان کا خلوص و شریف النفس وہ اعلیٰ و ارفع صفات ہیں جو مجھے انہیں چاہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ تیر نے غالباً یہ شعر مدمتغان کاکوری کے لیے ہی کہا تھا:

تری چال پیڑھی تری بات روکھی

تجھے تیر سمجھا ہے یاں کم کسوںے

آخر میں صرف ایک بات کی طرف حکیم نثار احمد علوی کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ انھوں نے اپنی کتاب سمنورانی کاکوری کی جو فہرست مندرجات بنائی ہے اس میں والد محترم کے رکھے ہوئے ناموں سے ناموں کو باعتبار حذف تہجی مرتب کیا ہے۔ حالانکہ سمنورانی اپنے اصلی نام سے زیادہ اپنے تخلص سے پہچانا جاتا ہے اس میں قباحیت یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ تخلص کے ساتھ اس شاعر کا اصلی نام بھی آپ کو یاد ہو اگر ایسا نہیں ہے تو پھر پوری فہرست کے ایک ایک اندراج کو ٹوٹا پڑے گا مثلاً اگر مجھے سمبھتی کے شاگرد ارشد مسرورہ کے حالات دیکھنے ہیں تو میں اس نام کو اس وقت تک فہرست میں تلاش نہیں کر سکتا، جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو کہ مسرورہ تخلص شاعر کا نام ہے یا پرخش تھا۔ شہرت کے ساتھ یہ پرخش پیچھے چلے گئے اور مسرورہ نے ان کی جگہ لے لی تا امید ہے آئندہ ایڈیشن میں موصوف اس ترتیب کو بدل دیں گے یا پھر آخر میں ایک اشاریہ شامل کر دیں گے جو ایسی کتابوں کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ دوسری گزارش یہ ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں کتابیات بھی شامل کر دیں گے جس کا ذکر خود انھوں نے آغاز میں کیا ہے۔

معاصر شعراء کا تذکرہ : سخن ور

سلطان مہر ہمارے ملک کی نامور صحافی، معروف افسانہ نگار، ناول نگار اور شاعر ہیں۔ ان کی ذات میں صحافت، افسانہ نگاری، ناول نویسی اور شاعری کے وہ اوصاف یکجا ہو گئے ہیں جو دوسروں میں الگ الگ پائے جاتے ہیں۔ وہ برسوں تک روزنامہ "جنگ" کا صفحہ خوانین مرتب کرتی رہی ہیں اب تک ان کے چار ناول — "داغ دل"، "تاجور اک کرن اُجلے کی"، "جب بہشت رُت آئی"، "مائل ہو چکے ہیں انسانوں کا ایک مجموعہ" "بند سپہاں" کے نام سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ "آج کی شاعرات" اور "اقبال دو برہمدیک آواز" ان کی دو مرتب کی ہوئی کتابیں ہیں۔ ان کی تازہ ترین تالیف "سخن ور" ہے جس میں سلطان مہر نے عہد حاضر کے شاعروں کے انٹرویو اس طور پر مرتب کیے ہیں کہ یہ کتاب جدید شاعروں کا ایک تذکرہ بن گئی ہے جس میں ہر شاعر کے بارے میں مفید معلومات بھی درج ہیں اور اس کا نقطہ نظر بھی اس اعتبار سے یہ ایک دلچسپ کتاب ہے۔ سلطان مہر ایک سلیقہ مند باہمت اور باہم عمل خاتون ہیں اور سلیقہ و عمل ان کی وہ خوبیاں ہیں جو ان کی ساری ذہنی و مادی سرگرمیوں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ یہی سلیقہ ان کی اس کتاب میں بھی موجود ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے بعض ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو ہمارے لیے نئی اور دل چسپ ہیں مثلاً جب سے میں نے شعور کی آنکھ کھولی ہے دیکھا کہ سید ذوالفقار علی بھٹاری کے سر کے بال چاندی کی طرح سفید ہیں ان کی عمر کو دیکھتے ہوئے ہم ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ یہ بال یا تو نزلے کی وجہ سے سفید ہو گئے ہیں یا کراچی کی آب و ہوا نے سفید کر دیے ہیں یا بھاری صاحب سفید خٹا۔

استعمال کرتے ہیں اور اگر یہ سب باتیں غلط ہیں تو پھر بخاری صاحب نے یہ بال یقیناً و حسب
میں سفید کیے ہیں لیکن سلطان مہر کی تالیف ”سختور“ پڑھ کر معلوم ہوا کہ ہماری یہ قیاس آرائیاں
غلط تھیں۔ اس کی اصل وجہ تو یہ تھی کہ ”۶۳۷ھ میں ہجرت کے دوران ان کا سامان تلف ہو گیا
اور ان کی کتابیں بھی۔ کتابوں کے تلف ہونے کا بخاری صاحب کو اتنا صدمہ ہوا کہ ان کے
بال سفید ہونا شروع ہو گئے (ص ۴۰) اسی طرح ہمارے مشہور شاعر جناب تائبش دہلوی بھی موجود
بیوی کے بارے میں یہ دل چسپ معلومات فراہم کی ہیں کہ وہ مرزا غالب کی بھانجی ہیں اور ان
کے ناناکے مکان ہی میں مرزا غالب رہا کرتے تھے۔ اتفاق سے وہ بھی غالب کے ہم نام تھے اور
مرزا نوشہ کہلاتے تھے (ص ۶۰) حضرت رئیس امر دہلوی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک بنگ
کئی لاکھ شعر کہہ چکے ہیں اور اپنے ہم عصروں میں کھڑی کہلاتے ہیں (ص ۶۰) اور یہ بھی بتایا
ہے کہ رئیس صاحب کو مونجہ کی رحلی وال جس میں پالک کا ساگ ڈالایا گیا ہوا اور قیہ پسند
ہیں۔ ویسے کوئی اصرار کرے تو کوٹھتے اور وہی کے رشتے کے ساتھ پلاؤ بھی کھاتے تھے۔
(ص ۱۶۱)۔

ایک اور شاعر کے بارے میں بتایا ہے کہ تسلیم یونی ودی علی شریح کے ایک طالب
علم نے اپنی فارسی نظم اس وقت کے وائس چانسلر مرزا سلیمان کو سنائی تو وہ بہت خوش
ہوئے اور کہا۔ ”کتنا شور ہے اس نظم میں!“ اس کے بعد سے منظور حسین نے اپنا مخلص شعر رکھ
لیا۔ (ص ۲۱۰) اور آج بھی پروفیسر منظور حسین شہزادہ کے نامور شاعر ہیں۔ عندیپ شادانی
کے بارے میں سلطان مہر نے بتایا ہے کہ ”نطف کی بات یہ ہے کہ خشک اور بے مزہ کتابیں بھی
وہ بڑے انہماک سے پڑھ لیتے ہیں۔“ (ص ۲۸۹) محترم احمد نعیم قاسمی صاحب کے بارے میں
لکھا ہے کہ ”بچپن سے ہی ان پر سنجیدگی طاری ہو گئی تھی اور مطالعے کے انتخاب میں بڑوں کی
پیروی کرتے تھے۔ یہ اسی سنجیدگی کا نتیجہ ہے کہ جب مولانا محمد علی کا انتقال ہوا تو انھوں نے اس
موقع پر ایک نظم کہی۔“ (ص ۲۹۵) قتیل شفائی صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ
”انھیں سُرغ کا قورمہ کھڑے سالے کا سالن، سرسوں کا ساگ، رنگونی ہریانی، بالائی کے
پانچے پسند ہیں“ (ص ۳۲۲) ان کھانوں کے نام سنی کر جہاں ہمارے منہ میں پانی بھر آیا

وہاں یہ عجیب و غریب بات بھی قاتل صاحب کے سننے میں آئی کہ ”ہندی محروں میں بہت تنوع ہے۔ ہندی شاعری میں اردو کے مقابلے میں کئی گنا ایسی بحر پر موجد و مبدع (ص ۳۲۳)۔

سلطان مہر صاحب نے ایک اور ایسی بات ہمیں بتائی ہے جس پر سارے اہل علم اور مورخین کو فوراً توجہ دینی چاہیے اور اس عظیم و خیرے کو محفوظ کر لینا چاہیے اور وہ بات یہ ہے کہ احسان دانش کے پاس خطوط کا ایک اچھا ذخیرہ ہے۔ اگر ان خطوط کو شائع کر دیا جائے تو برصغیر کی تاریخ کا از سر نو لکھنی پڑے گی۔ (ص ۲۰) حقیقت ہوشیار پوری کے بارے میں لکھ ہے کہ جب وہ انٹر کے طالب علم تھے تو ایک جلوس کی قیادت کی اور ایک جمہوریت نظم پڑھی جس پر ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو گیا لیکن بزرگوں کا اثر و رسوخ کام آگیا اور معاملہ دب گیا۔ اس طرح برصغیر ایک بڑے انقلابی سے محروم ہو گیا ہے۔ (ص ۱۹۱) حقیقت ہوشیار پوری ہمارے اہل درجے کے غزل گو تھے لیکن ان کے انقلابی ہونے کے امکانات پر ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔

بھروس کتاب کے مطالعے سے بعض اور بھی دل چسپ باتیں سامنے آتی ہیں مثلاً حسرت موہانی کے بارے میں سلطان مہر نے لکھا ہے کہ انھوں نے شاعرے میں اپنی غزل کا مطلع پڑھا تو سامنے بیٹھے ہوئے کسی صاحب نے زور سے کہا ”حضور پھر عنایت ہو۔“ مولانا رک گئے۔ دونوں ہاتھوں سے اپنی عینک سرکائی اور عینک کے اوپر سے گھونٹے ہوئے فرمایا۔ ”کوئی ضرورت نہیں۔“

جمیل الدین عالی کے بارے میں جہاں بہت سی سہولت فراہم کی ہیں وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ جمیل الدین عالی پہلے ایشیائی ادیب ہیں جنھیں نوبل فاؤنڈیشن نے انعام ملے بغیر تقسیم انعام میں جہان کے طور پر شریک کیا۔ لوگ کہتے ہیں اوب پر پوری توجہ دیں تو کیا پتا ایک دن نوبل انعام بھی لے کر دکھا دیں لیکن یہ نہ ادا ہو پوری توجہ دے دے رہے ہیں ذاب اس کا امکان باقی رہ گیا ہے۔ بہر حال ۱۹۶۰ء سے پیر میں ایک چکر ہے جو ختم ہونے میں نہیں آیا (ص ۲۶۸ ، ۲۶۹)

استاد قمر حلاوی مرحوم کے بارے میں بتایا ہے کہ انھوں نے سلطان مہر کو صحیح کہنا

سکھایا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں علم بدیع میں سجع اس عبارت کو کہتے ہیں جس کے فقروں کے آخری کلمات قافیہ رکھتے ہوں یا بصورت قافیہ واقع ہوں یا نظم یا نثر میں وہ فقر جس میں کسی الٹا کا نام اس طرح استعمال کیا جائے کہ اس سے کچھ اور معانی بھی ظاہر ہوں مثلاً ہمارے مشہور شاعر جعفر زٹلی نے محمد اشرف نامی کسی شخص کا بڑا خوب صورت سجع لکھا۔ محمد اشرف پیغمبران است۔ ایسے خوب صورت سجع کے باوجود جب محمد اشرف نے انتقادات نہ کیا تو جعفر زٹلی نے دوسرا مصرعہ یہ لگایا ہے۔ نہ ایں اشرف کہ مردود زمان است۔ سجع کا رواج اب تو نہیں رہا لیکن یہ شاعری کا ایک دل چسپ استعمال تھا۔ استاد قمر جلالوی نے سلطانہ مہر کو سجع کا فن سکھاتے ہوئے ان کے لیے یہ سجع کہا ہے۔

ترے رُخ کے نہ مقابل ہوا سلطانہ مہر

میں نے اس کتاب کو دل چسپی سے پڑھا اور مجھے امید ہے کہ آپ بھی اسے دل چسپی سے پڑھیں گے لیکن ایک بات کی طرف میں سلطانہ مہر صاحبہ کی توجہ ضرور مبذول کرواؤں جو کہ کتاب کی ستم ظریفی کی وجہ سے کتاب کو متاثر کر رہی ہے۔ مثلاً جہاں کاتب نے عبدالباری آسی کو عاصی لکھ دیا ہے، فقر نمونائی کو افسردہ دیا ہے (ص ۶۰) وہاں سنین کی کتابت میں بھی بعض غلطیاں کر دی ہیں مثلاً ص ۹۷ پر حشر کمال ولادت ۱۸۹۲ء درج ہے اور ص ۱۰۴ پر ۱۸۹۸ء درج ہے۔ ص ۱۱۴ پر لکھا ہے کہ حقیقہ جالندھری ۱۸۹۹ء میں ہندوستان گئے۔ ص ۲۸۵ پر عندلیب شادانی کا سال ولادت ۱۹۱۴ء درج ہے اور ص ۲۸۷ پر ۱۹۰۴ء درج ہے۔ منظر صدیقی کے بارے میں ص ۳۸۵ پر کاتب نے یہ ستم ڈھایا کہ لکھ دیا کہ منظر صدیقی کا انتقال ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو کراچی میں ہوا اسی طرح ناصر کاظمی کا سال پیدائش ۱۹۲۵ء ہے۔ کاتب نے لکھ دیا ہے کہ یہ ۱۹۲۴ء کی بات ہے لاہور کے اسلامیہ کالج میں مشاعرہ تھا (ص ۳۸۸) گویا ناصر کاظمی اپنی پیدائش سے ایک سال پہلے مشاعرہ میں شریک ہو گئے۔ یہ سنین اور املا سلطانہ مہر صاحبہ غلط درست کرا دیں۔

ایک بات میں اس سلسلے میں اور کہتا چلوں کہ استاد قمر جلالوی کی شاعری کے بارے میں سلطانہ مہر صاحبہ کی رائے نہ صرف مبالغہ آمیز ہے بلکہ اس لیے نادرست بھی ہے کہ میر تقی میر اور قمر جلالوی کا رنگ و سخن مزاجاً مختلف ہے۔ سلطانہ مہر صاحبہ نے جو یہ لکھا ہے کہ "یہ کہنا غلط ہو گا کہ استاد قمر جلالوی میر تقی میر کے دبستان کے آخری شاعر تھے۔ انھیں اپنی زندگی ہی میں میر ثانی کا لقب مل گیا تھا" (ص ۳۲) اسی لیے درست نہیں ہے۔

(۱۲ جولائی ۱۹۷۰ء)

تذکرہ ماثر الکرام

کتابوں کی تقریبِ روزنامی ایک عام سی بات ہو گئی ہے۔ لکھنے والے کتابیں لکھتے ہیں اور پڑھنے والے انہیں پڑھتے ہیں۔ یہ پہلے بھی ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے لیکن تیز رفتاری کے اس دور میں یہ بھی ضروری ہے کہ پڑھنے والوں تک اشاعتِ کتاب کی اطلاع جلد سے جلد پہنچ جائے۔ تقریبِ روزنامی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس عمل میں اس لیے بھی گھوٹی مضائقہ نہیں ہے کہ لکھنے والے کی اس موقع پر اتنی حوصلہ افزائی ضرور ہو جاتی ہے کہ اس میں مزید کام کرنے کا حوصلہ زندہ و باقی رہتا ہے۔ کتاب لکھنے کے لیے خصوصاً اور زندگی کے دوسرے اور کام کرنے کے لیے عموماً حوصلہ افزائی ضروری ہے۔ اتنی حوصلہ افزائی کہ کام کی معنویت کا احساس لکھنے والے میں باقی رہے۔ ورنہ یہ بھی ہوا ہے کہ کسی نئے لکھنے والے کی اتنی زیادہ حوصلہ افزائی ہو گئی کہ اس کے ذہن کا ارتقائی تخلیقی عمل رک گیا اور وہ یہ سمجھنے لگا کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے یا جو کچھ وہ لکھ چکا ہے وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ کسی نئے لکھنے والے کو اس کے ابتدائی زمانے ہی میں اتنی شہرت کا بندوبست کر دیکھیے کہ وہ غلط فہمی کا شکار ہو جائے تو اس ادیب کو زندہ دفن کرنے کا یہ آسان نسخہ ہے۔ بہر حال میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تقریبِ روزنامی کوئی ایسی ہی بات نہیں ہے کہ اس کی مخالفت کی جائے۔ مخالفت کی بات میں نے اس لیے کہی کہ اکثر اخباروں یا رسالوں میں بعض لکھنے والے اس عمل کو سرے سے برا سمجھتے ہیں۔

ماثر الکرام، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میر غلام علی آزاد بلگرامی کا وہ تذکرہ ہے

جو بنیادی مآخذ کا درجہ رکھتا ہے۔ آزاد بلگرامی جن کی وفات ۱۵ اکتوبر ۸۶۷ھ کو ہوئی، اور جسے اب دو سال کم دو سو سال ہو گئے ہیں، اپنے وقت کی ان عظیم ہستیوں میں سے ایک تھے جن کا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا ہے۔ انھوں نے کئی تذکرے لکھے جن میں روضۃ الاولیاء خلد آباد کے بزرگوں کے حالات پر مشتمل ہے اور مستند مآخذ کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ بیضا فاری گو شعراء کا تذکرہ ہے۔ مرو آزاد بھی شعراء کا تذکرہ ہے جس میں ۱۳۳ فارسی گو شعراء ہیں اور ۸ بجا کا کے شاعر ہیں۔ خزانۃ عامرہ ان شعراء کا تذکرہ ہے جو امر، نوابین اور بادشاہوں کے درباروں سے وابستہ رہے۔ اس میں ۳۵ شعراء کا تذکرہ ہے جو ایران اور بر عظیم کے مختلف درباروں سے وابستہ رہے۔ مآثر الکرام میں علامہ آزاد بلگرامی نے علماء و فضلاء، صوفیاء اور شاعروں کے حالات درج کیے ہیں۔ ان تذکروں کو مرتب کرنے کے سلسلے میں آزاد بلگرامی نے اس سارے مواد کو کھنگالنا جو مستند حالات کے لیے ضروری تھا۔ مآثر الکرام دو فصلوں پر مشتمل ہے پہلی فصل میں ۸۰ صوفیاء کا ذکر ہے۔ ان میں سے ۶۱ خطہ بلگرام سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک خاتون ہیں اور بقیہ ۱۹ دوسرے خطوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری فصل میں ۳۷ علماء کا تذکرہ ہے۔ تیس بلگرام سے تعلق رکھتے ہیں اور باقی دوسرے علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں لعل شیباز قلندر کا تذکرہ بھی درج ہے۔ یہ سب تذکرے جن میں مآثر الکرام بھی شامل ہے، فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔

اس دور میں محبوب فارسی کا رواج کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے فارسی کتابوں سے استفادہ بھی مشکل ہو جا رہا ہے اور اس طرح بنیادی مآخذ کے دروازے ہم پر بند ہوتے جا رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے اور خصوصاً اہل تحقیق و صاحبان علم کے لیے کہ وہ فارسی زبان کو سیکھیں تاکہ ہمارا ماضی اور اس کے بنیادی مآخذ ہمارے لیے زندہ رہیں۔ وہ قومیں جو اپنے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتی ہیں بے اصل اور بے بنیاد بن کر رہ جاتی ہیں۔ فارسی کے سلسلے میں آج یہ سوال ہمارے مستقبل کے دروازے پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔ اس صورت حال میں ایک حل تو یہ ہے کہ ہمارے لکھنے والے

فارسی زبان سیکھیں۔ دوسرا حل یہ ہے کہ اپنے بنیادی مآخذ کے مستند اردو تراجم کے جائیں
 لیکن یہ بہت دشوار کام ہے اور اس دشواری کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے کسی دوسری
 زبان سے اپنی زبان میں ترجمے کا کام کیا ہے۔ اسی لئے مستند علماء اپنی کتابوں میں ترجموں سے
 حوالے یا اقتباسات نہیں دیتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لیے
 ضروری ہے کہ محقق نے اصل کتاب کو اسی زبان میں پڑھا ہو جس میں وہ لکھی گئی ہے تاکہ
 تحقیق کے سلسلے میں کوئی غلطی پیدا نہ ہو سکے۔ لیکن آج کے دور میں یہی غنیمت ہے کہ
 فارسی کتب کے زیادہ سے زیادہ ترجمے کے جائیں اور یقیناً یہ خوشی کی بات ہے کہ مولانا شاہ
 محمد خالد میاں فاخری صاحب نے ماثر الکرام کا دسویں ترجمہ کیا بلکہ ایسا اچھا ترجمہ کیا جو پچیس
 رواں ہونے کے ساتھ ساتھ اصل فارسی متن سے نہایت قریب ہے۔ یہ بہت مشکل کام تھا
 جسے فاخری صاحب نے سلیقے کے ساتھ انجام دیا ہے۔ علامہ آزاد بلگرامی کے دوسرے
 تذکرے بھی ان کی توجہ کے محتاج ہیں۔ اسی طرح بہت سی تصوف کی کتابیں مخطوطات کی شکل
 میں کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ ان کے تراجم کی بھی ضرورت ہے۔ خواجہ میر درد کی
 عظیم، علم الکتاب بھی مستند اردو ترجمے کی منتظر ہے۔ ہم خواجہ میر درد کو صرف ایک شاعر
 کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن انہوں نے علم الکتاب میں فلسفۂ تصوف میں جو وحدت الوجود
 اور وحدت الشہود کا امتزاج کیا ہے، اس سے ناواقف ہیں۔ علم الکتاب تصوف کی عظیم
 کتاب ہے اور مولانا شاہ محمد خالد میاں فاخری سے کہہ رہی ہے خدا
 کون ہوتا ہے حریف سے مراد لگن عشق

دیوانِ غالب کا پنجابی ترجمہ

غالب اور دیوانِ غالب ہماری قومی میراث ہیں۔ ایسی گراں مایہ قومی میراث جس میں برصغیر کی مسلم تہذیب کی روح اپنے حسن و جمال کے ساتھ، تلخ محل کی طرح ہم سے کلام کرتی ہے اور روح کو تازہ دم کر دیتی ہے۔ امیر عابد صاحب نے اسی روح کو منظوم ترجمہ کے ذریعے اس طور پر پنجاب کے سلیچے میں ڈھالا ہے کہ ہماری قومی میراث اپنے حسن و جمال، لطافت و خیال اور وسعت بیان کے ساتھ آئینہ خاندانِ اظہار میں منعکس ہوئی ہے۔ یہاں میں ایک سوال اٹھانا چاہتا ہوں کہ آخر پنجابی زبان میں غالب جیسے مشکل گو عظیم شاعر کی روح شاعری کیوں اور کیسے حلو کر گئی۔ اس کا جواب چونکہ بہت آسان ہے اسی لیے شاید ہماری نعروں سے اونچل ہے۔ اردو زبان اور پنجابی زبان برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی ایک دوسرے سے قریب تر رہی ہیں۔ قدیم اردو کے ارباب کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اردو زبان کی تشکیل کے دور میں ہی پنجابی زبان اس کی تعمیر و تکمیل میں مسلسل شریک رہی ہے۔ دونوں زبانوں کے کنایات، اشارات، علامات، رمزیات، استعارات اور طبیعات کم و بیش ایک رہے ہیں۔ دونوں زبانوں کا ذخیرۃ الفاظ بڑی حد تک مشترک رہا ہے۔ دونوں زبانوں میں ہندو ترک کیب کا خزانہ بھی ایک اور یکساں رہا ہے۔ اردو زبان نے صدیوں کے سفر میں جس ترکیبِ نحوی کی پرورش کی ہے اس ترکیبِ نحوی کو پنجابی زبان نے ہمیشہ قبول کر کے اپنی ترکیبِ نحوی کو اسی سلیچے میں ڈھالا ہے تصوف کی روایت اور اس کے مابعد الطبیعیات، نکلت دونوں میں یکساں ہیں اسی لیے شاہ حسین، سلطان باجو اور

پہلے شاہ اردو اور پنجابی ہی کے نہیں بلکہ سارے پاکستان کا مشترک سرمایہ ہیں اور پہلے شاہ تو میرا وہ محبوب شاعر ہے کہ میں ان کے کلام کے مختلف نسخے اسی طرح جمع کرتا ہوں جس طرح دیوان غالب کے مختلف مطبوعہ قلمی نسخے جمع کرتا ہوں۔ پنجابی اور اردو دونوں کا رسم الخط ہی ایک ہے اور دونوں زبانوں پر فارسی و عربی الفاظ کے گہرے اثرات مُرسم ہوئے ہیں۔ پنجابی ہمیشہ سے فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی رہی ہے۔ خوشونت سنگھ نے اپنی کتاب ”دی ریٹس“ اور جان کلارک آچر نے اپنی کتاب ”دی ریٹس“ میں لکھا ہے سنگھوں کے دوسرے گروانگہ (۱۵۵۲-۱۵۵۳) نے جب سکھ مذہب کو اسلام سے دور ہٹانے کی کوششوں کا آغاز کیا تو گروانگہ نے فارسی عربی رسم الخط کو ترک کر دیا اور شمالی ہندوستان کے کئی رسم الخطوں کے عناصر کو ملا کر ایک نیا رسم الخط گورکھی کے نام سے ایجاد کیا، لیکن پنجاب کے مسلمان ہمیشہ کی طرح فارسی عربی رسم الخط ہی میں پنجابی لکھتے رہے۔ اسی رسم الخط اور مشترک تہذیبی روایت کی وجہ سے اردو و پنجابی اپنی ترکیبِ نحوی اور جملوں کی نحوی ساخت کے اعتبار سے قریب تر ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہیں۔ اہل پنجاب نے چونکہ اپنی تخلیقی قوتوں کا اظہار اردو زبان میں کیا بلکہ اردو بکھا جانے کے جیسے انیسویں صدی اردو کے تعلق سے دلی و کھنٹو کی صدی ہے اسی طرح بیسویں صدی امتیاز کے ساتھ پنجاب کی صدی ہے اور پنجاب کے محاورے کہاوتیں روزمرہ الفاظ، لہجے اور تہذیبی صورتیں اردو زبان کا حصہ بن کر قومی سطح پر عام و مروج ہو گئی ہیں اور یہی وہ تہذیبی پس منظر اور ترکیبِ نحوی کی یکسانیت ہے کہ جس کے باعث دیوان غالب کو اسیرِ عابد صاحب کامیابی و فنی اثر کے ساتھ پنجابی کا حامی پہنلانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ ترکیبِ نحوی اردو اور پاکستان کی دوسری زبانوں میں بھی مماثل اور قریب ہے۔ اسی ترکیبِ نحوی، رسم الخط، روایتِ تصوف و اسلام اور یکساں تہذیبی ارتقا کی وجہ ہی سے اردو زبان بھٹی بیان و اظہار کے سانچے وضع کر کے ترقی کرتی ہے اسی حساب سے پاکستان کی دوسری ساری زبانیں بھی ترقی کرتی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ خواہ پنجابی، ہندکو، مراٹھی، پشتو، بلوچ، سندھی، بلوچی، اردو، کشمیری، شنا و غیرہ زبانیں ہوں ان سب نے آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء سے جو ترقی کی ہے اس سے پہلے نہیں کی تھی۔

اردو کا پاکستان کی ساری زبانوں سے یہ اصل رشتہ ہے اور یہ رشتہ انگریزی زبان سے ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ زبان کے اس فطری انحراف کے باوجود انگریزی نے جس طرح ہمارے معاشرے پر قبضہ کر رکھا ہے اس سے تیجاً خواص و عوام الگ الگ ہو کر ہر روز طلوع آفتاب کے ساتھ ایک دوسرے سے دور سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور اس طرح انگریزی زبان کا با اختیار رواج، متجاس قوم بننے کے ہمارے فطری عمل کو روک کر انتشار و تعصب کے عمل کو تیز تر کر رہا ہے۔ انگریزی زبان سیکھنا، اس پر قدرت حاصل کرنا ایک بات ہے اور اسے بھوتا بنانا جیسا ہم نے بنا رکھا ہے ایک بالکل مختلف بات ہے۔ میں کہتا رہا ہوں کہ انگریزی سیکھیے اور خوب سیکھیے۔ اس پر پورا عبور حاصل کیجیے۔ اس کے ذریعے علوم حاصل کیجیے لیکن خدا را اسے اپنی تہذیب بنانے کی کوشش نہ کیجیے ورنہ ہم اسی طرح منتشر اور بکھرے بکھرے رہیں گے۔ انگریزی زبان اور تہذیب نے ہمیں اپنی تہذیبی روایت سے دور کر کے ہمیں ایک دوسرے کے لیے اجنبی بنایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ساری خدا داد صلاحیتوں کے باوجود ہم اپنی فطری تخلیقی صلاحیتوں کو اب تک بروئے کار نہیں لاسکے ہیں اور اس صورت حال میں جس سے ہم گزشتہ ۴۰ سال سے دوچار ہیں، ہم اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا نہیں سکتے۔ اسی لیے ہمارا معاشرہ اول درجہ کے موجد، سائنس دان، محقق و طیارہ پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ عوام کو جب تک ہم اپنے معاشرے کے بڑے دھارے میں شریک نہیں کریں گے اور خواص کا محدود طبقہ عوام کی غالب اکثریت کا تہذیبی و معاشی سطح پر استحصال کرتا رہے گا یہ صورت نہ صرف برقرار رہے گی بلکہ روز بروز پر اگندہ تر ہوتی چلے گی۔

نظیر خوانی

آپ نے اب تک قرآن خوانی، روضہ خوانی اور قصیدہ خوانی وغیرہ کی ترکیب تو سنی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان مجلسوں میں شرکت بھی کی ہے لیکن نظیر خوانی کی محفل پہلی بار سہانی ہوئی ہے اور اس کا سہرا "اہل سلسلہ" کے سر جاتا ہے۔ کئی سال پہلے کی بات ہے کہ محمد کرمین صاحب، بھابی سلمیٰ اور بڑے بھائی ابوالفضل صدیقی صاحب اور میں اکثر رات کو مل بیٹھتے اور کوئی زمانے کی باتیں کرتے، اچھی بھی بُری بھی۔ پاک بھی ناپاک بھی لیکن دل کی صفائی کا ہمیشہ خیال رکھتے، اور خنسیل کی مہک سے لبریز لب سوز چینی چائے پیتے جاتے۔ غالباً باتوں کا روحانی تعلق کسی نہ کسی قسم کے مشروب سے ہوتا ہے۔ یہ مشروب خواہ مشرقی کا ہو یا مغرب کا۔ محفل جب ہی جمتی ہے جب مشروب سامنے ہوا اور باتوں کی خوشبوئوں سے فضا مہک رہی ہو۔ ایک ایسی ہی رات تھی۔ کراچی کا موسم ضرورت سے زیادہ ٹھنڈا تھا اور مہادوٹوں نے سردی کو اچھی طرح بھرا دیا تھا کہ باتوں باتوں میں نظیر اکبر آبادی کا ذکر آگیا۔ میں نے زمین صاحب سے کہا کہ اگر کلیات نظیر ہو تو نظیر اکبر آبادی کی نظم "جاڑے کی بہاریں" پڑھی جائے۔ زمین صاحب جھٹ پٹ اندر گئے اور پلک جھپکتے میں کلیات کے ساتھ واپس آگئے۔ زمین صاحب، خدا انھیں عفو فرمائے، بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ محفلوں کی رونق۔ زندہ دلی کی تجسیم، یاروں کے یار، صاحب قلم لیکن بے سیف، جہاں جہانیں محفل کو معقران زار بنادیں۔ اس دور حشر زامین کو سارا معاشرہ نفسا نفسی کا شکار ہے، ایسا مقبول بندہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ سلسلے کی گرمی اور اہل سلسلہ کی جان۔ آتے ہی ورق گردانی شروع کر دی اور

نظیر کی نظم پڑھنے لگے۔

دل ٹھوکر مار پھینکا ہوا اور دل سے ہوتی ہو کشتی سی
 تھر تھر کا زور اکھاڑا ہو بجتی ہو سب کی بیسی
 ہو شور پھر پو پو ہو کا اور دھوم ہو سی سی سی کی
 کتے پر کتا لگ لگ کر چلتی ہو منہ میں چکی سی
 ہر دانت چنے سے دکتا ہو تب دیکھ بہا رہی جاٹے کی

جب ایسی سردی ہو اسے دل تب زور مزے کی گھنائیں ہوں
 کچھ نرم بچھونے محفل کے کچھ عیش کی مٹی راتیں ہوں
 محبوب محلے سے پٹا ہو اور کہنی چٹکی لاتیں ہوں
 کچھ بوسے ملتے جاتے ہوں کچھ میٹھی میٹھی باتیں ہوں
 دل عیش و طرب میں ہلتا ہو تب دیکھ بہا رہی جاٹے کی

جب نظم ختم ہوئی تو سب نے زور دار تہقہہ لگایا اور مسرتوں کی نسیم سحر سے دل کی بند
 کلی کھل اٹھی اور ساری فضا میں شامۃ العین کی گہری خوشبو پھیل گئی۔ بہت دیر نظیر کو آہٹ
 کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی اور باتوں باتوں میں یہ طے پایا کہ ایک ایسی محفل آراستہ
 کی جائے جس میں حرف کلام نظیر پڑھا جائے اور اسے نظیر خوانی کا نام دیا جائے۔ کوئے
 بچھے کی باتیں درمیان میں آئیں۔ ٹھنوں اور گانوں کی باتیں جوئیں۔ اُن نظیروں کی دُھنیں
 زبردست آئیں جو زور قہور کے ترانے مخصوص دُھنوں میں کلام نظیر گاتے ہوئے گزرتے تھے
 اور جن کی لے دلوں کے نہیں غانوں میں اتر کر روح میں پیوست ہو جاتی تھیں۔ پھر ان
 دُھنوں کے گانے والے تلاش کیے گئے مگر اسی تلاش بے معاش میں زمن صاحب
 اسلام آباد چلے گئے اور ان کے بغیر میں، بھائی سلٹی اور ابو الفضل صدیقی بے ہوا کا عیار
 بن کر رہ گئے۔ برسوں بعد جب زمن صاحب کراچی آئے تو نظیر خوانی کی بھوک ایک بار
 پھر اٹھی اور دُھنیں کے ساتھ اس کا انتظام کیا گیا۔

خواتین و حضرات! آج کی رات محفل نظیر خوانی کی رات ہے اور آج برسوں

کا وہ خواب شرمندہ تعبیر ہو رہا ہے جس کی آرزو ہم سب کی حسرت تھی۔ اسے اہل سلسلہ
 یہ محفلیں، جو گذشتہ ۳ سال سے کراچی میں ہم رہی ہیں، ہم سب کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔
 آنے والے زمانوں میں ان محفلیوں کی یادیں گرمی احساس بن کر ہمارے دلوں کو روشنی
 و نور سے بھر دیں گی اور ان یادوں کی برات کے درمیان تضاد کو توازن و اعتدال بخشنے
 والا ایک صحیح منور چہرہ اس ہستی کا ابھرے گا جس نے ایک تاروں بھری رات میں اس
 انجمن کی بنیادیں استوار کی تھیں اور جو آج بھی ہمیشہ کی طرح اس محفل کی روح رواں ہے۔
 انہی شاعروں بڑے دل والی، انہی انسان، محبتوں کا پیکر اور غفور و درگزر کی مثال اور
 اسے اہل سلسلہ آپ ہی سے اس محفل کی رونق ہے۔ آپ ہی سے گرمی گفتار بھی ہے
 اور گرمی ہازار بھی۔ آپ ہی کی محبتوں اور فراخ دلی نے سلسلے کو ایک ایسے خاندان،
 ایک ایسے گھنے کی صورت عطا کی ہے کہ اب ایک دوسرے کے بغیر روح میں موج
 اضطراب سی محسوس ہوتی ہے۔ آپ کی محبتیں اور آپ کا اخلاص اہل سلسلہ کی حیات نامزد ہے۔
 نظیر اکبر آبادی، جوارو و شاعری کی عظیم روایت کے ایک منفرد اور بے مثال
 شاعر تھے، ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے اور یکم اگست ۱۹۸۰ء کو انگریزوں میں اسودہ خاک ہو گئے۔
 فقیر منش، آزاد طبع اور قناعت پسند، ساری عمر مدرسہ اور شاعری میں گزار دی، ہند کی
 سے پیٹ پالا اور شاعری سے اس تہذیب کی روح کو پالا اور ساجو اپنی صورت گری کے لیے
 صدیوں سے بے قرار تھی۔ اسی لیے نظیر کی آواز اردو شاعری کی سب آوازوں سے مختلف
 ہے۔ ان کی آواز میں ہند مسلم تہذیب کی روح، صوت و آہنگ کا جاوہر جگمگا رہی ہے۔ اسی
 لیے نظیر کا ذخیرہ الفاظ بے حد بے حساب ہے اور اسی لیے ان کی شاعری سے کچھ بھی
 عوام و خواص سب کی روح نامزد ہو جاتی ہے اور سرتوں کی ٹچواری سے زندگی کی قیمتی ہوائی
 دھوپ میں جان سی پڑ جاتی ہے۔

نظیر عوام میں اتنے مقبول تھے کہ ہر سے گذرتے شعر و شاعری کی فرمائشیں ہونے
 لگتیں۔ ایک دن شاہ گنج سے کتے ہوتے چند نظیر نمونے نوک لیا اور کہا کہ میاں! کچھ کہہ دو
 میاں نے بہت ٹالا مگر وہ کہا ٹالنے والی تھیں۔ نظیر نے کہا اچھا اپنا اپنا نام بتاؤ۔ ایک نے

کہا جتنا۔ دوسری تے کہا گنگا۔ نظیر نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا اور رجستہ کہا:

یارب میری دعا کو جلدی قبول کیجیے

جتنا میں لگا تلی گنگا کے پار کر دے

جنھوں نے آگرو دیکھا ہے جانتے ہیں کہ مالی امتحان جاتے ہوئے کناری بازار پر

ہے۔ کوٹھے پر سے کسی نے مسکرا کر کہا ”مہیاں! ہمیں بھی اپنا کلام سنا دیجیے۔ یاد کر لیں گے“

گائیں گے اکیس گے۔ نظیر فراموش ہو گئے۔ اس نے پھر اصرار کیا اور فقرہ بھی چُست کیا۔

نظیر نے رجستہ پر شعر پڑھا:

لکھیں ہم عیش کی تفتی پہ کس طرح لے جان

قلم زمین کے اوپر، دوات کوٹھے پر

نظیر بڑے شاعر اور زندہ دل انسان تھے۔ عوام کی جان تھے۔ اسی لیے اپنے دور میں

بے حد مشہور اور بے حد ہر دلعزیز تھے۔ ان کی یہی شہرت اور یہی ہر دلعزیزی آج تک

باقی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے۔

آج کی محفل میں نظیر اکبر آبادی کو یاد کرنے اور ان کے کلام سے اپنی روح کو تازہ

کرنے کا یہ وہ سلسلہ ہے جسے اہل سلسلہ نے تلاش کیا ہے۔

غیر منقوطہ شاعری: مصدر الہام

جناب صاحبِ سحر اوی مجھے اس لیے بھی عزیز نہیں کہ وہ میرے تین چھوٹے بھائیوں اور ایک بیٹے کے استاد ہیں۔ میں انہیں گزشتہ بیس بائیس سال سے جانتا ہوں۔ اور ان کا نام میرے گھر میں ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ ایک شریف النفس کم گو اور کم آئیز انسان ہیں، اسلام کے نور سے ان کے دل و دماغ روشن ہیں، اور خالقِ رسولؐ سے ان کا وجود سرشار ہے۔ اسلام اور خالقِ رسولؐ ان کی شاعری کے بنیادی موضوعات ہیں وہ ایک سچے فرض شناس اور انمولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے والے آدمی ہیں۔ ایک اچھے انسان۔ ایک اچھے استاد ایک اچھے شاعر۔

اب تک ان کی کئی کتابیں شائع ہو کر اہلِ نظر سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ موادِ نظم۔ کتب، خطبات، غوثِ اعظمؒ، دربارِ رسالت میں اور ترویجِ فنیہ تاریخ میری نظر سے گزری ہیں۔ وہ گزشتہ پچاس سال سے شاعری کر رہے ہیں اور اس فنِ لطیف پر انہیں پوری قدرت حاصل ہے۔ زیرِ نظر مجموعہٴ کلام جس کا نام صاحبِ صاحب نے مصدرِ الہام رکھا ہے ان کی شاعری کا حاصل ہے۔ اس مجموعے میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ کسی شعر میں کوئی لفظ ایسا استعمال نہ ہو جس میں نقطہ آنا کہ اب سے پہلے جب ہماری تہذیب زندہ تھی صنعتِ غیر منقوطہ میں شاعری کرنا کمالات کا کمال سمجھا جاتا تھا۔ اس کمال کا اندازہ اُس وقت کیا جاسکتا ہے جب آپ شاعری کی بات تو چھوڑ کر ایک سطر نہیں ایسے الفاظ کی مدد سے لکھنا چاہیں جن میں نقطہ نہ آتا ہو اور کوشش کریں کہ بات ہی ڈھنگ سے آواہر جائے اُس وقت صحیح معنی میں آپ جناب صاحبِ سحر اوی کے فنِ لطیف کا داد دے سکتے ہیں۔ اس مجموعہٴ کلام میں جتنی غزلیں، قطعات، رباعیات اور نعتیں ہیں ان میں کہیں

بھی ایک لفظ ایسا استعمال میں نہیں آیا جس میں نقطہ آیا ہو۔ پھر قابل تعریف بات یہ ہے کہ صاحب نے غیر منقوط الفاظ کو بحر اور وزن کی دشجہ وال میں قید نہیں کیا اگر وہ صرف یہی کرتے تو ان کی محنت کی داتو تو دی جا سکتی، لیکن شعر کا مزہ آتا۔ صاحب نے بیک وقت دونوں کام کئے ہیں۔ ایک طرف غیر منقوط الفاظ استعمال کیے ہیں اور دوسری طرف شاعری کا جادو بھی جگایا ہے۔ یہ ایسا کام ہے جس کی داوڑ دینا سفاکی ہے۔

اردو دھرم و نشا کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو اس فن میں بہت کم لوگوں نے اظہار کمال کیا ہے۔ یہ تو ایسے جان جو کھوں کا کام ہے کہ لکھنے والا خون تھوکنے لگے۔ فیضی نے نثر فارسی میں مرقان پاک سکا غیر منقوط تفسیر لکھی تھی اور اس کا نام "سواطیع الالبہام" رکھا تھا۔ جناب قبلے اپنے غیر منقوط مجموعہ "کلام کا نام" مصدرا البہام" رکھا ہے۔ انشاد اللہ خان انشانے ایک مختصر دیوان اور ایک کہانی اسک گہرا اس صنعت غیر منقوط میں تصنیف کی ہے اور ایک مثنوی اور ایک قصیدہ منقبت بھی اسی صنعت میں لکھے تھے۔ شاگرد و تیر مرزا محمد تقی اختر کا ایک مرفیہ بھی اسی صنعت میں ملا ہے۔ یہ وہی مرفیہ ہے جو "ذخیرۃ قائم" نامی مجموعہ مرثی میں مرزا سلامت علی دتیر کے نام سے درج کیا گیا ہے۔ صدر عالم صند نے ایک قصہ "سرد صدر" کے نام سے اسی صنعت میں تحریر کیا تھا جس کا مخطوط انجن ترقی اردو پاکستان میں میری نظر سے گذرا ہے۔ لچمن پر شاہ صدر لکھنوی نے "سدایا" کے قصے کو صنعت غیر منقوط میں منظوم لکھا تھا جس کا ذکر غم خانہ جاوید کی جلد پنجم (۱۹۶۹ء) میں ملا ہے، بحر الفصاحت (۱۹۶۹ء) میں دتیر کے تین بے نقط مرثیوں کا ذکر ملا ہے اور ایک جند میر انیس کا بھی اس صنعت کی مثال میں دیا گیا ہے۔ مرزا دتیر کے چھپتے شاگرد شیخ فقیر حسین عظیم نے صنعت غیر منقوط میں مرزا دتیر کے انتقال کی تاریخ لکھی تھی۔ (دہلی ان دتیر ۱۳۳۹ء) ایسی ہی چند مثالیں تلاش سے اور پیش کی جا سکتی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس شکل صنعت میں بہت کم اہل کمال نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ مصدرا البہام اس فہرست میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

صاحب نے اپنے مجموعہ کلام میں صنعت غیر منقوط کو استعمال کرنے کا سبب یہ بتایا ہے کہ غیر منقوط کلام کی اشاعت کا مقصد اردو کی قوت ابلاغ کا مظاہرہ ہے۔ دکھانا ہے کہ اردو نہیں الفاظ کا کس قدر بے پناہ ذخیرہ ہے کہ بعض دانستہ پابندیوں کے باوجود اس میں ہر قسم کی خیالیت

کا اظہار بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ اس مجموعہ کلام سے نہ صرف اردو کی بلکہ خود صبا صاحب کی قوتِ ابلاغ کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

مجھے ہمارے خیال آتا ہے کہ آخر کلمہ قیام کے سارے الفاظ کیوں غیر منقوط ہیں؟ آخر اللہ اور اس کے رسول محمدؐ کے نام میں نقطہ کیوں نہیں آتا۔ لفظ تو سب ہی پاک ہیں، گتیں کیا اس طرح غیر منقوط الفاظ زیادہ اہم نہیں ہو جاتے؟ پھر یہ خیال بھی آتا ہے کہ غیر منقوط الفاظ منقوط الفاظ کے مقابلے میں صوتی اعتبار سے زیادہ کمزور ہوتے ہیں یہ وہ الفاظ ہیں جنہیں زبان کو تپش دینے بغیر دل کی زبان سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو ہمارے دل کی آواز بن سکتے ہیں اور جنہیں ہم اپنے دل کی گہرائیوں سے اپنی روح کی آواز میں تبدیل کر سکتے ہیں مجھے تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ غیر منقوط الفاظ کا تعلق ہماری روحانی زندگی سے زیادہ ہے۔ باطن کی آواز مظاہر کی آواز سے زیادہ سچی اور زیادہ بامعنی ہوتی ہے، لکھتے لکھتے یہاں تک پہنچا تو خیال آیا کہ آپ کو سوچنا ہوا چھوڑ کر میں اب رخصت ہو جاؤں اور پھر آپ جانیں اور صبا صاحب جانیں۔ میں آپ کے دروازے کے درمیان کیوں دیوار بنوں۔

(۳ مارچ ۱۹۷۶ء)

غیر منقوط نثر: ہادی عالم

آج مجھے آپ سے ایک ایسی کتاب کا تعارف کرانا ہے جو ایک طرف اس انسانِ کامل کی مقدس سیرت کو پیش کرتی ہے جس نے انسان کو فرض سے اٹھا کر عرض تک پہنچایا اور دوسری طرف جس میں اس عظیم انسان کی سیرتِ کاملہ کو صرف ایسے الفاظ کے ذریعے پیش کیا گیا ہے جن پر نقطہ نہیں لگایا جاتا۔ غیر منقوط الفاظ کے ذریعے اپنی بات کو سلیقے سے کہنا ایک نہایت مشکل کام ہے اور اس کام کی داد وہی دے سکتے ہیں جنہوں نے تیشے سے جوئے شیر لانے کا کام کیا ہے۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں ہمارے رسم الخط میں نقطہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور عربی، فارسی و اردو کے بیشتر الفاظ منقوط ہوتے ہیں۔ بخود فرمائیے کہ لغت کے ٹپے جھٹے کو نظر انداز کر کے صرف ان الفاظ کے سہارے اپنی بات کہنا اور اس طور پر کہنا جس طور پر مولانا محمد ولی رازی صاحب نے کسی بے ایک ایسا کارنامہ ہے جس کے تصور ہی سے صاحبانِ ادب کے قلم جنبش سے محروم ہو جاتے ہیں۔ غیر منقوط الفاظ سے کوئی ادب پارہ تخلیق کرنا صرف ان زبانوں میں ممکن ہے جنہوں نے اردو فارسی کی طرح عربی رسم الخط اختیار کیا ہے اور جہاں منقوط و غیر منقوط الفاظ خود زبان اور اس کے رسم الخط کو مابعد الطبیعیاتی اساس اور دینی بنیاد فراہم کر کے کائنات کے وجود میں جگہ گاتے ستاروں اور محو خرام سیاروں کا سماں پیدا کرتے ہیں۔ اسی مابعد الطبیعیات سے ہمارا تصور و جمال پیدا ہوا ہے اور الفاظ اسی رسم الخط کی مدد سے ہمارے ظاہر کی کرائمش اور ہماری روح کی بالیدگی کستے ہیں۔ یہ وہ نکتہ ہے جس سے اسلامی تہذیب کی روح نے جنم لیا ہے۔ لیکن آج تہذیبِ مغرب کے سیلاب میں بہہ کر ہم ایک ایسے گہرے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ اب ہمیں اپنی روایت، اپنی فکر، اپنی زبان، اپنا رسم الخط فرض کر اپنی ہر چیز پر مایہ نظر کرنے

گئی ہے۔ حالانکہ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ اسلام نے انسانی زندگی کو ہر طرح پر اپنے سانچے میں ڈھالا ہے مثلاً اپنے رسم الخط ہی کو بھیجیے۔ اس کا رخ سیدھے ہاتھ کی طرف سے اُلٹے ہاتھ کی طرف ہوتا ہے یہ رخ بھی بے سبب نہیں ہے۔ یہ بھی دینی بنیاد پر قائم ہے۔ اسلام نے اپنے نظام کائنات میں سیدھے ہاتھ کو اہمیت و فوقیت دی ہے اور اسی لیے اسلامی تہذیب اور سلطان معاشروں میں ہر کام سیدھے ہاتھ سے ہوتا ہے۔ ہم کھانا کھاتے ہیں تو سیدھے ہاتھ سے پانی پیتے ہیں تو سیدھے ہاتھ سے۔ نماز پڑھ کر سلام پھیرتے ہیں تو پہلے سیدھے ہاتھ کی طرف پھیرتے ہیں۔ طواف کعبہ کرتے ہیں تو اُس کا رخ بھی وہی ہے جو ہمارے رسم الخط کا رخ ہے۔ طواف کرتے ہیں تو دایاں پر پہلے اٹھاتے ہیں گویا جب ہم اپنے رسم الخط میں کچھ لکھتے ہیں تو ہم ہر بار طواف کعبہ کے عمل کو دہراتے اور اپنی دینی روایت کو زندہ کرتے ہیں۔ لیکن آج جب ہم اپنے فکر و عمل سے اپنی دینی اساس کو فراموش کر کے مغرب کے ہاتھوں مغلوب ہو رہے ہیں مولانا محمد ولی رازی نے اپنی زیر نظر تصنیف "یادی عالم" میں غیر منقوطہ الفاظ کی مدد سے اردو نثر کا ایک اسلوب تخلیق کر کے ہمیں پھر سے اپنی دینی روایت کی معنویت اور اس کی دریافت نو کی طرف متوجہ کیا ہے۔

غیر منقوطہ تحریروں کی روایت عربی فارسی اور اردو ادب و بیات میں پہلے سے موجود ہے۔ عربی میں مقامات حریری، فارسی زبان میں امیر خسرو کا کچھ کلام اور فیضی کی سوا طلع اللہام اردو میں انشاء اللہ خان انشا کا غیر منقوطہ دیوان اور کئی دوسری تخلیقات موجود ہیں لیکن اب تک ایک موضوع پر اردو نثر میں پوری کتاب کسی نے تصنیف نہیں کی تھی۔ اسی لیے مولانا محمد ولی رازی کی تصنیف "یادی عالم" تاریخی اہمیت کی حامل ہے جس میں سیرت رسول بیان کرتے ہوئے فاضل مصنف نے ایک لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کیا جس میں نقطہ استعمال ہوتا ہو اور پھر خوبی یہ رکھی کہ نہ اظہار میں تشبیہ پیدا ہوا، نہ بیان میں کم زوری آئی اور نہ اسلوب میں جھول پیدا ہوا اور نفس مضمون بھی پڑھنے والے تک پوری طرح پہنچ گیا۔ کتاب پڑھتے ہوئے مجھے بار بار یہ خیال آیا کہ اگر محمد طیب

کے سلسلے الفاظ بے نقط یا غیر منقوط کہیں ہیں؟ آخر اللہ اور اس کے رسول پاک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام میں نقطہ کیوں نہیں آتا؟ لفظ تو سب ہی پاک ہوتے ہیں لیکن اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بے نقط ہونے کی وجہ سے زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ پھر مجھے یہ خیال بھی آیا کہ غیر منقوط الفاظ منقوط الفاظ کے مقابلے میں اصولی اعتبار سے زیادہ سبک ہوتے ہیں۔ یہ وہ الفاظ ہیں جنہیں زبان کو جنبش دینے بغیر دل کی زبان سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو ہمارے دل کی آواز بن سکتے ہیں اور جنہیں ہم اپنے دل کی گہرائیوں سے روح کی آواز میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ مجھے تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ غیر منقوط الفاظ کا تعلق زندگی کے روحانی پہلو سے ہے۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک عربی رسم الخط غیر منقوط تھا۔ حروف پر نقطہ لگانے کا طریقہ خود ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا۔ روایت ہے کہ ایک دن حضرت معاویہؓ نے ایک کاتب کو بلایا اور فرمایا کہ میں تمہیں لکھواتا ہوں۔ لکھو اور "رقش" کرو۔ کاتب نے پوچھا کہ حضور "رقش" کیا چیز ہے؟ حضرت معاویہؓ مسکرائے اور کہا کہ ایک دن جب میں مدینہ منورہ میں تھا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتب کی حیثیت سے مجھے بلایا اور فرمایا لکھو اور رقص کرو۔ اس وقت میں نے بھی پوچھا تھا کہ یا رسول اللہ! رقص کیا چیز ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حروف پر جہاں ضرورت ہو نقطے لگاؤ۔ اب آپ دیکھیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بے نقط الفاظ کی روحانیت میں نقطے کا اضافہ کر کے اسے زندگی کے عمل سے ملا دیا اور اس طرح اسلام کی دینی روایت کو مکمل کر دیا۔ میں نے جب مولانا محمد ولی رازی صاحب کی تصنیف ہادی عالم کا مطالعہ کیا تو میں نے دراصل دینی روایت کے دائرے میں روحانی سفر کیا اور یہی وہ روحانی سفر ہے جس کی ہمیں اپنے معاشرے میں اس وقت سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ وہ روحانی سفر جس سے بے لوثی اور ایثار

کی قدریں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ روحانی سفر جس سے زندگی اگے بڑھتی ہے وہ روحانی سفر جس سے معاشرے ترقی کرتے ہیں۔ وہ روحانی سفر جس سے دلوں میں محبت اور اخوت کی دنیا آباد ہوتی ہے اور امن و سکون اور اعتماد و اعتبار کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ مولانا محمد ولی رازی صاحب کی کتاب نے مجھ پر یہ سفر آسان کر دیا اور یہی وہ سفر ہے جس سے زندگی میں نئی معنویت پیدا ہوتی ہے۔

(۱۵۴۱۶)

رحمن بابا کا پیغام

پشتوا دہل سے دل چسپی رکھنے والے طلبہ نے جب مجھ سے رحمان بابا کے جلسہ یاد میں تقریر کرنے کی فرمائش کی تو میں نے ڈائری دیکھ کر فوراً نامی بھرنی یہ میری عادت ہے جو کام میں کر سکتا ہوں فوراً کر دیتا ہوں، مگر نہیں کر سکتا تو پھر نہیں کر سکتا۔ مجھے طلبہ سے محبت ہے۔ وہ محبت اور شفقت جو باپ کو اپنے بیٹوں سے ہوتی ہے۔ جب طلبہ چلے گئے تو میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا کہ رحمن بابا کی وفات کو اب تقریباً تین سو سال ہو گئے ہیں آخر ہم انھیں آج بھی کیوں یاد کرتے ہیں۔ لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں۔ شادی بیاہ کرتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں۔ لوگ انھیں بھول جاتے ہیں۔ یہی کام ایک حیوان بھی کرتا ہے۔ پیدا ہوتا ہے۔ کھاتا پیتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ اپنے مرنے کے ساتھ ہی زندگی کے اس کارشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔ رحمن بابا بھی ایک انسان تھے۔ لیکن وہ مرنے کے ساتھ مرنے نہیں گئے۔ وہ آج بھی زندہ ہیں اور آج بھی ہمارے دل کے نبضات خلتے ہیں زندہ ہیں اور ہماری رگوں میں خون بہہ رہا ہے۔ خود سمجھیے تو آپ بھی میری طرح اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ مرنا رخصت ہے۔ سب کو مرنا ہے لیکن وہ لوگ جو زندگی میں اچھے اچھے کام کرتے ہیں۔ زندگی میں جن کا کوئی مقصد ہوتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں تو وہ لوگ رحمان بابا کی طرح مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ اسی لیے آج یوم رحمان بابا مناتے ہوئے آپ کو بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ آپ بھی زندگی میں ایسے کام کریں جن سے آپ کا نام روشن ہو اور مرنے کے بعد بھی لوگ آپ کو یاد رکھیں۔ اسی وقت انسان حیوان کی سطح سے بلند ہو سکتا ہے۔ اسی وقت انسان انسان بن سکتا

ہے۔ اُردو کے لافانی شاعر میر تقی میر نے کہا تھا:

ہمارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو

ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

سب سے پہلا سبق اس شعر سے یہ ملتا ہے کہ ہمیں زندگی میں ایسے کام کرنے چاہئیں جس سے آپ سب کو یاد رہیں اور یہ کام جیسا کہ رحمن بابا نے کہا ہے، اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب انسان دنیا میں سب اچھے کام کرے۔

رحمن بابا نے کہا تھا:

غفلت کی نیند سے جاگ اٹھو

کب تک اونگھتے رہو گے

ہر وقت دعا اور درود میں مشغول رہو

آدمی کے ظاہر لباس سے دھوکا نہ کھاؤ

اس کے باطن کو دیکھو کہ پُر مغز ہے یا بے مغز ہے۔

رحمان بابا نے ان شعروں میں جن کا ترجمہ میں نے آپ کو سنایا ہے آپ کو غفلت کی نیند سے جاگنے کی تلقین کی ہے۔ غفلت انسان کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ غفلت کی وجہ سے انسان اپنی عمر کو ضائع کر دیتا ہے اور جب وہ ضائع ہو جاتی ہے اور پھر واپس نہیں آتی تو وہ پچھتا تا ہے۔ دوسری بات رحمن بابا نے یہ بتائی ہے کہ انسان کے ظاہر کو نہیں بلکہ اس کے باطن کو دیکھنا چاہیے۔ باطن ہی اصل حقیقت ہے۔ ظاہر صرف دھوکا ہے۔ اچھا انسان وہ ہے جس کا ظاہر نہیں بلکہ اس کا باطن اچھا ہو۔ وہ پُر مغز ہو بے مغز نہ ہو۔ مجھے یاد آیا کہ پشتو کے ایسے بہت سے ٹپے ہیں جن میں بہت خوب صورت الفاظ ہیں میں عمر کو ضائع نہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک ٹپے میں کہا گیا ہے کہ:

(۱) " عمر کی مثال پانی کی لہر کی سی ہے۔ کچھ کا دن جو گزر گیا تو پھر

واپس نہیں آئے گا۔ "

(۲) " میری عمر لوں ضائع ہو رہی ہے جس طرح بنجر زمینوں پر

بارش :

ایک اور ٹپے میں کہا گیا ہے :

”گذرا ہوا وقت واپس نہیں آئے گا۔ چاہے میں کانٹوں کو اپنے

آنسوؤں سے ہر اکسیروں نہ کروں گا۔“

اسی لیے رحمان بابا کی یاد مناتے ہوئے آپ کو چاہیے کہ آپ ان کے کلام سے وہ سبق حاصل کریں جس سے آپ کی زندگی سنورے۔ آپ زندگی میں وہ کام کریں جن سے آپ رحمان بابا کی طرے ہمیشہ زندہ رہیں۔ وہ لوگ جو اس بات کو سمجھتے ہیں زندگی ہمیشہ کامیاب رہتی ہے۔ رحمان بابا نے کہا تھا :

”وہ لوگ جو سب دشمن ہیں، منی اور سونے میں اور خیر و شر میں

کوئی فرق نہیں کرتے وہ اندھے ہیں۔“

ایک اندھا وہ ہوتا ہے جس کی آنکھیں کی روشنی ضائع ہو جاتی ہے لیکن ایک اندھا وہ ہوتا ہے جو منی اور سونے میں فرق نہیں کرتا۔ جو خیر و شر میں فرق نہیں کرتا۔ جو تنگ دل ہوتا ہے۔ جو تنگ نظر ہوتا ہے۔ جو لالچ میں مبتلا ہوتا ہے۔ جو ذرا سے وقتی فائدے کے لیے وہ کرتا ہے جو شر ہے، خدا ہے اور خیر کو بھول جاتا ہے۔ عزیز و اقارب وہ چیز ہے جس سے آدمی مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے اور جس سے اس کا نام روشن ہوتا ہے۔ زندگی میں عزت و احترام کا مالک ہوتا ہے اور رحمان بابا کی طرح مرنے کے بعد بھی وہ ہمارے دلوں کی دھڑکن بن جاتا ہے۔ رحمان بابا جو پشاور کے قریب مہمند قبیلے کے ایک گاؤں بہادر کی میں پیدا ہوئے، ایک ایسے انسان تھے جن کی زندگی خیر کی تلاش میں گذری۔ وہ مہمند ہوتے ہوئے بھی انسان تھے، عشق ان کا مشرب تھا۔ عشق سب انسانوں سے، ساری خلقت سے، ساری انسانیت سے ان کا مقصد حیات تھا۔ ایک شعر میں کہتے ہیں :

”میں عاشق ہوں اور میرا کام صرف عشق ہے۔ میں نہ غلیل

ہوں، نہ داؤد زلی اور نہ مہمند۔“

ایک اور شعر میں کہتے ہیں :

”اگر میں تمہارے عشق کے مرتبے کا راز نکھول دوں تو فرشتے انکس
کرنے لگیں کہ اے کاش ہم انسان ہوتے !“

یہی انسانیت ہمارا مقصد حیات ہونا چاہیئے۔ یہی وہ سبق ہے جو رحمان بابا نے ہمیں دیا ہے اور یہی وہ راستہ ہے جو ہمیں دکھایا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ سے یہ کہوں کہ رحمان بابا کی یاد منانے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کے خیالات کو ان کی باتوں کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں۔ اپنی زندگی کو سنواریں۔ انسان وہی بنتا ہے جو وہ خود کو بناتا ہے۔ وہ انسان جو خود کو انسان نہیں بتاتا دو پیروں پر چلنے کے باوجود حیوان رہتا ہے۔ آج رحمان بابا کی روح کو خوش کرنے کا مجھے یہی صحیح طریقہ نظر آتا ہے کہ آپ سب ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں اور خود کو انسان بنائیں۔ ایسا انسان جو محبت کو پھیلاتا ہے۔ جو خیر کا راستہ اختیار کرتا ہے اور جو اپنے ملک اپنے وطن سے محبت کرتا ہے اور دشمن سے بھی خیر کا سلوک کرتا ہے۔

عزیزو! اس سے قبل کہ میں آپ سے رخصت ہوں پشتو کے دو مہوں کا ترجمہ آپ کو اور سنادوں تاکہ رحمان بابا کی نیک روح خوش ہو جائے۔ وہ چتے یہ ہیں :

(۱) ”اے اللہ مجھے سو بار زندگی دے تاکہ میں سو بار وطن کی محبت
پر اس کو نثار کروں !“

(۲) ”میرے محبوب نے وطن کی راہ میں سروے دیا۔ میں اپنی زلفوں
سے اس کا کفن میوں گی !“

خدا کرے ہمارے درمیان بہت سے رحمن بابا پیدا ہوں تاکہ ہمارا ملک اور اس کے رہنے والے حقیقی معنی میں انسان بن جائیں۔ وہ انسان جو سب سے محبت کرتا ہے۔ اپنے عزیزوں دوستوں سے بھی اور وطن سے بھی۔

بابا رحمن اسی لیے میرے پسندیدہ اور محبوب شاعر ہیں کہ ان کی شاعری میں مجھے انسان دوستی کی وہ خصوصیت ملتی ہے جو وسیع القلب اور وسیع النظر انسانوں کا شیوہ رہی ہے۔ رحمن بابا کی شاعری کو پسند کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں ایک ایسی سادگی، ایک ایسی روانی اور ایسی گہری معنویت ملتی ہے کہ ان کے اشعار آج بھی سُنتے اور پڑھنے والوں کے دل پر گہرا اثر کرتے ہیں۔ آپ یہاں یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ آخر اس اثر کی اصل وجہ کیا ہے۔ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ وہ لوگ جو زر پرست نہیں ہوتے، بے نیاز ہوتے ہیں۔ یہی درویش کی صفت ہے۔ ان میں زمال کی طبع ہوتی ہے اور نہ زر و دولت کی ہوس ہوتی ہے۔ دراصل زر پرستی معاشرے کو خراب کرتی ہے۔ لوگوں کو لوٹ کھسوٹ اور جبر و استحصا کی طرف لے جاتی ہے اور اسی لیے انسان سخت دل، خود غرض اور ریاکار ہو جاتا ہے۔ سلام ہے ان لوگوں کو جو بابا رحمن کی طرح ہوس و طمع کی لعنت سے پاک ہوتے ہیں۔ ان کے دل صاف ہو کر انسانیت کا آئینہ بن جاتے ہیں اور ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ میں حار و کاثر پیدا ہو جاتا ہے۔ رحمن بابا کی شاعری اسی لیے ہمیں آج بھی متاثر کرتی ہے۔ رحمن بابا کا مشرب صلیح کل تھا وہ قبائلی بنیادوں پر تنازعات کو بُرا سمجھتے تھے اور انسانیت کی بنیاد پر انسانوں کے رشتوں کو دیکھتے تھے۔ اسی لیے ان کا اخلاق اعلیٰ، ان کی فکر وسیع اور ان کا انداز نظر صلیح کل کی طرف مائل تھا۔ اور جنگِ زب عالم گیر کا جب انتقال ہوا تو اس وقت رحمن بابا زندہ تھے۔ ایک قصیدے میں رحمن بابا نے اورنگ زیب کے بیٹوں کی آپس میں لڑائی پر نہایت دکھ کے ساتھ اظہارِ افسوس کیا ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ جنگ ان کے مسلک کے خلاف اور ہوس پرستی کی جنگ تھی۔ اسی قصیدے میں بابا رحمن نے اورنگ زیب عالم گیر کو "ظلمت کڈ

ہند کا آفتاب قرار دے کر اس کی مدح بھی کی ہے، وہ اور جنگ زیب کو اس لیے پسند کرتے تھے کہ وہ نہ صرف متقی اور پرہیزگار تھا بلکہ اس نے سارے بڑے عظیم کو اپنی دانش و حکمت سے متحد کر رکھا تھا۔

رحمن بابا ایک نیک باطن بزرگ و صوفی انسان تھے۔ اسی لیے لفظ بابا ان کے نام کا حصہ بن گیا ہے۔ پشتو زبان میں بابا خدا رسیدہ بزرگ کو کہتے ہیں۔ ایک مصنف نے کسی جگہ لکھا ہے کہ پشتو ادب میں رحمن بابا کو وہی مقام حاصل ہے جو فارسی ادب میں حافظ شیرازی کو حاصل ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ برسوں حافظ شیرازی کے کلام سے فال نکالی جاتی رہی ہے۔ یہی صورت رحمن بابا کے کلام کے ساتھ ہے۔ زائد قدیم سے لوگ ان کے کلام سے فال نکالتے ہیں اور اس سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ”ٹپہ خزانہ“ کے حوالے سے کتابوں میں آیا ہے کہ ”افغان سلطنت کے ہائی حسابی میرادیس خان چوٹیک نے جب ایران کے صفوی بادشاہوں کے خلاف آزادی کا علم بلند کیا تو رحمن بابا ہی کے دیوان سے فال نکالی تھی اور کامیابی حاصل کی تھی۔“

اٹھارویں صدی عیسوی کی پہلی چوتھائی میں بابا رحمن نے وفات پائی اور ”ان کا مزار پشاور کے جنوب میں ہزار خانہ کے مقام پر اخوند درویش کے مزار کے نزدیک“ آج بھی موضع خلائی ہے۔ رحمن بابا ایک بڑے انسان، ایک بڑے شاعر اور اعلیٰ اخلاقی فکر رکھنے والے نیک باطن اور درویش صفت انسان تھے۔ ایسے انسان کبھی کبھار پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کی روشنی سے گئے والی نیلیں ہمیشہ نور اور حرارت حاصل کرتی رہتی ہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ ہمارے نوجوان بھی بابا رحمن کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں تاکہ اپنی صلاحیتوں سے وہ بھی انسانیت کی عظیم خدمات انجام دے سکیں۔ بابا رحمن نے اپنے ایک شعر میں لکھا ہے کہ ”اگر میں تمہارے عشق کے مرتبے کا راز نکول دوں تو فرشتے انوس کرنے لگیں کہ اسے کاش ہم بھی انسان ہوتے۔“ پاکستان کے نوجوانوں کو بابا رحمن کا یہی پیغام ہے کہ وہ قبائلی و علاقائی تعصبات سے بلند ہو کر زندگی کا مطالعہ کریں اور انسانیت کی خدمت کو اپنی منزل بنائیں۔ اسی وقت ہماری نئی نیلیں معاشرے کو جہد و استقامت سے پاک کر سکتی ہیں اور زر پرستی کو ختم کر سکتی ہیں۔

شاہ عبداللطیف کی شاعری کے نئے گوشے

”بین الاقوامی سندھی ادبی کانفرنس“ کے موقع پر میں نے جو موضوع اپنے لیے منتخب کیا ہے وہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری ہے۔ یہ موضوع میں نے اس لیے منتخب کیا ہے کہ شاہ کی شاعری کا بنیادی فلسفہ عشق ہے جس سے محبت ”انسانیت“ ملاپ اور یکساہتی کی وہ خوشبو نکلتی اور پھیلتی ہے کہ مشامِ جان معطر ہو جاتے ہیں۔ یہی وقت کا تقاضا ہے اور یہی وجہ ہے کہ شاہ کی شاعری آج نصف سارے پاکستان میں بلکہ ساری دنیا میں تُوڑ اور روشنی پھیل رہی ہے اور روز بروز مقبول ہو رہی ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی (مرتوی ۵۲، ۶۱ء) سندھی زبان کے وہ شاعر ہیں جن کی شاعرانہ عظمتوں سے سندھ کے عوام و خواص یکساں طور پر مستفیض ہوئے اور ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری دل کی آواز ہے اور اسی لیے دل میں اُتر جاتی ہے۔ وہ ایک ایسے صوفی شاعر ہیں جن کی شاعرانہ لہ نے قرآن و حدیث کی روح کو معاشرے کی روح میں جذب کر دیا ہے۔ توحیدان کی شاعری کا مرکزی نکتہ ہے جس سے فلسفہ و فکر کی وہ کرنیں پھوٹتی ہیں جو ساری زندگی کو منور کر دیتی ہیں۔ شاہ نے ایسی شاعری کی ہے جو بیک وقت مقامی بھی ہے اور مائورائے مقام بھی اور اسی لیے آج تقریباً ڈھائی سو سال بعد بھی وہ اسی طرح تروتازہ اور پُر اثر ہے۔

شاہ نے اپنی شاعری سے خود سندھی زبان کو زندہ کیا اور اس میں وہ دل آویزی، حاذیبت اور اعلیٰ انسانی قد میں پیدا کیں کہ آج سندھی زبان ایک بلند مقام پر فائز ہے۔ شاہ نے اپنی شاعری سے دنیا کو انسانیت کا درس دیا اور انسانوں کو بحیثیت انسان بہتر

انسان بننے کی تلقین کی۔ غریب عوام جو غلام و مستبدان کا شکار تھے شاہ نے ان کی حمایت میں آواز بلند کی۔ انھوں نے اپنے لغات سے عوام کی ترجمانی بھی کی اور راہنمائی بھی۔ وہ وصانیت کے متلاشی تھے۔ جب جوئے حق اور قرب الہی ان کا مسلک تھا۔ شاہ نے اپنی داستان میں جو خیال آرائی کی ہے اس میں سچائی اور حق کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے سچ شاہ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ شاہ کا کلام زبان زد خاص و عام ہے۔ وہ محبت کے شاہ ہیں وہ محبت جو انسان کو انسان کے قریب کرتی ہے۔ ان میں اتحاد اور پیار کا رشتہ پیدا کرتی ہے اور اخوت کے رشتے میں پرو کر معاشروں کو پر امن بنا دیتی ہے۔ شاہ نے ان ہی خیالات کو تصوف کے حوالے سے اپنی شاعری کے ذریعے سارے معاشرے تک پہنچایا ہے۔ ان کے کردار و راصل استعارے ہیں جن سے ان کے فلسفہ تصوف کی ترجمانی ہوتی ہے۔ شاہ کا رسالہ ایک ایسا ہارٹ ہے جس میں مختلف رنگ و بو کے پھول اور گلیاں کھلے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری میں حافظہ سعدی کی لے بھی شامل ہے اور رومی و عطار کا فلسفہ بھی۔ انسانی اقدار کی سر بلندی اور نچر امن اور صالح معاشرے کا قیام ان کی شاعری کا مقصد ہے۔ انھوں نے زمین کے سرو و گرم کو خود حکیمانانیت کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھانی۔ حق ووق صحراؤں کو عبور کیا۔ پہاڑوں کے دامن میں ڈیرہ جمایا۔ ریگستان کی تپتی ہوئی زبیر پر سیر کیا۔ غربت کی تسکلیف اٹھائیں۔ برفانی ہواؤں کا مقابلہ کیا اور باوجود محوم کے تھپیڑوں سے زندگی کے راز مرستہ کو تلاش کیا یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری عوام کی روح سے قریب ہے اور اسی لیے ان کی شاعری میں بلا کا سوز اور بلا کی تاثیر ہے۔ وہ ملتی ہوئی انسانیت کو حوصلہ دیتے ہیں۔ وہ زندگی بسر کرنے کا شعور پیدا کرتے ہیں اور زندگی میں عمل کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ وہی پیغام ہے جو قرآن پاک اور رسول اکرمؐ نے ہمیں دیا ہے۔ مولانا روم کی آوازاں کی شاعری کی آواز میں شامل ہے اور اوس قرنی، سلطان فارسی اور ابوذر غفاری کا فلسفہ حیات ان کے فلسفہ حیات میں رنگ بھرتا ہے۔ شاہ سے پہلے یا شاہ کے بعد کسی شاعر نے اس والہانہ ذوق و شوق کے ساتھ عوام کی روح کی طور پر ترجمانی تو نہیں کی۔ اسی لیے شاہ نے اپنے کلام میں اہل دنیا

کو اتحاد، اخوت، محبت اور بھائی بھائی کی تعلیم دی ہے۔ ان کے نزدیک شاعری خود منزل مقصود نہیں ہے بلکہ منزل پر پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ شاہ کے کلام اور ان کے فلسفہ و فکر کے متاثر ہو کر میں نے طے کیا ہے کہ ان کے پیغام کو ہر طبقے اور ہر زبان کے بولنے والوں تک پہنچایا جائے اور اسی لیے جب ۱۹۸۳ء میں میں نے کراچی یونیورسٹی سے وائس چانسلر کا منصب سنبھالا تو میں نے ارادہ کیا کہ کراچی یونیورسٹی میں ایک ایسا مرکز قائم کیا جائے جہاں سے شاہ کے پیغام محبت کو معاشرے کی روح میں شامل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسی خیال کے پیش نظر میں نے "شاہ عبداللطیف بھٹائی چیز قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا اور خدا کا شکر ہے کہ تین سال کی کوششوں کے بعد مجھے اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔ پچھلے سال کراچی یونیورسٹی میں شاہ عبداللطیف بھٹائی چیز قائم ہو چکی ہے اور اب وہاں شاہ پر جو کام ہو رہا ہے اس سے شاہ کا پیغام محبت اور درس اخوت و انسانیت انشاء اللہ تعالیٰ سارے پاکستان میں پھیلے گا اور شاہ کی فکر و شاعرانہ زندگی کے ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ بڑے شاعروں نے ہمیشہ پیغام محبت ہی سے دنیا کو بدلا ہے اور ہمارے شاہ لطیف بھٹائی نے بھی یہی کام اپنی شاعری سے انجام دیا ہے۔ شاہ لطیف کہتے ہیں :

”بلا کے پھر دینا محبوب کی عادت ہے۔ یہ ایک انہی بات ہے
مگر عشق کی ریت ہی ہے۔ اگر محبوب محبت کا رشتہ توڑتا ہے تو وہی
اسے جوڑتا ہی ہے۔“

اور پھر کہتے ہیں :

”اے طیب! اٹھو! جاؤ اپنی دوائیں ساتھ لے جاؤ
وہی اپنے لطف سے میری چارہ سازی کریں گے
جنہوں نے مجھے درد بخشا ہے۔“

شاہ لطیف چارہ سازی کے لیے محبوب ہی کے پاس جاتے ہیں طیب کے پاس نہیں۔ یہی محبت کا مثبت رویہ ہے اور اسی رویے کو ہمیں گہی گج کے دور میں اپنانا چاہیے کہ یہی تعلیم

شاہ صاحب نے دی ہے۔

اب آخر میں شاہ لطیف بھٹائی کے چند لہریات پیش کرتا ہوں۔ دیکھیے وہ ہم سے کیا کہہ رہے ہیں :

”لے کشتی! تو بھی ان سفینوں کے ساتھ چلتی چل۔ اس پار جاتے ہوئے بہتر سامان لے کے چلتا۔ خطرناک سمندر کا شور سنائی دے رہا ہے۔“

”کشتی سمندر میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ بڑھئی نے جو جنیں لگائی تھیں وہ کمزور ہو گئیں۔ معلم اپنی جگہ پر نہیں ہے۔ اس وجہ سے فرنگی چلے گئے۔ لے سلاخ! تیری کشتی میں چور داخل ہو گئے ہیں۔“

”سوداگر نے وہ سروں کا سامان کشتی میں خود لادنا کشتی کو دوڑوں طرف سے موجوں نے اُگر گھیرا۔ دوستو اگر مشیار ہو گئے تو یہ کشتی ہڈنک نہیں جائے گی۔“

(سرسری راگ، تیسری داستان)

”کمانچی کی قدر ہے۔ موتی کی ناندیری۔ میں سچ کو جھوٹی میں اٹھاتا پھرتا ہوں۔ پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔“

(سرسری راگ، چوتھی داستان)

”وہ جو ہر شناس چلے گئے جو نعل و جواہر کو پر کھٹے تھے۔ ان کے جانشینوں کو لوہے کی بھی پہچان نہیں۔ اب ان کی جگہوں پر لوہا ر لوبا کوٹتا ہے۔“

(سرسری راگ، چوتھی داستان)

”سنارے حرکت میں ہیں اور ندی نالے بھی حرکت میں ہیں۔“

لے ”شاہ جو رسالہ“ کا اردو ترجمہ انڈیا انڈیا قادی اور ڈاکٹر وقار احمد رضوی، مطبوعہ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد۔

کیونکہ جو کچھ تجھے ملتا ہے تو اسی پر قانع ہے۔ تو ساری رات سوتا رہتا ہے، تو دولت کس طرح جمع کرے گا۔“

(سرسری راگ، چھٹی داستان)

”بیٹھے رہنے سے خاوند نہیں ملتا، سوتے رہنے سے محبوب ہاتھ نہیں آتا۔“
 ساجن اس کو ملتا ہے جو راہوں سے اٹکھا گزرتے ہیں۔
 (سرسری آبروی، ساتویں داستان)

دانیال :-

”راہ میں تھک کر مت بیٹھو! ہوا اللہ!

جتنا چلو گے اتنا پاؤ گے۔

کوئی اُکے کچھ کہتا ہے کوئی اُکے کچھ کہتا ہے

جتنا چلو گے اتنا پاؤ گے؟

(سر معذوری، پانچویں داستان)

”شہنشاہیت بھی سوئی اُکے آگے بچ اور کم تر ہے کیونکہ خود

فلکی رو کر دوسروں کی عزتیاتی چھپاتی ہے۔ سوئی اُکی اس عظمت کو گھنے

کے لیے کئی جنموں کی ضرورت ہے۔“

(سر عمر ماروی، داستان ہفتم)

”گنا گنگر چھان پھر بادل برسے۔ بھلیاں چاروں اور کو بند رہی ہیں۔

کچھ بادل استنبول کی طرف، کسی کا رخ مغرب کی طرف ہے۔ کچھ چین پر لہرا

رہے ہیں۔ کوئی سر قند کی طرف رواں دواں ہے۔ کچھ روم پر رقصاں

ہیں۔ کوئی کابل و قندھار کی طرف، کچھ دنی و دکن کی جانب، اور کچھ

گرناہ کی طرف چھا رہے ہیں۔ کچھ حبشہ پر برس کر، بیکانیر پر یلغار

کمر رہے ہیں۔ کچھ بھجور پر برسے، کوئی ڈھٹ پر پھیل گیا۔ کچھ نے

عمر کوٹ سے ہوتے ہوئے و لھار پر موسلا دھار بارش

کی۔۔ (سرسار جنگ، داستان چہارم)

”بھلیاں کو نہ تی آئیں۔ برکھا کی رم جھم ہوتے لگی۔ جنھوں نے
گراں فروش کے لیے ذخیرہ اندوزی کی تھی وہ اب کفِ افسوس ملتے
ہیں۔ سوچ رہے تھے پانچ سے پندرہ ہو جائیں گے۔ اے خدا! ان
موزی گراں فروشوں کو موت دے دے۔ پھر چڑا ہے آپس میں بیٹھ کر،
کثرتِ باران کی باتیں کر رہے ہیں۔ سید کہے سب کو تیرا سہارا ہے۔“

(سرسار جنگ، داستان چہارم)

”سوچتی ہوں کہ یہ کہوں گی، جدائی کے دکھ ان سے بیان
کروں گی۔ لیکن جب وہ سامنے آتے ہیں تو سب باتیں دل ہی دل
میں رہ جاتی ہیں۔“ (سورج، داستان اول)

”لوگوں میں غلوں نہ رہا۔ ہر ایک دوسرے کا گوشت نوح رہا
ہے۔ دنیا میں صرف خوشبوئے اخلاق باقی رہ جائے گی۔ سب آدمی
ریاکار ہیں۔ مخلص تو کوئی ایک ہی ہو گا۔“

(سرسر و وسندھی، داستان سوم)

”اشد نے دوست سے ملایا۔ تجدیدِ رسم و راہ کی بات چھڑی۔
آنجنو ہر وفاق ہے کہ ترکِ محنت نہیں کیا کرتے۔“

(سرسر و وسندھی، داستان سوم)

”دل سے فتنہ و فساد کو نکالو۔ سلطان سے امن و صلح رکھو
تو دانا کے دربار سے ہر روز انعام و اکرام پاؤ گے۔“

(سریلا دل، داستان اول)

”دگند پھر آیا۔ اس سے کچھ کام کاج نہ ہوا۔ روٹی اکیڑا اور

مکان اس تو پیر و مرشد سے ملا۔“ (سریلا دل، داستان چہارم)

یہ وہ پیغام ہے جو شاہ سائیں نے سندھی زبان میں سارے عالمِ انسانیت کو دیا

ہے اور یہی وہ پیغام ہے جس پر عمل کر کے سندھ کو امن کا گہوارہ، عدل و انصاف کی سرزمین، بھائی چارہ کا مرکز اور ترقی کی قابل تقلید مثال بنایا جاسکتا ہے۔ یہی روح اسلام ہے۔ یہی روح پاکستان ہے۔ شام نے کہا تھا کہ ”بھنبھور میں جہنم کی آگ ہے بھنبھور پر اندھیرا چھایا ہوا ہے“ جہنم کی آگ کے اہل سندھ شاہ سائیں کے بتائے ہوئے رستے ہی سے نکل سکتے ہیں۔ دیکھیے شاہ سائیں آپ سے کیا کہہ رہے ہیں :

آئیں مہر و وفا یہ ہے کہ ترک محنت نہیں کیا کرتے

(۱۹۸۷ء)

نظام الملک میر عثمان علی خان کی خدمات

والئ دکن سلطان العلوم نظام الملک نواب میر عثمان علی خان مرحوم کی مستحویں بہی کے موقع پر اہل دکن کا یہ جلسہ منعقد کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نواب مرحوم نے دکن اور دکنیوں کی اتنی عظیم خدمات انجام دی ہیں کہ ان کی یاد ہمیشہ کی طرح آج بھی ان کے سینہٴ اخلاص میں فروزاں ہے۔ برصغیر کے طول و عرض میں ریاستیں اودھ گھاٹھیں لیکن حیدر آباد دکن کی ریاست کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ اس نے علم و ادب کا چراغ روشن کیا اور اس کے والی نے علوم و فنون کی تہہ جہتی ترقی میں گہری دلچسپی لے کر وہ کارنامے نمایاں انجام دیئے کہ ان کا نام نامی بھی سورج کی طرح ہمیشہ نوردرویشی پھیلاتا رہے گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ انھیں کبھی یاد کرتے ہیں اور اسی وجہ سے آنے والی نسلیں بھی انھیں یاد کرتی رہیں گی۔

خواتین و حضرات ! میں دکنی نہیں ہوں لیکن دکن سے میری گہری دلچسپی کے دو اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ دکن نے مجھے قدیم ادب کا شعور دیا ہے۔ میں نے دکنی ادب پر

کسی دکنی سے اگر زیادہ نہیں تو کم کام نہیں کیا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اُس وقت ہوا جب میں مارچ / اپریل ۱۹۸۳ء میں جناب میر عابد علی خان ایڈیٹر "سیاست" کی دعوت پر پہلا سیاست تو سیتی گھر "دینے کے لیے دہلی سے حیدرآباد گیا۔ سرزمین حیدرآباد پر قدم رکھتے ہی میں نے محسوس کیا کہ میں ایک ایسے مقام پر آگیا ہوں جہاں محبت ہی محبت ہے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ حیدرآباد کا شہر جنوبی، موٹیا اور موگرا کی خوشبو سے مہک رہا تھا اور اظہار محبت کے لیے بالیائی حیدرآباد خوشبوؤں کی مہک اور اخلاص کے پھولوں سے قدم قدم پر میری گلچن کر رہے تھے اور مجھ سے کہہ رہے تھے کہ آپ ہمیں اس لیے زیادہ عزیز ہیں کہ آپ نے دکنیات پر وہ کام کیا ہے جو خود دکنی بھی نہیں کر سکے ہیں۔ مجھے پہلی بار اپنے دکنی زبان و ادب پر کام کی صحیح و حقیقی داد حیدرآباد دکن میں ملی اور جب اور جہاں بھی گیا میں نے دیکھا، بوڑھے اور جوان، معمر اور نوجوان، مرد اور عورت کثیر تعداد میں شریک ہو رہے ہیں اور قدیم دکنی زبان و ادب کے بارے میں فحش سے گفتگو کر رہے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اہل دکن کو آج بھی اردو زبان و ادب سے اسی طرح گہری دلچسپی ہے جس طرح اُس وقت تھی جب سلطان العلوم میر عثمان علی خان والئی حیدرآباد تھے اور دکن کی ریاست علوم و فنون کے فروغ میں جیٹی جیٹی تھی۔ دکن کے گہری دلچسپی کا دوسرا سبب بالکل ذاتی نوعیت کا ہے جس کا اظہار بھرے جلسے میں اس لیے مناسب نہیں ہے کہ ذاتی باتیں عام طور پر جلسوں میں نہیں کی جاتیں لیکن یہ ذاتی بات اتنی اہم ضرور ہے کہ اس نے میری زندگی کو متاثر و متشکل کر کے میرے لیے وہ ماحول پیدا کیا کہ میں اپنے علمی و ادبی شوق کو زندگی کی ساری مصروفیت کے باوجود پوری توجہ سے جاری رکھ سکا۔ میں نے علم و ادب کا جو کام کیا اس میں اس دکنی خاتون کا ہاتھ اور اس کا اخلاص و ایثار شامل ہے جسے عرف عام میں بیگم جالبی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جناب وحید الدین خان بوڑھی صاحب نے جناب عظیم قادری صاحب صدف کے توسط سے مجھ سے آج کے جلسے میں شرکت کے لیے فرمایا تو میں نے اپنی ساری مصروفیات کے باوجود فوراً ہائی بھری اور آج میں گئی آپ کی طرح آپ کے ساتھ اس عظیم انسان کو یاد کرنے میں شریک ہوں جنہیں اب سب عرف سلطان العلوم کے

خطاب سے موسوم کرتے ہیں اور یہی خطاب دراصل ان کی شخصیت و خدمات کا جامع اظہار بن گیا ہے اور آج پاکستان میں جب اردو کو سرکاری و دفتری زبان بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں، سلطان العلوم کی ریاست حیدرآباد کی اردو خدمات ایک مثالی نمونے کا کام کر رہی ہیں۔

مجھے یاد آتا ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر فی الدین قادری زور مرحوم نے ۱۹۳۵ء میں عہد عثمان میں اردو کی ترقی کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی اور اس میں تحریر کیا تھا کہ ”سرزمینِ دکن نے اردو ادب کا آغاز نہ معلوم کون سی مبارک گھڑی میں کیا تھا کہ اس کے سپوت آج تک اس کی خدمت میں سرگرم کار ہیں اور گزشتہ تین چار صدیوں کے طویل عرصے میں کبھی کسی وجہ کے گہی اپنے کام کو ملتوی نہیں کیا یہ کام آج بھی ساری مخالفتوں اور منافقتوں کے باوجود حیدرآباد دکن میں ہو رہا ہے اور اردو خدمت کا یہی کام آج بھی اہل دکن کی قدیم و جدید پاکستانی نسلیں پاکستان میں انجام دے رہی ہیں۔ نہ صرف اردو خدمت بلکہ ہر شعبہ حیات میں پاکستان کی خدمت اخلاص و دردمندی کے ساتھ انجام دے رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان قابل ذکر خدمات کا سہرا سلطان العلوم کے سر اس لیے باندھنا چاہیے کہ اگر وہ فروغِ علم و فن کا چراغ اپنے دورِ حکومت میں سرزمینِ دکن پر روشن دیکرتے اور وہاں کے لوگوں کو جدید تعلیم سے بہرہ مند نہ کرتے تو اہل دکن وہ خدمات ہرگز سرگزا انجام نہیں دے سکتے تھے جو وہ آج دے رہے ہیں۔ فروغِ علم کی یہ جدید روایت سلطان العلوم میر عثمان علی خان مرحوم نے قائم کی تھی اور اس روایت کا فیض کچھ ہی اسی طرح جاری و ساری ہے۔ میرے لیے یہ غرض کی بات ہے کہ سلطان العلوم کی خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے آپ ہر سال یہ جلسہ کرتے ہیں میرا خیال ہے کہ غالب نے یہ مصرع نظم، ”وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے“ شاید اہل دکن کی اسی وفاداری کو محسوس کر کے کہا تھا۔

سلطان العلوم دنیا کے ایک امیر ترین انسان تھے۔ اتنے دولت مند کہ ان جیسے دو چار ہی انسان ہوں گے، لیکن انہوں نے اس دولت کے ایک حصہ کو

کار ہائے خیر اور تعلیم و علم کے فروغ پر صرف کیا۔ برصغیر کے متعدد تعلیمی مذہبی ادارے سلطان العلوم کی مالی اعانت کے زینت بنت رہے۔ اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سلطان العلوم نے برصغیر پاک و ہند میں اسلام اور مسلم تہذیب کی بقا و ترقی کے لیے بھی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ سلطان العلوم میر عثمان علی خان کے بارے میں اور بہت سی باتیں ہیں جو کہی جاسکتی ہیں لیکن آخر میں ایک بات آپ سب سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سلطان العلوم نے علم و تعلیم، ادب و فن کے فروغ کے لیے جو روایت قدیم کی تھی وہ روایت اب آپ کا تہذیبی ورثہ ہے۔ کیا آپ نے اس روایت کو زندہ و باقی رکھنے اور آگے بڑھانے کے لیے سرزمینِ پاکستان پر اجتماعی طور پر کچھ کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو اور کیجیے اور اگر نہیں کیا تو کرنا چاہیے آپ کے اسی عمل سے سلطان العلوم کی روح کو سکون پہنچے گا۔

(۲۳ فروری ۱۹۸۴ء)

قاضی عبدالخالق مورانی کی خدمات

قاضی خلیق مورانی مرحوم سے میں قاضی محمد اکبر صاحب کے ذریعے متعارف ہوا اور اتنا متاثر ہوا کہ ۱۹۷۶ء میں، میں نے ایک مضمون ہی قاضی خلیق مورانی کے بارے میں لکھا جو ۱۹۷۶ء کے جنگ اخبار کے ۳۲ پر شائع ہوا۔ قاضی خلیق مورانی کی جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ان کا وہ مخصوص زاویہ نظر تھا جو ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ خود کو ملتِ اسلامیہ کا فرد سمجھیں اور نیشنلزم کے پُر فریب تحمیل سے دھوکا نہ کھائیں۔ ملتِ اسلامیہ کا سواو اعظم اور ہے۔ سب مسلمانوں کو ایک بھائی کی حیثیت سے ایک دوسرے سے مل کر محبت و اخوت کی فضا میں اس مقصدِ عظیم کے

لیے آگے بڑھنا چاہیے۔ قاضی مرانی مرحوم تعصب و تنگ نظری کو اسلام کا دشمن سمجھتے تھے یہی وہ نقطہ نظر تھا جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک الگ آزاد مملکت کے لیے جدوجہد پر اکسایا اور نتیجے کے طور پر مسلمانوں کا وہ ملک وجود میں آیا جسے آج ساری دنیا پاکستان کے نام سے جانتی ہے۔

اس نقطہ نظر کو قاضی خلیق مرانی مرحوم نے سندھ و اہل سندھ میں مقبول بنایا اور یہی وہ نقطہ نظر تھا جسے برصغیر کے ان صوبوں کے مسلمانوں نے بھی اپنایا جہاں وہ صرف بارہ ہندوستان کے حصے تھے اور جانتے تھے کہ الگ مملکت بنانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود ہمیشہ کے لیے 'ہندو' کے غلام بن کر رہ جائیں گے اور ان کی تہذیب، ان کا تمدن ان کے اپنے علاقوں میں محفوظ رہ سکے گا۔ لیکن اسلام کو زندہ و تابندہ دیکھنے کے لیے وہ ہر قسم کی قربانی، ہر قسم کے ایثار کے لیے آمادہ اور ہر خطرے سے بے نیاز تھے۔ اسی بے لوث جذبہ ایثار نے اس ملک عزیز کو وجود بخشا اور اسی جذبہ نے پاکستان کے دروازے برصغیر کے سب مسلمانوں پر کھول دیے۔ سب سے زیادہ کشادہ دلی کا ثبوت جس صوبے نے ویاہ بلا شہر سندھ کا صوبہ تھا۔ اس صوبے میں جس طرح ہجرت کرنے والے مسلمان آباد ہوئے اور جس طرح اس صوبے نے ترقی کی وہ ہماری تاریخی کا حصہ ہے۔ ہجرت کرنے والے جب ہجرت کرتے ہیں تو وہ سخت محنت کرتے ہیں اور اپنی زندگی کو نئے سرے سے قائم و دائم کرنے کے لیے اپنے سارے وسائل و ذرائع کو استعمال کرتے ہیں جن سے ایک طرف خود ان کی زندگی کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور دوسری طرف اس سرزمین کو ترقی حاصل ہوتی ہے جس پر وہ محنت کر رہے ہیں۔ کئے والوں کے لیے یہ ان کا نیا وطن تھا۔ انہوں نے یہاں رہ کر جو محنت کی اور اس محنت سے جو کچھ حاصل کیا وہ یہیں رکھا اور یہیں لگایا۔ اسی لیے صوبہ سندھ معاشرتی، معاشی و تہذیبی سطح پر بے شمار گرمیوں کا مرکز بن گیا اور اس کے ثقافتی وجود میں ایسی بنیادی تبدیلیاں آئیں کہ ایک نئے اور آگے بڑھنے والے تہذیب و تمدن کی گہری بنیاد پڑ گئی۔ اس ثقافت کی روح میں اسلام کی روح پوری طرح سرِ اُتیت کیجیے جو نئے ہے اور یہ وہ صورت حال ہے جس سے مدھمت ہم بلکہ ساری دنیا نے

اسلام فیض اٹھا سکتی ہے۔ اس وقت وہ قوتیں پوری طرح سرگرم عمل ہیں جو نہیں چاہتیں کہ اسلام ہماری نئی تہذیب کی بنیاد بنے اور اسی لیے آج ان حرام عناصر کو توڑنے اور الگ کرنے میں مصروف ہیں جن سے ”وصل کے بھائے“ فصل کا عمل شروع ہو سکے۔

تاریخ شاہد ہے کہ سندھ نے ہمیشہ نئی تہذیب کے ہر ادل و دستوں کو خوش آمدید کہا ہے اور ان کو اپنے اندر جذب کر کے ایک توحید اور جاندار تہذیب کو جنم دے کر نئی دنیاؤں کا سفر کیا ہے۔ تہذیبی، معاشرتی و معاشی سطح پر اس وقت بھی صورت حال ہے اور اگر اس صورت حال کو ہم نے خراب ہونے دیا یا مفاد پرستوں کے ایک مختصر فوٹے کو اسلامی فکر اور نقطہ نظر پر غالب آ جانے کے مواقع فراہم کر دیے تو یقین جانے کہ وہ عداوت و حقدام سے اگڑے گی اور محرومیوں، نامرادیوں اور تہذیبی و معاشی جبر و استحصا کا ایک ایسا دور شروع ہو گا جس کے ٹکڑے سے ٹکڑا ایک طویل عرصے کے لیے ممکن نہ ہو سکے گا۔ مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور یہی وہ سطح ہے جس پر مسلم معاشروں کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور اسلامی تہذیب و معیشت فروغ پاتی ہے۔ میرے خاندان کی کئی لڑکیاں سندھ میں بیاتھی ہوئی ہیں اور سندھ کی کئی بیٹیاں میرے خاندان کے افراد سے بیاہی گئی ہیں۔ اس وصل و زون کی بنیاد کی قدران و دونوں کا مسلمان ہونا ہے اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ تہذیبی سطح پر ایسے اچھے خاندان وجود میں آتے ہیں جن میں وہ سب کچھ ہے جو الگ الگ نہ انصار خاندانوں میں نظر آتا ہے اور نہ مہاجر خاندانوں میں۔ لیکن خاندانوں میں اسلام کی روح اور زیادہ وسیع اور گہری ہو گئی ہے۔ ایک لڑکی ہے تعصیب، فراخ دلی اور اسلامی بردہن خیالی ان خاندانوں میں نظر آتی ہے جو مثالی حیثیت رکھتی ہے۔

قاضی خلیق مودانی کا یوم مناتے ہوئے مجھے آج بھی کہنا ہے کہ مہاجر و انصار دونوں اب اسی صوبے کے باشندے ہیں۔ ہمیں ان دونوں کو الگ الگ کرنے والی قوتوں سے ہوشیار رہنا چاہیے اور وہ کام وہ عمل کرنے چاہئیں جن سے یہ دونوں مل کر ایک ہو جائیں۔ ہمیں ایسے اقدام کرنے چاہئیں جن سے اسلامی عمل و انصاف کو اسلامی مسئلہ

کو فروغ حاصل ہو سکے اور جبر و استحصا ل کا موجود غیر اسلامی نظام کا خاتمہ ہو سکے۔ انصاف زندگی کو آگے بڑھانا ہے۔ اُسے خوش حال بنانا ہے۔ انصاف مثبت قدر ہے۔ نا انصافی منفی قدر ہے اور معاشرے کو ہر سطح پر، خواہ وہ معاشی ہو یا معاشرتی، برباد کرتا ہے۔

آج کے دن اس موقع پر ہمیں اپنا راستہ مقرر کرنا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ کیا نا انصافیوں کی ترویج سے ہم کوئی زندہ آگے بڑھنے والا معاشرہ پیدا کر سکتے ہیں اور آپ یقیناً مجھ سے اتفاق کریں گے کہ عدل و انصاف، مساوات ہی وہ قدریں ہیں جن پر چل کر ہم اسلام و روح اسلام کو زندگی میں نافذ کر سکتے ہیں۔ نا انصافی ہمیں گیمند کی طرح ہے جسے آپ جس قوت سے دلیا و معاشرہ پر مارتے ہیں وہ اسی قوت سے آپ تک واپس آجاتی ہے۔ اس کے واپس آنے میں وقفہ تو یقیناً ہوتا ہے لیکن یہ وقفہ بہت مختصر ہوتا ہے۔ اللہ نے پاکستان میں تقدیر کیا ہے لیکن ساتھ ساتھ ہمیں اس کا ذمہ دار بھی بنایا ہے ہم جو کچھ کریں گے اس کے ہم خود ذمہ دار ہیں اور ہوں گے۔ پاکستان اللہ کی امانت ہے۔ اس کی حفاظت، اس کی ترقی، اس میں عدل و انصاف کی روح پھونکنا، اسے اسلام کا قلعہ بنانا، اس میں محنت و اخوت پیدا کرنا، مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں اُسے قرآنی احکام کو زندگی میں عملی طور سے پڑھنا اور پرت کر دکھانا یہ ہماری ذمہ داری ہے اور جو اس عمل سے روگردانی کرے گا وہ اسلام کا دشمن ہو گا۔ آج ہمیں اس پر پھر سے فکرمندانہ چاہیے اس لیے کہ اس میں ہمارے محفوظ اور شاندار مستقبل کا راز پنہایا ہے۔

(یکم فی ۱۹۸۳ء)

حافظ شیرازی

حافظ شیرازی دُنیا نے ادب کے چند عظیم شاعروں میں سے ایک ہیں۔ وہ ایک ایسے شاعر ہے بدل ہیں کہ صدیوں سے خود ملک ایران کی واضح شناخت ہیں۔ اُن کا اثر دُنیا کی بیشتر زبانوں کے ادبیات نے قبول کیا ہے اور برصغیر کے ادبیات اور بالخصوص اردو شاعری پر تو اُن کا اثر بہت واضح اور گہرا ہے۔ حافظ کی زندگی ہی میدان کی شہرت برصغیر پہنچ چکی تھی اور تاریخ شاہد ہے کہ سلطان شاہ محمود بہمنی کے دورِ حکومت میں میر فضل اللہ نے زاو راہ بھیج کر انھیں اپنے پاں اُٹنے کی دعوت دی تھی۔ حافظ شیرازی روانہ ہوئے مگر طوفان نے جہاز کو گھیر لیا۔ خواجہ حافظ جہاز سے اتر گئے اور وہ مشہور غزل کہہ کر میر فضل اللہ کو بھیج دی جس کے یہ دو شعر مجھے بھی یاد ہیں:

شکوہ تلمیحِ سلطانی کہ ہم جاں درو درج است

کلا و دل کش است اما بہ دردم سر نمی ارزد

ہم کوئے میفرود شانش بہ جامے در نمی گیرند

نہ ہے سجادۂ تقویٰ کی یک ساغر نمی ارزد

حافظ شیرازی برصغیر کی مسلم تہذیب کا ایک اہم حصہ ہیں۔ جیسے امیر خسرو عوام و خواص کی تہذیب میں خون کی طرح گردش کر رہے ہیں اسی طرح حافظ شیرازی خواص کی تہذیب کا سرمۂ چشم بن کر فرد کو دو بالا کر رہے ہیں۔ شاید ہی پرانی نسل کا کوئی تعلیم یافتہ شخص ایسا ہو جسے حافظ شیرازی کے دو چار شعر یاد نہ ہوں۔ قوال حافظ کے شعر شاعر آج بھی اہل محفل کو عالم و جہ میں لے آتے ہیں۔ حافظ حال کے بھی شاعر ہیں اور قال کے بھی۔ اردو کی کوئی اصلی یا ادبی کتاب

جو کہ سے پچاس سال پہلے لکھی گئی ہو آپ کھول کر دیکھ لیجیے حافظ کے شعروں کی ترجمانی کرتے ہوئے آپ کو نظر آئیں گے۔ حافظ ہماری تہذیب کی زبان کا ایک حصہ بھی ہیں اور ہمارے جذبات و احساسات کے ترجمان بھی۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایرانی تہذیب کو برصغیر کی مسلم تہذیب سے قریب اور ہمارے دلوں کو ایک دوسرے سے قریب کر رکھا ہے۔ انہیں شعراء نے ہماری فکر کو، ہمارے جذبہ و احساس کو ہمارے خیالات و افکار کو متاثر کر کے ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

یہی وہ تہذیبی مشابہت اور یہی وہ ثقافتی مماثلت ہے جس کی وجہ سے ایران و پاکستان ایک دوسرے کے برادر ملک اور برادر قوم ہیں اور یہی وہ راستہ ہے کہ ایران و پاکستان کو مزید قریب کر سکتا ہے۔ علم و ادب کے حوالے سے جو قومیں ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں وہ پہچان، وہ شناخت دائمی وابدی ہوتی ہے۔ آئیے ہم اسی سلسلے پر اور اسی حوالے سے عہد حاضر میں ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور زبردستی سے ہٹ کر علم پرستی اور ادب پرستی کے راستے کو اختیار کریں تاکہ قریبیں بڑھ جائیں اور فاصلے کم سے کم قریب جائیں۔ اردو زبان و ادب نے فارسی زبان و ادب کی چھاتی سے دوہ پایا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ فارسی زبان و ادب کے اثرات نے اردو زبان کو نہ صرف علم و ادب کے سانچے دیے بلکہ اسے تیزی سے پروان چڑھانے میں بھی مدد دی ہے۔ آج اردو زبان، جو پاکستان کی قومی زبان ہے، خود ایک ترقی یافتہ زبان بن گئی ہے جس کا ادب ثروت مند اور جس کا دائرہ وسیع ہے اور جس نے تیسرا غالب اور تقی جیسے شاعر پیدا کیے۔ لیکن ان سب پر اور خور و ادب پر فارسی ادب و زبان کے اثرات واضح اور گہرے ہیں۔ میں جو زبان لکھتا ہوں اس میں فارسی زبان شامل ہے۔ ہمارا سارا ثقافتی ورثہ فارسی زبان میں محفوظ ہے۔ اسی لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ فارسی پڑھنے اور سمجھنے کی ہم بھرے طرح ڈالیں تاکہ ہمارے ثقافتی و تاریخی ورثہ کے بندر وازے کھل جائیں اور ہم مغربا مستشرقین کی آنکھوں سے اپنی تہذیب، اپنی تاریخ اور اپنے ورثے کو دیکھنے کا عمل بند کر دیں۔ یہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے کہ ہم خود کو پہچانیں، اپنے ورثے کو براہ راست دیکھیں اور اس ورثے سے اپنے حال کو سنوار کر اپنے مستقبل کو، اپنی مرضی کے مطابق

خود پیدا کریں۔ اپنے عظیم درشے کو بھلا کر ہم نے بہت کچھ کھویا اور گنوا یا ہے۔ حافظ شیرازی کی یاد کو تازہ کرتے ہوئے کہئے اس بات پر بھی غور کریں کہ ہم بھٹک کر کہاں نکل سکتے ہیں۔ یہ وہ راستہ تو نہیں ہے جس پر چل کر ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکیں گے۔ اب دیوانہ حافظ سے فال نکالنے کا وقت گزر چکا ہے۔ اب ہمیں اپنے درخشاں اور اپنی تاریک حیرتوں سے خود کو پہچاننے کا وقت آگیا ہے۔ بیرونی مغربی سے ہم نقل اور ترجمہ کی تہذیب تو سیکر سکتے ہیں لیکن وہ تو ناواصل تہذیب پیدا نہیں کر سکتے جو ملک الہاک کو چھو لیتی ہے۔ حافظ شیرازی نے اسی لیے ”طرح نو در اندازیم“ کا درس دیا تھا اور یقیناً ہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ حافظ نے کہا تھا :

شہاد آں نیست کہ دارد خط سبز و لب لعل

شہاد آں ست کہ ایں دارد و آئے دارد

”طرح نو“ اور ”آئے دارد“ یہی وہ خواہشیں ہیں جن سے مجھے پاکستان و ایران و مغربی میں روشنی کی کرنیں پھوٹی نظر آ رہی ہے۔

نُصْرَتِ کی فارسی غزل

پروفیسر اکبر الدین صدیقی صاحب کا ایک مضمون سب رس کراچی دسمبر ۱۹۸۳ء کے شمارے میں نظر سے گذرا جس میں محترمی اکبر الدین صدیقی صاحب نے لکھا ہے کہ "ڈاکٹر جمیل الہی صاحب نے اس (نُصْرَتِ) کا دیوان اور تاریخ اسکندری شائع کی۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ "اس میں نُصْرَتِ کے فارسی کلام کا کوئی تذکرہ نہیں۔"

یہ بات صحیح نہیں ہے اس لیے کہ ۱۹۷۲ء میں جب میں نے قدیم بیاضوں سے ریڑہ ریڑہ اکٹھا کر کے دیوان نُصْرَتِ مرتب کیا تو اس میں ایک فارسی غزل بھی شامل کی تھی جو دیوان نُصْرَتِ مطبوعہ توسین لاہور ۱۹۷۲ء کے صفحہ ۷۹ اور ۸۰ پر درج ہے۔ اس فارسی غزل میں سات شعر ہیں۔ محترم اکبر الدین صدیقی صاحب نے اپنے مضامین کے محبوبے "تجھے چراغ" میں اس غزل کے صرف پانچ شعر دیے ہیں۔ نُصْرَتِ کی فارسی غزل کے تعلق سے میں نے ایک فٹ نوٹ بھی دیا تھا جس میں چند امور کی مراحض کرتے ہوئے لکھا تھا کہ :

"مظفر حسین صہا مولف "روز روشن" نے یہ غزل عشرتی اصفہانی کے نام سے درج کی ہے اور لکھا ہے کہ "بعضے اپنی غزل را بہ نام نُصْرَتِ گیلانی نوشتہ وہ تحقیق اختر (قاضی محمد صادق خان اختر مولف تذکرہ آفتاب عالمیاب) و صاحب نگارستان سخن (نواب نور الحسن خان) عشرتی اصفہانی است۔"

(روز روشن، ص ۳۵۵)

"فرہنگ سخنوران" میں نُصْرَتِ گیلانی کا نام نہیں لکھا۔ صرف "روز روشن" کے

حاصل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن "فرہنگ سخنوران" میں ایک نعتی ہندوستانی کا نام بھی آیا ہے جس کو مشنوی "مہروماہ" کا مصنف بتایا گیا ہے جو ۱۰۶۸ھ تک حیات تھا۔ (فرہنگ سخنوران" ص ۶۰۴) نعتی گیلانی کے مطبوعہ دیوان میں یہ فارسی غزل نہیں ہے۔ امکان ہے کہ یہ غزل اسی نعتی دکنی کی ہو کہوں کہ نعتی دکنی کا سال وفات ۱۰۸۵ء ہے۔ دوسرے یہ کہ جس مشنوی کو "مہروماہ" کہا گیا ہے وہ عاقل خان رازی عالم گیری کی مشنوی ہے جس میں اسی قصہ منور و مد مالتی کو نظم کیا گیا ہے جسے نعتی نے "گلشن عشق" میں موضوع سخن بنایا ہے۔ مہروماہ فارسی زبان میں ہے اور "گلشن عشق" اردو میں۔

اس غزل کا تیسرا اور پانچواں شعر غالب نے قدسی (مشہدی) سے منسوب کیا ہے۔ موجودہ تحقیق کی روشنی میں یہ صحیح نہیں ہے۔

نعتی کی یہ واحد فارسی غزل ہے جواب تک دستیاب ہوئی ہے اور یہ غزل جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، میرے مرتبہ "دیوان نعتی" میں شامل ہے جسے قارئین کی دل چسپی کے لیے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

از پنجہ من چاک گر بیاں بگل دارد	وز گریہ من، گوشہ دامن بگل دارد
از بس کہ بہ زندان غمت دامنم	ز خمیر بہ رنگ کندہ، زندان بگل دارد
دامان بگل رنگ، گل خوش تو بہار	محل چین بہار، تو ز دامن بگل دارد
گر بُت شکم، گاہ بہ مسجد زخم آتش	کز مذہب من، گرو مسلمان بگل دارد
در بزم وصال تو بہنگام تماشا	نظارہ زخمیدن، حرکاں بگل دارد
سُسل بہ چین مشک فشان نافہ کند	از فرست من زلف پریشان بگل دارد

گر گریم و گر خندم و گر آؤ جگر سوز
اے نعتی از وضع تو جانان بگل دارد

اس غزل اور پروفیسر اکبر الدین صدیقی صاحب کی مندرجہ غزل میں چند الفاظ کا فرق ہے۔ اہل علم کے لیے یہ بات بھی دل چسپی کا باعث ہوگی۔ یہ بات میں نے صرف اس لیے وضع

کر دی ہے کہ سب اس کے قارئین کے سامنے یہ بات اچھلے گئے کہ میرے مرتبہ "دورانِ عمرانی" میں زحرف فارسی غزل شامل ہے بلکہ اس غزل میں دو شعر بھی اکبر الدین صلیبی صاحب کی مندرجہ غزل کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔

(۲۱ جنوری ۱۹۸۲ء)

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

ریاض احمد

قرن ۲۰ سینہ

مرتبہ، سماج سید

ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف

ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف

فتح محمد ملک

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر سلیم اختر

مرتبہ، ڈاکٹر طاہر تونسوی

مرتبہ، ڈاکٹر طاہر تونسوی

عشق دہانی

مرتبہ، شعیب امجد

اکبر الہ آبادی

ریاضتیں

نقوش ادب

بنجارے کے خواب

ساقیہ صیغی شخصیت اور فن

کچھ نئے اور پرانے افسانہ نگار

کچھ نئے اور پرانے شاعر

فیض

پاکستان میں اردو ادب (سال بہ سال)

سلاش اولی جائزہ ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۷ء

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ

فکر اقبال کا تعارف

تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید

طمنہ و مزاج

(میریخ تنقید انتخاب)

فیض کی تخلیقی شخصیت

اردو زبان اور یورپی اہل قلم

ادبی مذاکرے